www.KitaboSunnat.com

مولانا ابوالکلام آزادؒ

ایک مطالعہ

مرتّبہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاںپوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی

کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے

درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

مولانا ابوالکلام آزادؒ

ــــــــــ ایک مطالعہ

مرتّبہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

www.KitaboSunnat.com

مکتبۂ اسلوب۔ کراچی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یکے از

مطبوعات آزاد صدی

13844

اشاعت اوّل ۱۹۸۶ء
طابع عظیمی پرنٹرز۔ ناظم آباد کراچی
قیمت پچاس روپے

مکتبہ اسلوب
پوسٹ بکس ۲۱۱۹۔ کراچی ۱۸

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

به تقریب

صد ساله یوم پیدائش

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

وطن آبائی

دہلی مرحوم (پنڈت کا کوچہ)

سلامٌ علی نجدٍ، ومَنْ حلّ بالنجد

وطن مادری؛ مدینہ طیبہ

دارم دلے گرداں کہ من قبلہ نامی خوانمش ‌ ‌ ‌ ‌ روئے سوئے ابروئش کند ہر چند می گردانمش

ولادتِ باسعادت

ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ مطابق اگست ۱۸۸۸ء

بمقام مکہ معظمہ زاد اللہ شرفاً وکرامۃً، محلہ قدوہ، متصل باب السلام

بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ

وفاتِ حسرت آیات

۲ شعبان المعظم ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء بروز ہفتہ

بہ مقام دہلی (دار الحکومت ہند)

آزاد نیشنل کمیٹی ٭ پاکستان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست

پیش لفظ :

مولانا آزاد	ابوسلمان شاہجہانپوری	۷

شخصیت :

دورِ حاضر کی عظیم شخصیت	ہمایوں کبیر	۱۵
مولانا آزاد کی شخصیت کے بعض اہم پہلو	ڈاکٹر ریاض الرحمن شروانی	۲۰
مولانا آزاد بحیثیت ایک انسان	خواجہ غلام السیدین	۳۱

مذہب :

مولانا آزاد کی مفسرانہ حیثیت	علّامہ سید اختر علی تلہری	۳۵
ترجمان القرآن	ڈاکٹر ریاض الحسن	۴۹

صحافت :

مولانا آزاد بحیثیت ادیب وصحافی	مالک رام	۵۹
الہلال اور اردو صحافت	پروفیسر شمس الدین منیری	۷۱
مولانا آزاد کی صحافتی عظمت	علّامہ نیاز فتح پوری	۷۵

سیاست :

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت	مولانا عبدالسّلام قدوائی	۸۷
مولانا آزاد کا سیاسی کارنامہ	ڈاکٹر ریاض الرحمن شروانی	۹۵

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فلسفہ:

مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندی فلسفہ	صفی الدین صدیقی	۱۰۵

خطابت:

ابوالکلام کی خطابت	مولانا نصراللہ خاں عزیز	۱۱۹
امام الہند کا طرزِ خطابت و تقریر	مولانا عبدالشاہد خان شروانی	۱۲۲

ادب:

اردو ادب اور ابوالکلام آزاد	ماہر القادری	۱۳۱
مولانا آزاد بہ حیثیت صاحب طرز	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	۱۴۷
مولانا آزاد کا ادبی مقام	ڈاکٹر سید عابد حسین	۱۶۰
مولانا آزاد کی نثر	علی جواد زیدی	۱۶۵
اردو نثر میں مولانا آزاد کا اجتہاد	پروفیسر آل احمد سرور	۱۶۹
مولانا آزاد کی خطوط نگاری	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری	۱۷۲
مولانا آزاد کی شاعری	″ ″ ″	۲۱۰

تعلیم:

مولانا آزاد ـ وزارت تعلیم کی مسند پر	اشفاق حسین	۲۲۵
مولانا آزاد کا تعلیمی فلسفہ	خواجہ غلام السیدین	۲۲۹
مولانا آزاد کے تعلیمی نظریے	عبداللہ ولی بخش قادری	۲۴۱

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیش لفظ

مولانا آزادؒ

امام غزالی کے تذکرہ میں مرحوم شیخ مراغی نے لکھا تھا:

جب مختلف علما کا ذکر آتا ہے تو اُس سے ذہن اُن خصوصیات کی طرف منتقل ہوتا ہے جو ان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں یا جن کی وجہ سے ان کو دوسروں پر امتیاز حاصل ہے۔ مثلاً جب ابن سینا اور فارابی کا نام آئے گا تو ان کی فلسفیانہ اور حکیمانہ حیثیت نکھر کر قلب و ذہن کے سامنے آجائے گی، ابن عربی کا تذکرہ ہوگا تو اس انداز کا تاثر ابھرے گا کہ کسی بلند پایہ صوفی کے حالات بیان کیے جا رہے ہیں۔ اسی طرح بخاری، مسلم، امام احمد بن حنبل کا مذکور ہوگا تو معلوم ہوگا حفظ وصدق کے اونچے پیمانوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو معرفت رجال میں ملکۂ راسخہ رکھتے ہیں۔ لیکن غزالی کا معاملہ اس سے جدا ہے۔ ان کا نام آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک ہی آدمی کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے، بلکہ بہ یک وقت کئی اشخاص زیرِ بحث ہیں۔ جن میں سے ہر ایک علم وفضل کی ایک مستقل بالذات اقلیم کا تاجدار ہے۔

جامع حیثیات شخصیت:

ٹھیک یہی بات مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ومغفور پر صادق آتی ہے، زبان پر ان کا نام آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کا تذکرہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ بہ یک وقت کئی اشخاص زیرِ بحث ہیں۔ اور ان میں سے ہر شخص اپنے دائرے میں یکتا ئے روزگار اور شہنشاہِ علم وفن ہے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کی بے شمار دولتوں اور فکر ونظر کی بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہ دین کے متبحر عالم تھے اور مختلف علوم دینیہ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ میں وسیع نظر رکھتے تھے۔ انھیں فن تجوید، علم کلام، منطق، مناظرہ وغیرہ میں عبور حاصل تھا۔ علم ہیئت اور فلسفۂ قدیم وجدید پر ان کی ناقدانہ نگاہ تھی۔ دساتیر وقوانین کا نہ صرف مطالعہ کرنے والے بلکہ بنانے والے تھے، تاریخ عالم کے ایک ایک گوشے اور ایک ایک پہلو پر نظر تھی، جغرافیۂ عالم میں ان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو کمال حاصل تھا۔ وہ اردو کے بلند پایہ ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ انھیں انگریزی، فرانسیسی، عربی اور فارسی زبانوں کی تاریخ و ادب پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ ہر زبان کے تمام بڑے بڑے ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں کی تخلیقات پر ناقدانہ نظر رکھتے تھے ان زبانوں کے ادب، تاریخ، مذہب اور فلسفہ کا تمام بہترین لٹریچر ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔ ہندی اور چینی فلسفہ و مذہب کا مطالعہ انھوں نے زیادہ تر انگریزی کی مدد سے کیا تھا۔ اردو صحافت کے دامن میں انھوں نے اب سے پون صدی پیش تر جو کچھ ڈال دیا تھا، آج تک اس میں اضافہ نہ کیا جا سکا۔ خطابت میں ان کا کوئی جواب نہ تھا ان کی طلاقتِ لسانی کے سامنے برٹش حکومت اپنی آہنی اور جنگی طاقتوں کے ساتھ لرزتی رہی۔ عملی سیاست میں انھوں نے اُس وقت قدم رکھا اور برٹش امپیریل ازم کے قصرِ عظمت پر اس وقت ضرب لگائی جب بڑے بڑے رہنماؤں اور لیڈروں کا میدان میں دور دور پتا نہ تھا۔ نظری سیاست میں بھی ان کا مقام دنیا کے چند سیاست دانوں میں تھا۔ ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے برِصغیر کی وہ ایک مانی ہوئی شخصیت تھے۔ ہندوستان کو انھوں نے اپنے دورِ وزارت میں اپنے افکار اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے اتنا مالا مال کر دیا کہ اس کے تذکرے کے لیے جدید ہندوستان کی تاریخ میں ایک طویل اور نمایاں باب ہوگا۔ دنیا کے امن کے لیے تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم کا انھوں نے جو خاکہ پیش کیا وہ امن کے علم برداروں اور دنیا کے دانشوروں کے پیش نظر ہے۔ اثری تحقیقات ان کا محبوب موضوع تھا۔ اور اس سلسلے میں قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید ترین معلومات و تحقیقات ان کے علم و مطالعہ میں تھیں۔ طب پر ان کی زبان کھلی تو طبِ قدیم و جدید کے نظریوں اور طریق علاج اور منضج، مسہل، تبرید، تکمید سے لے کر ریشہ خطمی اور گاؤ زبان تک کوئی پہلو نہ چھوڑا، اور اپنی معلومات کا بڑے بڑے حکیموں سے لوہا منوالیا، مصوری میں ان کا مطالعہ اتنا وسیع اور ان کی نظر بہت گہری تھی۔ وہ نہ صرف اس کی تاریخ، عہد بہ عہد ترقی اور ہر عہد کی خصوصیات سے واقف تھے۔ بلکہ وہ ایک تصویر کو دیکھ کر یہ بتا سکتے تھے کہ وہ کس عہد میں بنائی گئی اور اس عہد کی خصوصیات کے لحاظ سے اس میں کیا نقص یا کمال ہے، موسیقی کا ذوق ان کی طبیعت میں رچا بسا تھا۔ اس کو انھوں نے عملی لحاظ سے سیکھا تھا۔ اور فنی لحاظ سے اس کی تکمیل کی تھی ہندوستان میں لکھنؤ اور آگرہ اور بیرونِ ہند عراق اور بغداد کے ماہرینِ فنِ موسیقی سے بحث و مباحثہ رہتا تھا۔ وہ اس فن کے رمز شناس تھے۔ اور اسلامی تاریخ کے ان صاحب کمالانِ فن سے واقف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے، جنھیں اس فنِ لطیف سے لگاؤ تھا ڈراما، سینما وغیرہ کی تاریخ اور اس کی تدریجی ترقیوں سے وہ ایک ماہر اور صاحبِ مضمون کی طرح واقف تھے۔ مشرقی کھانوں کا تذکرہ ہو یا مشرقی لباس کا بیان ہو، ہر موضوع پر اپنی معلومات اور مطالعے کی وسعت سے سننے والوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے علوم و فنون کی جزئیات پر بھی ان کی نظر اتنی گہری تھی جتنی کسی صاحبِ مضمون کی ہو گی۔

جعفری خاندان کی تاریخ ہو یا پٹھانوں کی تاریخ، ان کے خاندان کا بیان اس تفصیل اور روانی سے کرتے تھے کہ خود صاحب علم و مطالعہ جعفری اور پٹھان بھی حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ حتیٰ کہ حقہ کی تاریخ اس کی تدریجی ترقی، عہد بہ عہد اس کی شکلوں کی تبدیلی، اس کی "نے" کی مختلف شکلیں، ان کی لمبائی، موٹائی اور شکل کے اختلاف سے اس کی آواز پر معمولی اثر، پتنگ کی تاریخ، اس کی مختلف شکلیں، ان کے اڑانے اور لڑانے کے طریقے۔ چلے کی اقسام اور اس کا تاریخی تذکرہ ہو، بلبلوں اور ان کی اقسام کا بیان ہو پھول پودے اور ان کی اقسام زیرِ بحث آئیں یا پرندوں اور جانوروں کی نفسیات پر قلم اٹھائیں وہ ہر چیز کا بیان اس تفصیل سے کرتے ہیں کہ نہ صرف ان کے بیان کی قدرت پر انش انش کر اٹھتے ہیں، بلکہ ان کے علم و مطالعہ کی وسعت، حیرت انگیز قوتِ حافظہ اور بے نظیر قوتِ استحضار کا اعتراف کرتے ہی بن پڑتا ہے۔ یہ کمال کچھ ان کی طلاقت لسانی ہی کا نہیں تھا بلکہ یہ ان کی مسلّمہ قابلیت اور حافظہ و استحضار کی بے نظیر صلاحیتیں تھیں۔ ان کی طلاقتِ لسانی کا تو یہ عالم تھا کہ وہ اگر ارہر کی ابلی دال اور پیچ نکلے ہوئے چاولوں کو دنیا کی لذیذ ترین اور مفید ترین غذا ثابت کرنے پر آجاتے یا تہہ بند، بنیان اور معمولی چپل کو وہ دنیا کا نفیس ترین اور فائدہ مند لباس ثابت کرنا چاہتے تو کون اس سے انکار کی جرأت کر سکتا تھا۔ ان کی طلاقتِ لسانی کا اعتراف حضرت امیرِ شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری نے نہایت شاندار کیا ہے۔

پوشیدہ صلاحیتیں:

ابوالکلام کے علم و فضل کے جن گوشوں کی طرف اشارہ کیا گیا، یہ تمام وہ پہلو ہیں جن کا ذکر اور جن کا اعتراف ملک اور بیرون ملک کے علما و مشاہیر کر چکے ہیں۔ یا ان کی زندگی کے یہ وہ گوشے ہیں جو لوگوں کے علم میں آ گئے۔ ان کے ایک وجود میں علم و فضل کی کتنی ہی ایسی دنیائیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آباد تھیں جن کا لوگ پتا بھی نہ چلا سکے، اور کسی طرح لوگوں کے احاطۂ علم میں نہ آسکیں علامہ نیاز فتح پوری نے مولانا مرحوم کی اسی جامعیت کے متعلق فرمایا تھا:

"یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہو سکیں وہ اس سے بہت کم تھیں جو چھپی ہوئی رہ گئیں۔ حالاں کہ وہ بہت زیادہ وزنی و گراں قدر تھیں۔ ہم نے مولانا کو اتنا ہی جانا جتنا وہ چاہتے تھے کہ ہم جانیں۔ ان کی ہستی کے بہت سے امکانات دنیا پر ظاہر نہ ہو سکے۔

وہ امکانات کیا تھے؟ ان کا تعین وصراحت آسان نہیں تاہم جس حد تک میرے ذاتی ربط و معاملہ کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل کر وہ نہ ہو جاتی جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہو سکتے تھے وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبی اور بدیع الزمان ہوتے، اگر وہ مذہب دینی و مذہبی اصلاح کو اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے، اگر محض علوم حکمیہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجے کے متکلم اور فیلسوف نہ ہوتے، اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی و نظیری کی صف میں انھیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف و اصلاحِ اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے اور اگر وہ مسلکِ اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔

مولانا عجیب و غریب دماغی اہلیتیں لے کر پیدا ہوتے تھے۔ جن کو زمانے نے یا خود ان کی خلوت پسند طبیعت نے ابھرنے کا موقع نہ دیا اور آج ہم انھیں صرف الہلال و البلاغ کے رئیس التحریر یا تذکرہ، ترجمان القرآن اور غبار خاطر کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔"

عرفان خودی:

ابو الکلام کو خود بھی اپنی جامعیت اور فکر و نظر کی وسعتوں کا احساس تھا اور ایک موقع پر بے ساختہ ان کے قلم سے چند جملے نکل گئے، فرماتے ہیں:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سروسامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا، نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔ ؎

نارِوا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
رونقے گشتم و از طالعِ دکان رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت والم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم وفنون، ادب، انشا، شاعری کوئی وادی ایسی نہیں ہے جس کی بے شمار راہیں مبداء فیاض نے مجھ نامراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن وہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامنِ دل مالا مال نہ ہوا ہو، بحد یکہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں۔ ؎

مازلت انزل فی ودادک منزلا
تتحیر الالباب عند نزولہا

لیکن افسوس! جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا اس نے شاید سروسامانِ کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد و محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔"

یہ اشارات تو ان کے علم وفضل کی جانب تھے، ان کی شخصیت کے اور بہت سے پہلو ہیں مثلاً ان کی شخصیت کا جو پہلو سب سے پہلے دامنِ شوق وعقیدت کو اپنی جانب کھینچتا ہے، ان کی زندگی کا اٹھان ہے۔ انھیں نے ایک مخصوص عقائد وافکار کے خاندان میں آنکھیں کھولیں، ایک مخصوص ماحول میں اور ایک خاص انداز سے ان کی تعلیم وتربیت کا سروسامان کیا گیا، لیکن ان کی فطرت وذوقِ سلیم نے اس ماحول کا اثر اور رسمی وروایتی عقائد کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حق کی طلب وجستجو نے انھیں شک وانکار اور الحاد وفسق کی وادیوں کی بھی خاک چھنوائی لیکن ان کے بخت کی فیروز مندی انھیں ہر نشیب وفراز سے صحیح سلامت منزلِ مقصود کی طرف لے گئی، اور بالآخر سعادت وارجمندی نے ان کے قدم چومے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا کی سیرت اور کردار :

اس کے بعد ان کی سیرت کا پہلو آتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے، کہ ان کے علمی فضائل و محاسن کا پہلو عظیم الشان تھا یا اخلاقی کمالات کے لحاظ سے وہ بڑے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے عظیم الشان تھے۔ چھوٹوں کے لیے ان کا وجود سرتاپا شفقت و رحمت، دوستوں کے ہمدرد و غمگسار، نیاز مندوں اور عقیدت کیشوں کے لیے ہمہ تن دعا و سلامتی لیکن فراعنۂ وقت و جبابرۂ عہد کے مقابلے میں کبھی ان کی کج کلاہی نہ گئی۔ اوچھوں سے ہمیشہ درگزر کیا کم ظرفوں کو کبھی منہ نہ لگایا اور ان کی کسی بات کا کبھی جواب نہ دیا۔ غلط کاروں کو ہمیشہ معاف کر دیا، مخالفوں سے کبھی بدلہ لینے کا خیال تک دل میں نہ لائے۔ بعض حالات میں دوستوں نے مجبور کیا، مولانا زبان کھولیں، جواب ملا، "میرے بھائی! موسمی ہوائیں ہیں گزر جائیں گی۔"

مقامِ عزیمت :

جس بات کو انھوں نے غلط سمجھا، غلط کہا اور جس بات کو انھوں نے صحیح جانا، ببانگِ دہل صحیح کہا اور اس کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ ان کے نزدیک حق کے معاملے میں عوام کا اشتعال اور دوستوں کی ناراضگی اضافی چیزیں تھیں، مخالفتوں کے طوفان آئے اور بڑے بڑے صاحبانِ عزم و ہمت تنکوں کی طرح بہہ گئے۔ لیکن اس کوہِ استقلال کو کوئی چیز اس کی جگہ سے جنبش نہ دے سکی۔ مصائب و حوادث نے بہت سوں کا وقار خاک میں ملا دیا لیکن ابوالکلام جس مقام پر تھے اس سے نیچے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا، عوام کے سیلاب کے آگے بڑے بڑے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے، اور رہنمائی کے مقامِ بلند سے ترجمانی کے پستیوں میں اتر آئے لیکن ابوالکلام کے نزدیک عوام کے جذبات کتنے ہی تیز و تند کیوں نہ ہوں انھیں رہنمائی کا مقام نہیں دیا جا سکتا، چناں چہ جب انھیں عوام کے اشتعال اور ان کی ناراضگیوں کا سامنا کرنا پڑا تو انھوں نے عوام کو مخاطب کر کے صاف صاف کہہ دیا :

"ایک چیز اور یاد رکھو۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہ بھولو۔ تم مجھ سے ساری فرمائشیں کر سکتے ہو، مجھ سے سب کچھ لے سکتے ہو، مگر ایک سیکنڈ کی خاطر، ایک سیکنڈ کے پچاسویں حصے کے لیے بھی میری نسبت یہ توقع نہ کرنا کہ میں نے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس حقیقت کو اپنی بصیرت کی روشنی میں دیکھ لیا ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح تم اس سورج کو دیکھ رہے ہو۔ اس حقیقت سے، ہاں اس حقیقت سے، ایک انچ بھی ہٹ جاؤں گا۔ زمانے کی تلخیاں یا کروڑ روپے کا لالچ۔ جو بھی ہو مجھے اس حقیقت سے برگشتہ نہیں کر سکتا، اور لوگوں کی خواہش! لوگوں کی خواہش! حقیقت کے سامنے چیز ہی کیا ہے؟ سارے انسان، یہ تو خس و خاشاک کے ڈھیر ہیں، خس و خاشاک کے، ہاں خس و خاشاک کے، یعنی مٹی کے ڈھیر، اور مٹی کے ڈھیر کی حقیقت ہی کیا ہے؟ مکھیوں کا گروہ ہیں، تم کو اگر مکھیاں گھیر لیں تو کیا تم مکھیوں کے آگے سر جھکا دوگے؟ یقیناً نہیں، بلکہ ان پر قابو حاصل کرو گے۔ مجھے جو کچھ ملا ہے حقیقت کی روشنی میں ملا ہے۔ قبول عام کے لیے میں نے کبھی کسی کی پیروی نہیں کی، بلکہ اپنی راہ خود بنائی ہے۔ کوئی لالچ مجھے لبھا نہیں سکا، کسی کی ہیبت ناکی مجھے مرعوب نہیں کر سکی۔ جس راہ کو درست، حق اور سچی سمجھ کر سچائی کے ساتھ، بصیرت کی روشنی میں اختیار کیا اسی جادۂ حق و صواب پر آج تک قائم ہوں۔ اور اس کے نتائج کو انتہائی قریب دیکھ رہا ہوں، جتنا تم مجھ کو۔ انسانی جنگل، ذرات کا یہ صحرا، اس کی نبضیں تو میرے ہاتھ میں ہیں۔ حقیقت کے سامنے ان کی خواہشات کا شمار ہی کیا؟ حقیقت بہر حال حقیقت ہے۔"

یہ وہی مقامِ عزیمت و دعوت تھا، جہاں سقراط نے زہر کا پیالا پیا تھا، گلیلو نے موت کو خوش آمدید کہا اور کبھی امام احمد بن حنبلؒ نے قید و بند کی سختیوں کو لبیک کہا تھا۔ ابوالکلام کے حصے میں بھی تلخیوں کے گھونٹ اور نفرتوں کے جام آئے۔ انھوں نے صبر و شکر کے ساتھ ان کو پی لیا اور اُف تک نہ لی۔

ایک عہد:

www.KitaboSunnat.com

صحیح اعتراض ہو تو آدمی خاموشی سے سن لیتا ہے۔ لیکن لغو اعتراضات اور بہتان تراشیوں پر کون شخص اپنی زبان بند رکھ سکتا ہے؟ لیکن ابوالکلام نے جب ایک مرتبہ عہد کر لیا کہ جو شخص ان کے خلاف مناظرانہ رنگ میں کچھ کہے گا یا لکھے گا، اس کے خلاف نہ کچھ لکھیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گے نہ اس کی شکایت سے زبان آلودہ کریں گے، تو پھر کبھی ان کا نہ قلم اٹھا نہ زبان پر کسی کا شکوہ آیا۔ ثبتہٗ العمرہ وہ اپنے اس عہد پر قائم رہے۔ ذٰلِكَ لِمَنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔

مولانا کی خدمات:

ان کے علم وفضل اور سیرت و اخلاق کے ساتھ ایک پہلوان کی خدمات کا ہے اور اس کے اتنے ہی میدان ہیں، جتنے کہ علم وفضل اور فکر و نظر کے لحاظ سے ان کی شخصیت کے پہلو ہیں علم، ادب، انشا، مذہب، سیاست، اصلاح، تعلیم، فلسفہ، صحافت، تاریخ وغیرہ میں انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں، ان کو کوئی مورخ اور تذکرہ نگار نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ایسی جامع الصفات شخصیت کے علوم ومعارف اور فضائل و محاسن کے بیان، اخلاقی کمالات کے اظہار اور اس کی خدمات کے تذکرے کے لیے ایک فرد کا قلم کیوں کر کافی ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے علما کے بڑے بڑے مجمعے اور ان کی کئی زندگیاں، عظیم الشان اکادمیاں، ان کے غیر محدود وسائل اور صدیوں کی کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مختصر صحبت اور فرصت کے چند لمحے تو اشارات کے لیے بھی کافی نہیں ہو سکتے۔

مقالات کا یہ مجموعہ اسی شخصیت کے حضور اس کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریب سے ایک نذرانۂ عقیدت ہے جو اپنی ذات سے ایک انجمن اور ایک ادارہ تھا۔ وہ علم وفضل کا تاج محل، اخلاق و سیرت کا نشاط باغ، دعوتِ عزیمت کا قصر بلند اور عظمتِ اسلاف کی آخری خانقاہ تھا۔

اس دور کے اصحابِ علم وفضل کے مقالات کا یہ مجموعہ پیش کرتے ہوئے ہمیں ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ اگست ۱۸۸۸ء کا وہ روزِ سعید بھی یاد آرہا ہے، جب وہ فیروز بخت و جواں طالع وادیِ غیر ذی زرع ـــ مکہ مکرمہ زاد اللّٰہ شرفاً میں علم سے ہستی عدم نما میں تشریف لایا تھا اور اس روزِ سیاہ کی یاد بھی ہمیں بے چین کر رہی ہے جب ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو اس کی وفات کا داغِ جدائی سہنا پڑا تھا۔

مقالات کا یہ مجموعہ مولانا آزاد کی شخصیت اور زندگی کے علمی و عملی اہم پہلوؤں کی تقسیم کے مطابق آٹھ ابواب میں مرتب کیا گیا ہے۔ ہر حصہ مولانا کی شخصیت کے ایک پہلو اور اس کے خصائص کے تعارف میں ہے۔

ابو سلمان شاہجہان پوری

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دَورِ حاضر کی عظیم شخصیت

ہمایوں کبیر

کم وبیش پچاس سال ہو گئے جب کہ مولانا آزادؒ پہلی بار اُفق ہند پر پوری آب وتاب کے ساتھ نمودار ہوتے تھے۔ پھر بھی آج تک اُن کے قدردان ہوں یا نکتہ چیں۔ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ اُن کی شخصیت تدبیر وسیاست میں زیادہ ممتاز تھی یا علم وادب میں!

وہ نوعمر و نوجوانوں ہی تھے کہ الہلال والبلاغ کی آتش بیانی سے پورے شمالی ہند کی نگاہیں اپنی جانب پھیر لیں اور شعر وسخن کے میدان میں بھی نگاہوں اور دماغوں کی کشش حاصل کر لی تھی۔ مگر سب سے بڑھ کر اُن کا دینی اور سیاسی مطالعہ تھا جس نے اُن کی شخصیت کو امتیاز و کمال بخشا۔

جہاں تک مولانا کے ادب وانشاء کا تعلق ہے یقیناً وہ اُردو زبان کے سرمایہ اور تاریخ میں ایک بے مثال تخلیق تھی۔ فکر وخیال کی بلندی کے ساتھ فصاحت وبلاغت کی بے نظیر آرائش۔ عقلیت وشعریت کی عجیب ہم آہنگی چُست استعاروں اور تلمیحوں کا امتزاج اردو ادب میں پہلی بار اس شان کے ساتھ مولانا ہی کے قلم سے آیا۔ الہلال اور ترجمان القرآن نے اردو صحافت وادارت کو ایک بالکل اچھوتے انداز سے آشنا کیا۔ فہم وبیان کا ایسا یکجائی امتیاز مولاناؒ کے سوا شاید ہی کہیں نظر آسکے۔

تاہم مولانا مرحوم کی ادیبانہ عظمت وبلند پروازی کے ساتھ ساتھ حقائق وحالات کا ایک پس منظر بھی تھا جس نے یکایک مسلمانان ہند کی توجہات کو مولانا کی ذات گرامی پر مرکوز کر دیا تھا۔ تحریک ۱۸۵۷ء کی شکست اور برٹش اقتدار کے عروج نے مسلمانوں کو ایک ایسے دور میں پہنچا دیا تھا۔ جہاں وہ افسردگی اور احساس کہتری کا بُری طرح شکار تھے۔ سر سید احمد خاں نے اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ مسلمان ملکی سیاست سے دست کش رہیں اور حکمران طاقت سے اُن کے تعلقات وروابط گہرے اور استوار ہوں۔ پالٹیکس سے دست کشی کے عملی معنیٰ یہ تھے کہ سیاسیات سے نفرت وگریز بلکہ رقابت کی حد تک جا یا جائے۔ یہ سراسر منفی پالیسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بجائے خود بھی غلط تھی، پھر وقت کے حالات نے اس کو خود مسلمانوں اور پورے ملک کے لیے ایک شدید خطرہ بنا دیا۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ملک کا بڑا طبقہ تیزی کے ساتھ قومی تقاضوں سے زیادہ مانوس اور وابستہ ہوتا جارہا تھا مسلمانوں کا سیاست سے دور رہنا اتنی بڑی سیاسی غلطی تھی جس کے نتائج کا اندازہ بھی دشوار ہے۔

ہندو دوستوں سے سرسید کے گہرے تعلقات تھے اس کے باوجود اُن کی یہ تحریک اُن کے جانشینوں کے ہاتھوں تک پہنچتے پہنچتے اینٹی پالٹیکس کے بجائے "اینٹی ہندو" شکل اختیار کر گئی۔

جس وقت مولانا مرحوم اُفقِ ہند پر نمودار ہوئے ہیں اس وقت مسلمانانِ ہند کی مروجہ پالیسی کے دو ہی پہلو تھے: حکومتِ وقت کی حمایت! کانگریس کی مخالفت! اس وقت مسلمانوں میں جو نیم سیاسی ذہن و دماغ تھے بھی اُن کی بھاری اکثریت، سرسید مرحوم کی اس پالیسی کے سوا کوئی دوسرا طریقہ کار سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ یعنی "حکومت کا ہاتھ بٹاؤ اور ہندوؤں سے دور رہو"۔

اسی فضا میں اچانک مولانا مرحوم قیادت کے اسٹیج پر نمودار ہوئے اور جس قوت و بے باکی کے ساتھ انھوں نے ایک طرف برطانوی اقتدار کو چیلنج کیا اور دوسری جانب مسلمانوں کو محاذ سیاست کی طرف دعوت دی، اس ناگہانی صدا نے پہلے پہل وقت کے مسلم رہنماؤں کو ایک شدید جھٹکا دیا اور برہم کر دیا۔ جس وقت مولانا نے یہ اعلان کیا کہ

"ہندوستان کی مکمل آزادی نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ مسلمانانِ عالم کے مفاد کے لیے ضروری ہے"

تو مرحوم مسلمان لیڈر سراسیمگی کے عالم میں کچھ سمجھنے ہی سے قاصر رہے۔ اُن کی نظر میں مولانا کا یہ موقف ایک حد درجہ کی بدعت تھی۔

اس عالم میں الہلال کی صدا مسلمانانِ ہند کے لیے نشاۃ ثانیہ کا ایک پیغام تھی۔

مولانا مرحوم نے عمرِ عزیز کے کم و بیش پچاس سال قوم پروری، آزادی، جمہوریت، ترقی و پیش رفت کی علمبرداری میں گزارے۔

مولانا آزاد ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو اپنے ساتھ مذہبی تقدیس کی شان رکھتا تھا اُن کی پرورش اور تربیت، خاندانی رسوم و روایات کے مطابق ہوئی تھی۔

فلسفۂ دینیات کے فاضل اور اسلامی فکر و نظر کے باکمال ترجمان ہوتے ہوتے اُن کا سیاسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشن اور اصلاح و دعوت کا یہ موقف بعض عقیدت مندوں کے لیے کچھ انوکھا سا تھا حالانکہ اس میں ندرت و استعجاب کی کوئی وجہ نہ تھی ہاں، انھیں لوگوں کے لیے یہ موقف کچھ اجنبی ہو سکتا تھا جو اسلام کی حقیقی تعلیم کو فراموش کر چکے تھے اور اسلام کا صرف وہ تصور اُن کے ذہنوں پر چھایا ہوا تھا جو برٹش دورِ حکومت نے "انڈین محمڈن" کے نام سے پیدا کیا تھا۔ بہرحال یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مولانا آزاد کی دعوت پر سب سے پہلے جو طبقہ آگے بڑھا وہ قدامت پسند اور مشرقیت کے حامل علماء ہی کا طبقہ تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کے رفقاء ہی میں مولانا آزاد کو کچھ آشنائے راز و ہم مزاج مل سکے۔

گہرے دینی مطالعہ اور اسلام کے بنیادی نظریات - حریت، جمہوریت، فکر و نظر کے ورک نے ہمارے اس نوجوان عالم (مولانا آزاد) کو اس وقت کی بے وقعت سیاست، معاشرہ، جاگیردارانہ سسٹم اور ذہنی تملق و افلاس کا شدید معاند و نکتہ چیں بنا دیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سیاسی دھڑے بندوں، جاگیردارانہ خوشامدی ذہنیت اور اوہام پرستی کی مذلتوں کے خلاف پوری تندی و تیزی سے صف آرا ہو گئے اور یہی پس منظر تھا جو اُن کو خاندان کی خانقاہی اور گوشہ نشینی کی زندگی سے سیاسیات کی گرم بازاریوں میں کھینچ لایا۔

یہ حقیقت نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ شبانہ روز سیاسی مصروفیتیں اور سرگرمیاں بھی مولانا علیہ الرحمۃ کی عالمانہ سربلندی و امتیاز پر کبھی حاوی نہ ہو سکیں۔ اس لیے کہ علمی فضیلت و کمال زندگی کی پائدار اور سدا بہار قدروں میں سے ہے جب کہ سیاست، وقت اور ہنگامہ کا ایک تقاضا ہوتی ہے اس لیے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد ہمیشہ ایک ڈپلومیٹ اور سیاس سے کہیں زیادہ ایک مدبر اور صاحب فکر و نظر تھے۔ اُن کی سیاسی زندگی میں بھی یہ وصف ہمیشہ نمایاں رہے

۱۔ اُن کا ذہنی توازن و متانت اور ۲۔ فیصلہ کی سچائی اور نکھار۔ اپنے اندر احساس و شعور کی شاعرانہ نزاکتیں رکھتے ہوئے بھی اُنھوں نے کبھی اپنے کسی سیاسی معاملہ پر جذبات کی پرچھائیں نہ پڑنے دی۔ اُن کی کوئی پسند یا ناپسندیدگی کبھی جذبات سے متاثر نہ ہوتی تھی۔ حالات و واقعات کی کسی بھی نوعیت کو وہ حسِ مثبت اور ایجابی انداز فکر سے جانچتے تھے۔ وہ دوست و دشمن سب ہی کے لیے حیرت کا باعث ہوتا تھا ان کی نظر میں جو دوررسی اور صاف بینی تھی وہ اسی ذہنی متانت و توازن کا نتیجہ تھی۔ ایک انسان جب تک کسی معاملہ کو خالص عقل و دلیل کی راہ سے جانچتا ہے اُس میں غلطی شاذ و نادر ہی راہ پاتی ہے۔ سیاست ہو یا کوئی دوسرا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موضوع، غلط روی اُسی وقت نمایاں ہوتی ہے جب تنگ نظری ذہنی توازن پر غلبہ پا جاتی ہے اور صورتِ حال کے مختلف پہلوؤں کو جانچنے پرکھنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔

ذہنی سنجیدگی اور قوتِ فیصلہ کے نکھار نے مولانا آزاد کے سیاسی فیصلوں کو بھی وہ رنگ بخشا جو شخصی اور نجی فیصلوں کے عام رنگ سے بہت زیادہ روشن و پاک وصاف تھا جس سے دوست سرنگوں ہوتے تو دشمن بھی لاجواب۔ مولانا کا یہی وصف اس پس منظر کو بھی واضح کرتا ہے کہ کس طرح تلخ ترین نزاعات میں بھی غیظ و غضب کا کوئی لفظ یا غیر شریفانہ الزام دہی کا کوئی جملہ اُن کے ہونٹوں سے کبھی نہ نکل سکا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کے معاملہ میں بھی جنہوں نے مولانا کی توہین و تذلیل اور گزند رسانی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔ تصادم و ٹکراؤ کی آندھیوں میں بھی مولانا جس قدر ثابت قدم اور غیر متزلزل نظر آتے تھے اس کی مثال کسی دوسرے کیرکٹر میں ملنی دشوار ہے دل و دماغ کی اس سلیقہ مندی اور نظم و استقلال نے مولانا مرحوم کو ایسی عظیم شخصیت بنا دیا تھا جس کا عزم و حوصلہ ان کے بدترین دشمنوں سے بھی خراجِ تسلیم و تحسین حاصل کر لیتا تھا۔

مولانا کی شخصیت جس امتیاز، انفرادیت اور علیحدگی پسندی کی حامل تھی، اس کا ایک قدرتی نتیجہ یہ بھی تھا کہ مختلف افسانے اُن کے متعلق بنا دیے جاتے تھے۔ منجملہ اُن کے ایک بے بنیاد کہانی ازہر یونیورسٹی میں اُن کی تعلیم کی بھی مشہور ہوئی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی تمام تر تعلیم گھر پر ہی ہوئی اور وہ ازہر محض ایک وزیٹر کے طور پر گئے تھے جبکہ اُن کی تعلیم تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔

انھوں نے اوائل عمر ہی میں علم و مطالعہ کی جو بلندیاں سر کر لی تھیں اس کا اندازہ ایک اور واقعہ سے نمایاں ہوتا ہے۔ ابتدائی دور ہی میں اپنے ایک بلند پایہ اور عمر رسیدہ معاصر سے مولانا کی تحریری کشمکش مہینوں چلتی رہی۔ معاصر موصوف نے بعض مسائل و نکات پر تفصیلی گفتگو کے لیے مولانا سے ملاقات کی خواہش کی۔ نوعمر مولانا آزاد جب اس عمر رسیدہ عالم کے پاس پہنچے تو انھوں نے بڑی شفقت سے اُن کا خیر مقدم کیا اور پوچھا کہ "آپ کے والد صاحب خود کیوں تشریف نہیں لاتے کہ آپ کو بھیجنا پڑا۔"

یہ واقعہ بھی مولانا کی سوانح میں مشہور ہے کہ ایک تقریب میں جو مولانا ہی کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی جب مولانا پہنچے تو اُن کو دروازہ میں داخل نہ ہونے دیا گیا اس لیے کہ کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ علوم و معارف کا وہ شہسوار جس کی شہرت چار سو ہے، یہ نوجوان ہو سکتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"دور بینی اور مآل اندیشی" ایک ایسا وصف ہے جو انسانوں کو مختلف شکلوں میں اپنے مفید نتائج اور بخششوں سے نوازتا ہے۔ کسی کو اس کی بدولت ظاہری قوت نصیب ہوتی ہے تو کسی کو عقل وفہم کی گہرائی۔ کسی کو اس سے رسوخ ونفوذ حاصل ہوتا ہے تو کسی کو ہر دلعزیزی اور شہرت دوام مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے یہ تمام ثمرات ونتائج کسی ایک ہی انسان کو نصیب ہوں۔ مولانا آزاد مرحوم خوش نصیب تھے کہ دور بینی کی صلاحیت اور مآل اندیشی کے جوہر نے اُن کو وہ تمام خلعتیں یکجا عطا کیں جن کی آرزو کوئی انسان کر سکتا ہے وہ بھی اس خوبی کے ساتھ کہ اُن کا تنوع اور بوقلمونی عام انسانی ادراک وفہم کے لیے باعثِ صد حیرت واستعجاب تھا۔

اُن تمام حیرت انگیز اوصاف وکمالات کے اجتماع نے مولانا کی ذات کو قدرتی طور پر "انفرادیت" کی وہ شان بخشی تھی کہ وہ ذہنی اور وجدانی طور پر خود کو ہمیشہ یکہ وتنہا محسوس کرتے تھے اور جو اُن سے ملتا تھا وہ بھی اُن کے دل ودماغ کی گہرائیوں میں احساس تنہائی وانفرادیت کو ضرور محسوس کرتا تھا۔ خلق وتواضع کے بے مثال جوہر، بے پناہ ہمدردی اور بیشمار رعنائیاں رکھتے ہوئے بھی اُن کی عمر ایک ایسے ذہنی ماحول میں گزری جہاں کوئی رفیق ہمسر۔ کوئی ہمراز وشناسا نظر نہ آتا تھا۔ اپنے فکر وتخیل کی دنیا ہی اُن کی دنیا تھی اور فکر وانہماک ہی نے اُن کو وہ قوت بخشی تھی جس سے وہ تمام عمر کشمکش روزگار کی اُلجھنوں کا مقابلہ کرسکے۔ دلسوزی وغمخواری کے شدید احساسات کے ساتھ اُن میں جرأت وحوصلہ۔ تحمل وبرداشت اور بنی نوع انسان کی فطری صلاحیتوں سے وابستہ "اُمید" کے وہ انمول جواہر بھی تھے جن کے سہارے وہ غمہائے روزگار کو عمر بھر جھیلتے رہے۔ خدائے برحق پر اعتماد واعتقاد کی قوت ان میں بے اندازہ تھی۔ اسوۂ حسنہ اور اعتقاد ویقین کی دولت ہی مولانا مرحوم کی وراثت ہے جو وہ آنے والی نسلوں کے لیے باقی چھوڑ گئے ہیں۔

رحمہ اللہ وشکر مساعیہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد کی شخصیت کے بعض اہم پہلو

ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی

موجودہ صدی کے نصف اول میں ہندوستان کو مختلف حیثیتوں سے جو اہم شخصیتیں میسر آئیں ان کا احاطہ بہت دشوار ہے، یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عہد غلامی میں اتنے کم ترقی یافتہ ملک میں اتنی عظیم شخصیتیں بیک وقت کیسے جمع ہو گئیں تھیں۔ گاندھی، ٹیگور، اقبال، محمد علی، سی آر داس، موتی لال نہرو، اجمل خاں، مختار احمد انصاری، جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، سروجنی نائیڈو اور سبھاش چندر بوس میں سے ہر شخص ایسا تھا جس کا وجود بجائے خود ملک کے لیے ہر طرح باعثِ خیر و برکت تھا۔ میں نے ایک دفعہ کسی انگریز مصنف کا یہ قول پڑھا تھا۔ کہ کسی بڑے آدمی کے زمانۂ حیات میں اس کے ملک میں زندہ رہنا بہت خوش قسمتی کی بات ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ وہ لوگ کتنے خوش قسمت تھے جو بیک وقت اتنے بہت سے بڑے آدمیوں کے درمیان اس ملک میں چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ اتنی عظیم شخصیتوں کی موجودگی میں کسی شخص کے لیے عظمت حاصل کرنا اور ایسی عظمت حاصل کرنا جس میں اپنی ایک علیٰحدہ امتیازی شان ہو کتنا دشوار کام ہو گا۔ یہ صحیح ہے کہ اس منزل تک پہنچنے میں قدرت اپنی فیاضانہ بخششوں سے ضرور نوازتی ہے۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ قدرت کی فیاضانہ بخششوں کے ساتھ ساتھ یقینِ محکم اور عمل پیہم کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ہم نے کتنی قدرت کی عطا کی ہوئی ذہانتوں کو اُن اوصاف کی کمی کی وجہ سے رائگاں ہوتے یا غلط راستہ اختیار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جن بزرگوں کے اسمائے گرامی اوپر درج کیے گئے ہیں ان میں سے بھی کتنے ہیں جن کی عظمت کا معیار شروع سے آخر تک یکساں رہا ہو اور پھر یہ عظمت خیال و قول اور عمل پر یکساں حاوی ہو کچھ لوگوں کے خیالات عظیم ہوتے ہیں لیکن وہ انھیں اس طرح دوسروں تک پہنچانے سے قاصر رہتے ہیں کہ سننے اور پڑھنے والوں کے ذہنوں کو آسودگی اور روحوں کو بالیدگی حاصل ہو اور ان کے دلوں میں حسین عمل کی شمعیں فروزاں ہو جائیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے خیالات کو حسین اور پُرجوش الفاظ کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پردوں میں دوسروں تک پہنچانے کی قدرت تامہ رکھتے ہیں لیکن خود ان کی اپنی زندگیوں میں ان خیالات کی پرچھائیاں ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتی ہیں اور ان کا اپنا کردار ان کی ہر ہر قدم پر تکذیب کرتا ہے اور ان کا مذاق اڑاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر ہم اس معیار پر حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کو قطعاً غیر جانبداری اور بے تعصبی سے جانچنے کی کوشش کریں تو ہمیں بڑی خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس طرح ان تمام اوصاف کے جامع تھے۔ اور اس سے ہمیں ان کی اس امتیازی شان کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے جس نے انہیں اتنی عظیم شخصیتوں کی موجودگی میں ایک ایسی انوکھی اور مخصوص عظمت کا حامل بنا دیا تھا جو اس زمانے میں بھی کسی دوسرے شخص میں نظر نہیں آتی تھی جب حضرت مولانا کی وفات پر پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا تھا کہ ان کی جیسی مخصوص عظمت اب اس ملک میں کبھی دوبارہ دیکھنے میں نہیں آئے گی تو اس میں کوئی مبالغہ یا شاعری ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ ان کا یہ مقولہ سراسر حقیقت پر مبنی تھا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کو عظمت اس وقت حاصل ہوگئی تھی جب دوسرے لوگ اس کے صحیح معنی و مطلب سمجھنے کی اہلیت بھی اپنے اندر مشکل ہی سے رکھتے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی اور اور خواجہ الطاف حسین حالی نے کس طرح مولانا آزاد کو ان کا بیٹا سمجھ لیا تھا یہ قصہ تو اتنی بار نقل ہو چکا ہے کہ اب اس میں کوئی انوکھا پن باقی نہیں رہ گیا ہے۔ پنڈت نہرو نے لکھا ہے کہ جب وہ حصول تعلیم کے بعد انگلستان سے واپس آئے تو دیکھتے تھے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی نشستوں میں بہت سے بوڑھے لوگوں کے ساتھ ایک نوجوان بھی شریک ہوتا تھا۔ انہیں اس پر حیرت و رشک ہوتا تھا کہ وہ خود ان مجالس کے قریب نہیں جا سکتے تھے، لیکن ان کا یہ ہم عمر نوجوان نہ صرف اس میں شریک رہتا تھا بلکہ اس کے مشوروں اور آراء کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ بعد میں جب انھیں اس نوجوان کو زیادہ قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ دراصل "جوان کاندھوں پر بوڑھا سر رکھا ہوا تھا" کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ یہ نوجوان مولانا ابوالکلام آزاد ہی تھے؟ یہ بات بھی غالباً اکثر لوگوں کو معلوم ہوگی کانگریس کی آج تک کی تاریخ میں مولانا آزادؒ اس کے سب سے کم عمر صدر رہے ہیں اور اس وقت رہے ہیں جب دانش مند اور دیانتدار لوگوں کی آج کی طرح کمی نہ تھی۔ انھیں یہ اعزاز ۳۵ سال کی عمر میں حاصل ہوا تھا۔ نیتاجی سبھاش کو ۴۱ سال کی عمر میں حاصل ہوا اور پنڈت نہرو کو ۴۰ سال کی عمر میں کانگریس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے باقی تمام صدر اس سے بہت زیادہ عمر میں اس منصب جلیل تک پہنچ سکے ۱۹۲۲ء کی بات ہے جب کانگریس کے نرم اور گرم دلوں میں مجالس قانون ساز میں شرکت اور عدم شرکت پر شدید اختلاف رائے تھا خود مولانا آزادؒ اس دل کے ساتھ تھے جو ان مجالس میں شرکت کا حامی تھا۔ لیکن جب انھیں اتنی کم عمری میں کانگریس کے خصوصی اجلاس کا جو دہلی میں منعقد ہوا، صدر بنایا گیا تو انہوں نے یہ فارمولا پیش فرمایا کہ جو لوگ شرکت کے حامی ہیں وہ شریک ہوں اور جو حامی نہیں ہیں وہ باہر رہ کر تعمیری کام جاری رکھیں اور بالآخر اسی فارمولے کے مطابق فیصلہ ہو گیا جس گتھی کا سلجھنا اتنا دشوار نظر آرہا تھا وہ کس قدر آسانی سے سلجھ گئی اور حضرت مولانا کی عظمت اور دانشمندی کا ہر شخص قائل ہو گیا۔

مولانا آزاد نے ۲۴ سال کی مختصر عمر میں ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے "الہلال" جاری فرمایا تو اس شان سے کہ آج تک اردو کا کوئی دوسرا جریدہ اس کے قائم کیے ہوئے معیار پر فوقیت نہیں لے جا سکا ہے۔ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو "الہلال" کے مضامین کو پوری طرح سمجھنے کی اہلیت بھی اپنے اندر رکھتے ہوں۔ اس معیار کا ایک جملہ بھی لکھ سکنا تو علٰحدہ رہا۔ "الہلال" کے مضامین صرف اپنے انشاء اور طرز تحریر ہی کے لحاظ سے عظیم نہیں تھے بلکہ ان میں جو خیالات جس بے باکی اور جرأت سے ظاہر کیے جاتے تھے وہ عظیم تر تھے۔ اور پھر یہ کتنی عجیب اور غیر معمولی بات ہے کہ شخصی اور عوامی زندگی کا جو سانچا انھوں نے ۱۹۱۲ء میں ۲۴ سال کی عمر میں بنایا تھا ۱۹۵۸ء میں ۷۰ سال کی عمر تک وہی قائم رہا۔ کیسے کیسے طوفان آئے کیسی کیسی آندھیاں چلیں۔ کیسی کیسی زدیں پڑیں لیکن ٹوٹنا تو علٰحدہ رہا یہ سانچا ذرا ٹیڑھا بھی تو نہیں ہو سکا۔ خیالات اور عقائد کی کیسی کیسی شکست و ریخت وقت کے کتنے بڑے بڑے آدمیوں میں ہم نے دیکھی ہے لیکن خدا مقامات بلند کرے ابو الکلام آزاد کے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۵۸ء تک اس سرِ حق آگاہ کا انداز ہ اور طور و طریق یکساں ہی رہا اس میں بال کی برابر ٹیڑھ بھی تو نہیں آسکی۔

خیالات اور عقائد کی مضبوطی ہی سب کچھ نہیں ہے، دیکھنا یہ بھی ہوتا ہے کہ جن عقائد پر زندگی کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ وہ بجائے خود کیسے ہیں، اچھے یا بُرے، اعلیٰ یا ادنیٰ۔ جہاں تک صرف مضبوطی کا سوال ہے وہ تو ابوجہل میں بھی تھی۔ لیکن اس سے اس کی شخصیت عظیم اور تابناک تو نہیں ہو جا سکتی ہے۔ مولانا آزادؒ نے جن عقائد پر اپنی زندگی کی تعمیر کی ان میں دین کا صحیح تصور ایسا تصور جو تمام دنیا سے محبت کرنا سکھاتا ہے نہ کہ نفرت وطن سے سچی محبت۔ ایسی محبت جو اس کی خاطر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنا سب کچھ لٹا دینے پر آمادہ کرتی ہے، اور انسانیت کے احترام کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہی ولولے تھے جنھوں نے انھیں بتایا کہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت برطانوی امپریلزم کے خلاف جہادِ حریت میں دل وجان سے شرکت ہے۔ بغیر اس کے نہ تو دین کی روح کو قائم رکھنا ممکن ہے نہ ہندوستان کی کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کرنا اور نہ دبی اور پسی ہوئی انسانیت (جس میں بالخصوص ایشیا اور افریقہ کے لاتعداد ممالک شامل تھے) کو طوقِ غلامی سے نجات دلانا۔ اس راہ میں جو چیز بھی حائل ہوئی مولانا آزادؒ نے اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا، چاہے وہ برطانوی حکومت کے طوق و سلاسل ہوں، چاہے اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے طعن و تشنیع۔ اس سلسلے میں بالخصوص انھیں جس قدر اور جس طرح ملک کے فرقہ وارانہ عناصر سے نبرد آزما ہونا پڑا اس سے ان کی شخصیت کے بعض بڑے عجیب اور تابناک پہلو ہماری نظر کے سامنے رونما ہوتے ہیں مسلم لیگ کے بارے میں ان کا جو نقطۂ نظر اور اس پر عمل تھا وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اس پر بعض گوشوں سے عجیب وغریب پردے ڈالے گئے اور اسے عجیب وغریب معنی پہنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مشہور صحافی ابوسعید بزمی صاحب مرحوم نے لکھا تھا کہ مسلم لیگی عناصر کی طرف سے جو مخالفت کی گئی اور انھیں جو ایذائیں پہنچائی گئیں اس نے ان کے مزاج میں ضد پیدا کر دی ورنہ ممکن تھا کہ وہ مسلم لیگ سے اس قسم کا سمجھوتا کر لیتے یہ بات صرف اسی وقت کہی جا سکتی ہے۔ جب کوئی شخص حضرت مولانا کے مزاج اور کردار سے پوری طرح واقف نہ ہو یا اس کی نیت میں کھوٹ ہو۔ مسلم لیگ کے باب میں ان کا طرزِ عمل شروع ہی سے تھا جو آخر تک رہا۔ اس سلسلہ میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کی یہ شہادت بھی بہت دقیع اور پرمعنی ہے کہ "ہوش سنبھالتے ہی مسلم لیگ کو سمجھ لیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں مسٹر زاہد سہروردی کے مکان پر انھوں نے حسن نظامی کے ایک کاغذ پر یہ لکھا تھا "سب باتیں منظور ہیں باستثنائے شرکت مسلم لیگ" گویا ۳۴ برس پہلے بھی وہ مسلم لیگ سے اتنے ہی بیزار تھے جتنے آجکل ہیں"۔ حضرت مولانا کا یہ طرزِ عمل آخر وقت تک قائم رہا۔ ۱۹۳۵ء کی دستوری اصلاحات کے بعد جب مسٹر جناح بہمہ کروفر اسلامی ہند کے سیاسی اسٹیج پر دوبارہ وارد ہوئے تو ہمارے علماء کی بڑی جماعت نے اپنی نیک نیتی لیکن ساتھ ہی سادہ لوحی کے سبب ان سے سمجھوتا کرنا چاہا اور ان کی لیڈرشپ قبول کر لی، لیکن مولانا آزاد کا نورِ ایمانی اور سیاسی بصیرت اس موقع پر بھی ان کے کام آئی اور وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہلے اس تصادم نے صرف ان کے عزم واستقامت ہی کو نمایاں نہیں کیا بلکہ ان کی فطرت کے اور بھی کئی ممتاز اور قابلِ تعریف پہلو اجاگر ہوگئے جن میں سے ایک

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کی غیر معمولی سیاسی سوجھ بوجھ بھی ہے جب ۱۹۴۶ء میں کرپس مشن ہندوستان آیا اور کانگریس کے صدر کی حیثیت سے حضرت مولانا نے ان مذاکرات میں نمایاں حصہ لیا اس وقت انھوں نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ پاکستان کا قیام جتنے مسائل حل کرے گا ان سے بہت زیادہ نئے ناقابلِ حل مسائل پیدا بھی کردے گا آج اس واقعہ کو ۳۰ سال گزر جانے کے بعد جب ہم حضرت مولانا کے اس جملہ پر جو نہ معلوم کس عالم میں ان کی زبان فیض ترجمان سے نکلا تھا غور کرتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ان کی نظر اپنے وقت سے کتنا آگے دیکھ رہی تھی اور ان کی سیاسی بصیرت نے ان کے لیے مستقبل کے تاریک پردوں کو کس طرح چاک کر کے رکھ دیا تھا۔ اقبال نے اپنے لیے ایک نظم میں "شاعرِ فردا" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مولانا آزادؒ بلاشبہ "مدبرِ فردا" تھے۔

اس تمام سیاسی ہنگامہ آرائی کے زمانے میں جس طرح بڑے بڑے لوگوں کی فطرت کا چھوٹا پن۔ انتقام پسندی اور خود نمائی نمایاں ہوئی اس کا ذکر چنداں ضروری نہیں ہے۔ لیکن پورے ہندوستان میں شاید دو آدمی تھے جن کی شرافت اور انسانیت کا دامن بالکل بے داغ اور اجلا رہا، ایک مہاتما گاندھی اور دوسرے مولانا آزادؒ۔ مولانا آزاد کے خلاف کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ لیکن انہوں نے اپنی زبان اور قلم کو کبھی کسی کی ذاتی مخالفت اور سب و شتم سے آلودہ نہیں ہونے دیا" حال آں کہ بقول پروفیسر سرور جامعی" وہ صحیح معنوں میں ابوالکلام تھے۔ اور اگر لکھنے پر آتے تو ان کا قلم ذوالفقار سے کم نہیں تھا" ڈاکٹر ذاکر حسین نے کتنا صحیح کہا ہے کہ وقت کی وہ کونسی بڑی سے بڑی گالی تھی جو مسلمانوں نے مولانا آزادؒ کو نہیں دی" لیکن شاباش ہے عفو و درگزر کے اس کوہ ہمالہ کو کہ اس نے اس وقت بھی کہ اس کا ایک اشارۂ چشم و ابرو ان میں سے بہت سوں کے لیے اس ملک میں عرصۂ حیات تنگ کر سکتا تھا۔ سوائے خیر خواہی اور پشت پناہی کے ان کے ساتھ اور کچھ نہیں کیا ڈاکٹر سید محمود اس کے گواہ ہیں کہ مسلمانوں کی گذشتہ مضرت رساں سیاست کا جب آپس میں بھی کبھی ذکر آیا تو خاموش رہ گئے۔ یا اگر کچھ کہا تو صرف یہ کہا کہ "اپنے سینے کا داغ کس کو دکھاؤں؟" یہ مقام کس کو میسر آتا ہے اور جسے میسر آجاتا ہے اس کے فرشتہ خصلت ہونے میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے؟

جس طرح مولانا آزادؒ کا تصادم تقسیم ہند سے پہلے مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست سے ہوا اسی طرح تقسیم ہند کے بعد ہندوؤں کی فرقہ وارانہ سیاست سے بھی ہوا۔ یہ وقت ان کے لیے اور بھی زیادہ سخت تھا کیونکہ اس وقت اس فرقہ پرستی میں خود کانگریس کے بعض نامی گرامی نیتا شریک تھے۔ دراصل تقسیم ہند سے فوراً پہلے اور اس کے فوراً بعد جو حالات و واقعات رونما ہوئے انہوں نے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بڑے بڑے نیشنلسٹوں اور ہندو مسلم اتحاد کے حامیوں کو صراط مستقیم سے دور ہٹا دیا تھا اس میں ہندو مسلمان سکھ سب ہی یکساں شریک تھے اس وقت اس ملک میں قوم پروری کے "سب سے بڑے قلعہ دار" صرف تین آدمی رہ گئے تھے، گاندھی جی، پنڈت نہرو اور مولانا آزادؒ۔ مولانا آزادؒ نے اس صورت حال کا مقابلہ بھی اسی جوانمردی، مستقل مزاجی اور دور اندیشی سے کیا جیسے تقسیم ہند سے پہلے مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست کا کیا تھا، نہ تو انھوں نے یہ کیا کہ مسلمانوں کو مشورہ دیتے کہ اکثریتی فرقے اور حکومت وقت کے مقابلے میں بزدلی، بے حمیتی اور کاسہ لیسی کی پالیسی اختیار کریں، نہ یہ کہ ہندوقوں کو من حیث القوم فرقہ پرست اور ناقابل اعتماد قرار دے کر مسلمانوں کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت اور غصے کے جذبات کی آبیاری کرتے اور نہ یہ کیا کہ حالات کی گمبھیرتا اور سنجیدگی سے گھبرا کر خرابی صحت یا کسی اور چیز کا بہانہ کر کے وقت کے تقاضوں سے منہ موڑ لیتے اور گھر کی چہار دیواری میں روپوش ہو کر بیٹھ جاتے، انھوں نے ان راہوں میں سے کوئی راہ بھی تو اختیار نہیں کی بلکہ ایک طرف مسلمانوں کو برابر مشورہ دیتے رہے کہ "مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں.... یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ رخصت نہیں ہو گئے؟ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو انھیں اپنے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ . . . . میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا، انھیں بھلاؤ نہیں، انہیں چھوڑو نہیں، ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ، عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں۔ اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔" دوسری طرف وقت آنے پر یہ نعرۂ حق بھی بلند کرتے رہے کہ "پاکستان کے قیام کی ذمہ داری تنہا مسلمانوں پر نہیں ہے بلکہ اس ہندو دماغ پر بھی ہے (جس کی نمائندگی ٹنڈن جی وغیرہ کرتے ہیں) میں نے مسلمانوں کو ہمیشہ سمجھایا کہ وہ اس ہندو دماغ کو ہندوستان کا نمائندہ نہ سمجھیں بلکہ گاندھی جی کو سمجھیں لیکن انھوں نے میری بات نہیں مانی (اور ہندوستان بٹ گیا)۔ اگر یہ ہندو دماغ نہ ہوتا تو ملک کبھی نہ بٹتا" اور تیسری طرف حکومت کے اندر رہ کر اس کی مشینری کو غیر فرقہ وارانہ اور جمہوری سانچوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ڈھانے کی امکانی کوشش کرتے رہے اور اس کی پالیسیوں پر اثر انداز ہو کر اسے وہاں تک لے آئے جہاں آج وہ کھڑی ہے۔ اگرچہ اس جدوجہد میں ان کے اعضا شل ہو گئے ان کی جسمانی صحت جواب دے گئی، ان کے دل و دماغ نے پے بہ پے اور طرح طرح کے صدمات اور مایوسیاں برداشت کیں اور بالآخر ایک تاریک اور قیامت خیز رات کو ان کی مادی اور دنیوی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

ابھی تک میں نے مولانا آزاد کے برطانوی امپیریلزم سے تصادم کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ دراصل داستان کافی معروف ہے۔ پھر بھی اس سے حضرت مولانا کی شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں پر بڑی خوشگوار روشنی پڑتی ہے انھوں نے بیرونی حکومت کے خلاف جہاد اس وقت شروع کر دیا تھا جب گاندھی جی بھی ہندوستان کے سیاسی اسٹیج پر نمودار نہیں ہوتے تھے۔ یہ خود کچھ کم بڑا اعزاز نہیں ہے لیکن اس سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ ملکی معاملات اور بالخصوص ملک کے فرقہ وارانہ مسائل میں خود گاندھی جی اور ان کے بعد پنڈت نہرو، مولاناؒ کے مشوروں اور آرا، کو غیر معمولی اہمیت دیتے رہے اور پنڈت نہرو نے تو ایک مضمون میں لکھا ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی پاس کردہ تجاویز پر مولانا آزاد کی غیر معمولی شخصیت کی چھاپ ہمیشہ نمایاں رہتی تھی۔

حضرت مولاناؒ نے غیر ملکی حکومت کے جبر و استبداد کا مقابلہ جس عزم و حوصلہ، آن بان، خوش دلی اور دل جمعی سے کیا اس کی مثال ملنی آسان نہیں انھوں نے سخت سے سخت مرحلے پر بھی اپنے توازن ذہنی اور فطری خوش طبعی اور زندہ دلی میں ذرا فرق نہیں آنے دیا۔ ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے موقع پر وہ کانگریس کے صدر تھے اور دراصل یہ تحریک ان کی اور گاندھی جی کی قیادت ہی میں چلائی گئی تھی۔ اس موقع پر ضمناً یہ ذکر بھی نامناسب نہیں ہوگا کہ ۱۹۴۰ء میں مولانا آزادؒ کو تیسری دفعہ کانگریس کی صدارت کا اعزاز حاصل ہوا تھا اور کانگریس کی اب تک کی تاریخ میں وہ مسلسل سب سے طویل عرصے یعنی چھ۶ سال تک کانگریس کے صدر رہے ہیں۔ اس دوران میں بعض ایسے اہم واقعات جیسے دوسری عالمی جنگ، انفرادی ستیہ گرہ، ہندوستان چھوڑ دو تحریک، شملہ کانفرنس اور کرپس مشن سے مذاکرات وقوع میں آئے اور ان مواقع پر انھوں نے ہی کانگرس کی لیڈر شپ اور نمائندگی کے فرائض انجام دیے۔ "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے نتیجے میں مہاتما گاندھی، مولانا آزادؒ اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام اراکین کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور کسی نامعلوم مقام پر نظر بندی کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔ عالمی جنگ کی وجہ سے صورت حال تشویش ناک تھی اور کسی کو نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معلوم تھا کہ ان گرفتارانِ بلا پر کیا گزرے گی اور ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا، قید تنہائی جلا وطنی یا اس سے بھی کچھ زیادہ بہر حال ان لوگوں میں سے اکثر کو (جن میں مولانا آزاد بھی شامل تھے) احمد نگر لے جایا گیا اور قلعہ میں محبوس کر دیا گیا۔ طویل تھکن اور بیداری کا بوجھ اتارنے کے بعد قلعۂ احمد نگر کی تنہائیوں میں حضرت مولانا کو ایک "غائب از نظر، ہم نشین دل" حبیب لبیب کی یاد آئی اور انھوں نے زبان قلم سے صفحۂ قرطاس پر اپنے واردات قلب کے موتی بکھیرنے شروع کر دیے سب سے پہلے داستان بے ستون و کوہ کن، ترتیب دی اور اپنی گرفتاری کا حال سپرد قلم کرنے کے بعد تحریر فرمایا، "کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی، سامنے دیکھا تو سمندر اچھل اچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیم صبح کے جھونکے احاطے کی روشوں میں پھرتے ہوئے ملے، پھولوں کی خوشبو چن چن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا رہے ایک جھونکا کار میں سے گزرا تو بے اختیار حافظ کی غزل یاد آگئی ؎

صبا وقت سحر بوئے ز زلفِ یار می آورد
دل شوریدۂ ما راز نو در کار می آورد"

جس قسم کے حالات درپیش تھے ان میں یہ زندہ دلی اور دل جمعی کتنے بڑے دل گردے کا کام ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے دوران میں حضرت مولانا پر ایک بہت سخت وقت گزرا۔ ان کی بیگم صاحبہ (جو کلکتہ میں تھیں) علیل ہو گئیں اور علالت نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ علالت کی اطلاع حضرت مولانا کو اخباروں سے ہوتی رہی برطانوی عہد کے کارندوں نے انھیں مشورہ دیا کہ اگر وہ بیگم صاحبہ کی عیادت اور تیمارداری کے لیے کلکتہ جانا چاہیں تو حکومت سے اس کی درخواست کریں، حکومت اجازت دینے کے لیے آمادہ ہے۔ حضرت مولانا نے اس مشورہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ وہ غیر ملکی حکومت کے سامنے کوئی درخواست پیش کرنا اپنی قومی خودداری کے منافی سمجھتے ہیں۔ پنڈت نہرو کو بھی بیچ میں ڈالا گیا۔ لیکن نتیجہ وہی رہا جو پہلے تھا تا آنکہ بیگم صاحبہ کی وفات ہو گئی "غبار خاطر"، کہ جس کے خط میں حضرت مولاناؒ نے بیگم صاحبہ کی علالت اور وفات کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موقع پر ان کے تاثرات کیا تھے اور قلب و جگر پر کیا گزری تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ طرز عمل قائم رکھنا اور قومی خودداری کی اتنی اعلیٰ مثال پیش کرنا ان سے کم تر درجے کے کسی آدمی کے بس کی بات ہرگز نہیں تھی۔

خودداری اور عزت نفس کی جو مثالیں حضرت مولاناؒ نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ہندوستان میں پیش کیں ان کی دوسری مثال ڈھونڈھنے سے بھی ملنی آسان نہیں ہے۔ اس سے انھوں نے نہ صرف اپنا بلکہ ملک میں مسلمانوں اور ملک سے باہر ہندوستانیوں کا وقار بھی بہت اونچا کردیا اور بالخصوص طبقۂ علماء کو توان کی ذات اور مثال سے وہ چار چاند لگے جن کی چمک دمک ابھی بہت عرصہ تک ہندوستان کے سیاسی افق کو منور کیے رہے گی۔

اور ان کی اس خودداری اور عزت نفس کا ہندوستان کے دوسرے قومی لیڈروں مثلاً موتی لال نہرو، سی آر داس، حکیم اجمل خاں، مہاتما گاندھی جواہر لال نہرو کو ہمیشہ بہت احساس رہا اور وہ برابر اس کی رعایت کرتے رہے۔ بیرون ملک کے سیاسی رہنماؤں، حکومتوں کے سربراہوں اور دوسرے دانش وروں کے سامنے مولانا آزادؒ ہمیشہ ہندوستانی لباس میں رونما ہوئے اور ہندوستانی زبان میں گفتگو کی اور اس طرح کی کہ عقل و دانش اور فہم و فراست کے دریا بہا دیے اس سے ہندوستان اور ہندوستانیوں کا وقار جیسا کچھ بلند ہوا ہو گا وہ ظاہر ہے۔

مولانا آزاد کی وفات پر ملک و قوم نے جس طرح ان کا ماتم منایا اور جن الفاظ میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا انھیں دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی تھی۔ حیرت کی وجہ یہ بالکل نہیں تھی کہ مولاناؒ کا منصب اس سے کسی طرح فروتر تھا۔ نہیں بلکہ یہ جو کچھ ہوا وہ عین ان کے شایان شان تھا۔ حیرت کی وجہ یہ تھی کہ مولاناؒ ایک تنہائی پسند، کم آمیز اور شہرت سے دور بھاگنے والے بزرگ تھے اور انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملتے جلتے ہیں، جن تک ہماری رسائی بہ آسانی ہو سکتی ہے اور جن سے ہمیں ذاتی فوائد حاصل ہوتے ہیں، ان کی جدائی سے ہم زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اور اس پر زیادہ آنسو بہاتے ہیں۔ اس کی بھی دو مثالیں ہماری آنکھوں کے سامنے حصول آزادی کے بعد گزر چکی ہیں۔ ایک سردار پٹیل کی موت پر اور دوسری قدوائی صاحب کے انتقال پر ان دونوں بزرگوں کا جو ماتم ہوا وہ فطرت انسانی کے عین مطابق تھا۔ لیکن حضرت مولانا کی مثال اس سے بالکل مختلف تھی۔ ان کی موت کا ماتم اگر صرف سیاسی اور سرکاری حلقوں میں ہوا ہوتا تو سمجھ میں آنے والی بات تھی اس لیے کہ ہندوستان کا بیدار مغز حاکم اور کانگریس کا ایک باوقار دور اندیش رہنما جدا ہو رہا تھا اور ان دونوں حیثیتوں سے جو لوگ ان کے قریب تھے ان کا متاثر ہونا اور آہ و بکا کرنا بالکل قدرتی امر تھا، لیکن ہم نے دیکھا کہ ان کی وفات سے پہلے دہلی کے عام باشندوں میں جو بے چینی اور بے تابی پائی جاتی تھی اور اس کے بعد ان کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ان کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے جس طرح امنڈ آیا تھا اور جس طرح اُن کا ماتم کر رہا تھا اُس کی اگر کوئی مثال ہندوستان کی حالیہ تاریخ میں مل سکتی ہے تو صرف ایک مل سکتی ہے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور وہ گاندھی جی کی مثال ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟ میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی صرف دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو مولانا کی ہزار پہلو اور ہمہ جہت شخصیت اور دوسری اُن کی بے مثال اور لاثانی بے نفسی اور بے غرضی۔ مولانا کی وفات سے صرف وہ لوگ متاثر نہیں تھے جو سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ اُس میں اہل مذہب، اہل علم، ادیب، شاعر، تعلیمی اداروں سے تعلق رکھنے والے لوگ اور ہندوستانی ثقافت و تمدن کے نمایندے بھی یکساں شریک تھے۔ عام لوگوں کو جس چیز نے زیادہ رنج پہنچایا تھا وہ یہ تھی کہ ایک ایسا سیاست دان اور رہنما اُن سے رُوٹھ کر جا رہا تھا جس نے اُن کی سیاسی آزادی، معاشی خوشحالی اور خود مختاری و سربلندی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ اور اُس کے بدلے میں اپنے لیے کبھی کچھ نہیں چاہا تھا۔ اُسے جو کچھ ملا اُس میں اُس کی اپنی خواہش اور چاہت کو بالکل دخل نہیں تھا۔ وہ اعزازات کے پیچھے نہیں دوڑتا تھا اعزازات اُس کے پیچھے دوڑتے تھے۔ مہادیو ڈیسائی نے لکھا ہے کہ "کانگریس کے معاملات میں مولانا کی حیثیت بے مثل ڈکٹیٹر کی رہی ہے انھیں سالہا سال سے یہ حیثیت حاصل ہے اور رہے گی، مگر اس کے باوجود آپ ہمیشہ اس قسم کے عہدے قبول کرنے سے بھاگتے تھے۔ آپ اگر چاہتے تو کسی صوبائی اسمبلی یا مرکزی اسمبلی میں پارٹی لیڈر بن سکتے تھے، مگر آپ ہمیشہ صاف بچ کر نکل جاتے رہے۔" یہ تو اس وقت کی بات ہے جب ابھی آزادی حاصل نہیں ہوئی تھی جب آزادی حاصل ہونے کا وقت قریب آیا اور کانگریس کے ہاتھ میں ہر طرح کا اعزاز و منصب آگیا تو مولانا آزادؒ شروع میں ہندوستان کی عبوری حکومت میں شریک ہونے پر ہرگز راضی نہیں ہوئے بلکہ اپنی جگہ آصف علی صاحب (مرحوم) کو وزیر بنوا دیا بعد میں جب محسوس ہوا کہ حکومت میں اُن کی شرکت بہر حال ضروری اور ناگزیر ہے تو شریک ہوئے لیکن اپنے ذوق اور رُجحان کے مطابق وزارت تعلیم کا قلمدان اپنے لیے مخصوص کر لیا اور آخر وقت تک اُسی پر اکتفا کی حالانکہ اگر وہ چاہتے تو تعلیم کے مقابلے میں زیادہ نمود و نمائش اور شہرت و اقتدار کی کوئی بھی وزارت پسند کر سکتے تھے گذشتہ عام انتخابات سے پہلے ہندوستان کی صدارت کے لیے جن گراں مایہ شخصیتوں کے نام لیے جا رہے تھے اُن میں حضرت مولاناؒ کا نامِ نامی سرفہرست تھا لیکن جب پریس کے نمایندوں نے اُن سے اس بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ "میں کوئی ایسا منصب نہیں چاہتا جس میں صرف نام ہو، کام نہ ہو۔ صدارت میں سوائے ایک وسیع عمارت اور خوشنما باغ کے اور کیا دھرا ہے۔" اس سے حضرت مولاناؒ کی بے غرضی اور عظمت نفس اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے اور یہی وہ سب سے بڑا سبب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے جس نے اُن کی وفات پر ہندوستان کی عام جنتا کو اس طرح رُلایا اور تڑپایا۔

یہ مولانا آزادؒ کی عظیم اور نادر روزگار شخصیت کے چند ایسے اہم پہلو ہیں جن میں وہ بڑی حد تک بے مثال اور یگانہ تھے۔ ان کے علاوہ اُن کا بے پناہ علم و فضل، نیز ذہانت، ہمہ گیر حافظہ، نفاست پسندی، پابندی اوقات، عوام دوستی، ترقی پسندی اور اعلیٰ اور آفاقی تمدن جیسی اور ایسی چیزیں ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اُن جیسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتی ہیں اور جب ہو جاتی ہیں تو اپنا نے زمانہ کی ناقدری اور سرکشی کے باوجود اپنے وجود سے چاروں طرف روشنی کی زرتار شعاعیں بکھیرتی رہتی ہیں اور زندگی کی تاریک راہوں کو بھی منور کر کے رکھ دیتی ہیں جس کا سلسلہ اُن کی وفات کے بعد بھی جاری رہتا ہے بشرطیکہ ہم اُن کے پیغام کو سمجھیں اور اُسے پھیلانے یا عام بنانے کی کوشش کرتے رہیں اُن کی وفات سے ملک و قوم نے ایک ایسا بیش بہا سرمایہ کھو دیا ہے۔ جواب ہمیں ڈھونڈنے سے نہیں مل سکتا ۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم
سدا رہے نام اللہ کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد بحیثیت ایک انسان

خواجہ غلام السیدین

عالم کائنات میں انسان سے زیادہ حیرت ناک کوئی ہستی نہیں ہے فرشتوں سے زیادہ افضل اور حیوانوں سے بدتر، دنیا کا سب سے زیادہ پیچیدہ COMPUTER سے زیادہ پیچیدہ اور بے اندازہ امکانات کا مالک، بقول اقبال

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے — دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے — پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثر آہِ رسا دیکھ

مولانا آزاد نے شعوری طور پر اور نہایت سلیقہ کے ساتھ اپنی خودی کی تعمیر کی تھی۔ وراثت میں سیرت اور دل و دماغ کا بیش بہا خزانہ پایا تھا، بزرگوں کی تربیت سے بہت کچھ حاصل کیا تھا اور پھر اپنی ذاتی اپج اور انفرادیت کے طفیل ہر معاملہ میں اپنی ایک ذاتی راہ نکالی تھی اور باوجود وراثت اور تربیت کے اثرات قبول کرنے کے ان کو تمام و کمال اپنانے سے انکار کر دیا تھا۔ زندگی بھر اپنے ہی بنائے راستے پر چلتے رہے اور دوسروں کو ان پر چلنے کی تربیت دیتے رہے۔ ایمان کو بھی انھوں نے بطور ایک عطیہ خداداد کے نہیں پایا۔ بلکہ اس کے حصول کی راہ میں شک و شبہ کے بہت سے خارزاروں میں سے گزرے اور اس تک طلب، سعی اور فکر کی سخت جدوجہد اور آزمایشوں کے بعد پہنچے۔

سوچیے تو کیسا ہمہ گیر اور غیر معمولی انسان تھا یہ آزاد! میں بہت سے اسمائے صفت استعمال کر کے اپنی تحریر کو بوجھل کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن تعجب ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ بنانے والے نے اپنی نعمتوں کی کس قدر ارزانی کی تھی ان کی ذات پر ایک نہایت جیّد عالم دین جس نے نہ صرف اپنے مذہب بلکہ مذاہب عالم کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان میں نظر پیدا کر کے مذہب اسلام کی تعلیم کا ایک نیا تصور دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ بجائے خود ایک عمر بھر کا کام تھا لیکن ان کی گوناگوں شخصیت کا صرف ایک پہلو تھا۔ انھوں نے ملک کی سیاسی جدوجہد میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک فیصلہ کن حصہ لیا اور قومی زندگی میں بہت سے ایسے موڑ پیش آئے جس میں انھوں نے گاندھی جی اور نہرو کے دوش بدوش انقلابی قیادت کا فرض انجام دیا۔ تیسری طرف ان کی تقریریں اور تحریریں اُردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں اور عرصۂ دراز تک رکھیں گی۔ وہ لفظوں کا جادو، وہ عبارت کا دروبست، وہ فصاحت جو ابتدائی دور میں شوکت الفاظ سے معمور کرتی تھی اور آخری دور میں اپنی سلاست اور زور بیان سے جادو جگاتی تھی۔ پوری تحریر کو ضبط تحریر میں لائیں تو معلوم ہوگا کہ ادب عالیہ میں جگہ پانے کے قابل ہے۔

پھر کیا آپ کو ایک عالمِ دین، ایک صفِ اول کے سیاسی قائد اور ایک بلند پایہ ادیب سے یہ توقع ہوسکتی ہے کہ اس کو مثلاً علم موسیقی سے گہرا لگاؤ اور وسیع واقفیت ہوگی یا اس کا ذوقِ جمال اس قدر لطیف اور شگفتہ ہوگا کہ وہ قرآن شریف کی تفسیر میں بھی اس پہلو کو اجاگر کرکے دکھاتے گا اور فیضانِ جمال کو خدا کی صفات عالیہ میں شمار کرے گا؟ یہ سب چیزیں بھی ان کی ذات میں خوبصورتی کے ساتھ سمائی ہوئی تھیں۔ اور ان سب کا ذکر کرتے ہوئے اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ بات نہ بھول جائے کہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت میں انھوں نے محکمۂ تعلیم کے کاموں میں کس طرح ایک نئی وسعت اور گہرائی پیدا کی اور اس میں بعض بالکل نئے دروازے کھولے، جیسے ادب اور فنون لطیفہ کی اکیڈمیاں یا ثقافتی تعلقات کا محکمہ۔ اس صدی میں ان کے ٹکر کی ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر بھی چند ہی ہستیاں نظر آتی ہیں۔

میں نے ابھی ان کی ذاتی خصوصیات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ان کی ذات میں دو باتیں بہت نمایاں تھیں۔ ایک اصول پرستی جس کا تقاضا ہے کہ انسان جس بات کو صحیح سمجھے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے اور دوسری جرأت، کہ کسی خوف یا لالچ یا نام نہاد "مصلحت" سے متاثر نہ ہو۔ دراصل خوف تو ان لوگوں پر طاری ہوتا ہے جن کا یا تو حساب صاف نہ ہو یا جو اپنے یقین اور اصول کی قیمت ادا کرنے کو تیار نہ ہوں۔ لیکن مولانا کا حساب زندگی ہمیشہ صاف رہا اور کبھی نہ خواہش انعام ہوئی نہ ستائش کی تمنا۔ کوئی خطاب قبول نہیں کیا، سنتا ہوں کہ جب بھارت رتن نے دروازے پر دستک دی تو انھوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ دیکھا کہ اعزازی ڈگریوں سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ مجھے ہدایت تھی کہ اگر کوئی ادارہ یا جماعت ان کے نام پر کسی عمارت یا درسگاہ وغیرہ کا نام رکھنا چاہے تو بغیر ان سے دریافت کیے باسلوب مناسب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معذرت کردو "میں نہیں چاہتا کہ میں جب تک وزیر تعلیم ہوں اس قسم کی کوئی چیز کی جائے !"
جرأت کا یہ حال تھا کہ جب کبھی گاندھی جی یا جواہر لعل سے اختلاف ہوتا تو اس کو کھلم کھلا ان کے سامنے مضبوطی کے ساتھ ظاہر کرتے برخلاف ان لوگوں کے جو سامنے تائید اور پیٹھ پیچھے مخالفت کرتے تھے ۔ اصول پرستی کا ایک قصہ سن لیجیے، ایک صوبہ کی طرف سے پارلیمنٹ کے الیکشن کے لیے ایک امیدوار کا نام بہت اصرار کے ساتھ پیش کیا گیا۔ ان کے پاس صوبہ کانگرس کمیٹی کی طرف سے وفد آیا تار اور ٹیلی فون آئے، ان کے اپنے ساتھیوں اور وزیروں نے سفارش کی لیکن پہاڑ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ اس شخص نے اناج کی ذخیرہ اندوزی کی اس وقت جب لوگ بھوکوں مر رہے تھے "میں کسی طرح اس بات کے لیے آمادہ نہیں ہوں کہ اس کو کانگرس کا ٹکٹ دیا جائے"۔ زندگی ایسی پاک وصاف گذری کہ جب پیدا کرنے والے نے ان کو اپنے پاس بلالیا تو بنک میں اتنا روپیہ نہ تھا کہ موٹر خریدنے کے لیے حکومت سے جو رقم لی تھی اس کو ادا کیا جاسکے ۔ میں نے بحیثیت ان کے جوائنٹ سکریٹری اور سکریٹری کے آٹھ سال سے زیادہ ان کے ساتھ کام کیا اور انھوں نے کبھی کسی امیدوار کے تقرر یا ترقی کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی، کوئی سفارش نہیں کی "یہ تمہارا کام ہے کہ تم قاعدہ اور اصول کے مطابق فیصلہ کرو"۔ دہلی آنے سے پہلے جب میں حکومت بمبئی میں مشیر تعلیم تھا تو اپنے ایک عزیز کے بارے میں خط لکھا لیکن اس میں یہ بات بالکل واضح کردی کہ اس معاملہ میں حکومت کے چیف منسٹر یا کسی وزیر یا حاکم سے سفارش نہ کی جائے۔ مولانا بالعموم بہت لیے دیے رہتے تھے اور لوگوں کو بہت دفعہ اس کی وجہ سے ان کے متعلق غلط فہمی ہوتی تھی غبار خاطر میں خود لکھتے ہیں ،

"ایں افتادِ طبع کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا مورد رہتا ہوں اور لوگوں کو حقیقت حال سمجھا نہیں سکتا لوگ اس حالت کو غرور اور پندار پر محمول کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں دوسروں کو بے سر تصور کرتا ہوں اس لیے ان کی طرف نہیں بڑھتا حالانکہ خود مجھے اپنا ہی بوجھ اٹھنے نہیں دیتا۔ دوسروں کی فکر کہاں کرسکتا ہوں۔

لیکن میں نے دیکھا ہے کہ جب بے تکلف احباب کی صحبت ہوتی (جس میں کوئی ناجنس شریک نہ ہوتا) تو ان کی گفتگو میں بدیہہ گوئی، بذلہ سنجی، مزاج لطیف اور برجستہ شعر خوانی کے پھول کھلتے اور فن گفتگو میں ان کے کمال کا بھید کھلتا۔ بالعموم وہ اپنے جذبات کو ظاہر کرنے میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہت احتیاط برتتے کیوں کہ ان کی طبیعت میں بے پناہ ضبط تھا۔ اس لیے عام طور پر لوگ ان کے دل کے گداز اور محبت کی گہرائی کی جھلک نہ دیکھ پاتے تھے۔ لیکن میں نے خوبی اتفاق سے کبھی کبھی اس دل کو بے نقاب دیکھا اور اس کی گرمی کو محسوس کیا، بس ایک بات اور سن لیجیے۔

مولانا ساری عمر پبلک کام کرتے رہے، ان کی زندگی پبلک کی نظر کے سامنے گزری، وہ قومی زندگی کے تمام امید آفریں اور یاس انگیز ہنگاموں سے گھرے رہے۔ لیکن ان کی زندگی کا اصلی مرکز ان کی ذات کے اندر تھا جس سے وہ اپنی تمام قوت اور الہام حاصل کرتے تھے۔ اپنی جیل خانے کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا چھن گیا تو کیا مضائقہ! وہ تمام سامان جو اندر تھا اور ہے کوئی نہیں چھین سکتا سینے میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اسے سجاتا ہوں اور اس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں۔ انسان کا اصلی عیش دماغ کا ہے، جسم کا نہیں ـــــ یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہے کہ سر و سامانِ کار ہمیشہ اپنے سے باہر ہی ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ وہ ہم سے باہر نہیں، خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔"

اور پھر ایک اور جگہ:

"میں آپ کو بتاؤں کہ اس راہ میں میری کامرانی کا راز کیا ہے؟ میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو اس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ جہانِ زندگی کی ساری رونقیں اس میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں، یہ اجڑا اور ساری دنیا اجڑ گئی

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے   کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے"

دیکھا آپ نے اس مردِ خدا کو، جس کی دولت اس کی ذات کے خزانے میں محفوظ تھی، جو دنیاوی سر و سامان کے بغیر بھی غنی تھا، جس سے اگر کرسئ وزارت یا کانگرس کی صدارت یا سارے دنیاوی اعزاز چھین لیے جاتے اس وقت بھی وہ اتنا ہی بلند، اتنا ہی باوقار، اتنا ہی عہد آفریں ثابت ہوتا۔

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ   سن رکھو تم فسانہ ہیں یہ لوگ

کبھی کبھی دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے (کاش غلط ہو) کہ اب ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے، کم سے کم آسانی سے نہیں!

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد کی مفسرانہ حیثیت

علامہ سید اختر علی تلہری

قرآن کریم کی حیثیت ایک مکمل ضابطہ اخلاق اور ایک جامع دستورِ معاشرت و تمدن کی ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے جتنے بھی شعبے ہیں ان سب کے بارے میں ہدایتیں موجود ہیں فلاح و نجات کے راستوں کی طرف قدم قدم پر اشارے نمایاں ہیں۔ گویا قرآنِ حکیم صحیح معنوں میں موعظت کی جامع و مانع کتاب ہے۔ اپنی اس خصوصیت کو مؤثر بنانے کے لیے اُسے ایک ایسا اسلوب وضع کرنا پڑا ہے جو مستقل طریقے سے دلوں کو گہرائیوں میں اترتا چلا جائے اور ان کی بصیرتوں کو تیز کر دے۔ اگرچہ اس کا لباس عربی ہے اور وحی ایزدی نے انھی محاوروں اور بولوں کا روپ دھارا جنھیں اس دور کے عرب استعمال کرتے تھے لیکن اس کے باوجود اس کا لہجۂ خطاب، اس کا اندازِ گفتار، اس کا طریقِ استدلال واضح طور پر اسی زبان میں ترتیب دی ہوئی دوسری چیزوں سے ممتاز ہے۔ اگر اس میں صحیح رہنمائی نہ کرنے والے خیالات سے مجادلہ ہے تو اس میں خشونت نہیں، درشتی نہیں اور اس طرح وہ مجادلہ "مجادلۂ حسنہ" بن گیا ہے۔ اگر کہیں خطابت کا آہنگ ہے تو اس میں بھی شیرینی اور دلآویزی ہے مگر ان خصوصیات کا حکیمانہ احساس ہر شخص کو فوراً نہیں ہو جاتا۔ غیر مادّی نگاہوں کے سامنے اُس کی موعظت کے یہ گوشے فوراً ہی نہیں آجاتے۔ اس کو بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے اور غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ جو نگاہیں منجھی ہوتی نہیں ہوتیں حقیقتیں واشگاف طریقے سے کم ہی ان پر منکشف ہوتی ہیں۔

قرآن فہمی کو آسان بنانے کے لیے ابتدا ہی سے اس کی تفسیریں لکھی گئیں۔ نحوی و صرفی پیچیدگیوں اور معنی و بیان کی گتھیوں کو کھولنے کی سعی کی گئی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ان کوششوں میں شارحین و مفسّرین کے قدم کبھی کبھی اِدھر اُدھر بھی پڑتے گئے اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایسے مقامات پر ان کی تشریحات سے پیچیدگیاں گھٹی نہیں بلکہ کچھ اور بڑھ گئیں۔ لیکن خصوصیت سے وہ تفسیریں جو متاخرین نے لکھی ہیں ان میں کج اندیشیوں اور کج خیالیوں کی افراط ہے۔ اس دور میں یونانی فلسفیوں کی کتابوں کے ترجمے ہو گئے تھے۔ عربوں نے ان کے خیالات سے واقفیت بہم پہنچا لی تھی۔ اور وہ ان کے استدلالی گورکھ دھندوں سے اچھی طرح مرعوب ہو چکے تھے۔ چنانچہ قرآن کی فطری تعلیمات کو وہ انھیں سانچوں میں ڈھالنے لگے اور اس دور میں بعض قرآنی الفاظ مثلاً حجت، برہان، تثلیت وغیرہ نے جو اصطلاحی قالب اختیار کر لیا تھا ان کی تشریح اسی رنگ میں کی جانے لگی حالانکہ یہ مفہوم قرآن کے نزول کے وقت ان الفاظ کا کہیں سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس سلسلے میں بالکل صحیح فرمایا ہے۔

"یہ آفت صرف طریقِ استدلال ہی میں پیش نہیں آئی بلکہ تمام گوشوں میں پھیلی۔ منطق و فلسفہ کے مباحث نے طرح طرح کی نئی مصطلحات پیدا کر دی تھیں۔ عربی لغت کے الفاظ ان مصطلحہ معانی میں مستعمل ہونے لگے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا موضوع فلسفۂ یونانی نہیں ہے اور نہ نزولِ قرآن کے وقت عربی زبان ان مصطلحات سے آشنا ہوئی تھی، پس جہاں کہیں قرآن میں یہ الفاظ آتے ہیں ان کے معانی وہ نہیں ہو سکتے جو وضعِ مصطلحات کے بعد قرار پائے۔ لیکن اب ان کے وہی مفہوم لیے جانے لگے اور اس کی بنا پر طرح طرح کی دور از کار بحثیں پیدا کر دی گئیں۔ . . . . .

"اسی تخم کے یہ بھی برگ و بار ہیں کہ سمجھا گیا کہ قرآن کو وقت کی تحقیقاتِ علمیہ کا ساتھ دینا چاہیے۔ چنانچہ کوشش کی گئی کہ نظام بطلیموسی اس پر چپکا دیا جائے ٹھیک اسی طرح جس طرح آج کل کے دانش فروشوں کا طریقِ تفسیر یہ ہے کہ موجودہ علم ہیئت کے مسائل قرآن پر چپکائے جائیں۔"

مولانا آزاد کے سامنے تفاسیرِ قرآن کا یہ سب ذخیرہ تھا۔ انھوں نے اس سرمایہ کا پوری بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا تھا۔ ان میں گوناگوں موثرات کے تحت جو نقائص مختلف گوشوں سے دخل پا گئے تھے وہ سب ان کی نگہ میں تھے بمقتضیاتِ عصر پہ ان کی نظر تھی ان کا عربی کا ذوق خاصا عرب العربائی تھا۔ ان کی فطرت سلیم تھی۔ اس پر تصنع کی تہیں نہیں چڑھی تھیں۔ ان کا دماغ صحت مند اور بیدار تھا، عقل رسا تھی، دانش و خرد کے باریک نکتوں سے ان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا حافظہ مالا مال تھا۔ قرآن کریم کے بکثرت و مرات مطالعے نے ان میں اس کی طرف بہت زیادہ شغف پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ انہماک و شوق کے ساتھ انھوں نے قرآن مجید کے اٹھارہ پاروں کا ترجمہ اپنے مخصوص دل کش رنگ میں تحریر فرما دیا۔ اور اُس پر ضرورت کے مطابق کہیں مختصر اور کہیں بسوط تفسیری حاشیے لکھے۔ مولانا کی حکیمانہ قلمی کاوشوں سے جو کچھ سرانجام پا گیا وہ سر پر رکھنے کے قابل ہے۔ اس سے تفکر کے قدم آگے بڑھے ہیں فکر و نظر کے لیے نئے نئے راستے کھلے ہیں۔ مذہبی بصیرت میں اضافہ ہوا ہے اوہام پرستی اور اسرائیلیات نے مذہب کے دائرے میں جن بے سر و پا افسانوں کو گھسیٹ لیا تھا اور قصہ گوئی کے ذوق نے بہت سے قدیم تاریخ کے واقعات کو جو داستانی رنگ دے دیا تھا اس سے اسلام کا دامن صاف کر دیا۔ شافی بیانات اور مستحکم دلائل سے یونانی فلسفہ سے مرعوب مفسرین کی تاویلات کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ مولانا آزاد کی یہ وہ مفسرانہ خصوصیت ہے جس میں مشکل ہی سے ان کا کوئی شریک و سہیم نکل سکتا ہے۔ متاخرین میں [illegible] ساعی کا ارتقا تفسیر کبیر کی شکل میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ امام رازی کی دقیقہ سنجیوں اور ان کی نکتہ آفرینیوں کا اعتراف ناگریز ہے لیکن اس کا بیشتر حصہ ایک یونانی فیلسوف کی فکر و نظر کی کاوشوں کا مرعوب کن مظاہرہ معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً امام المشککین کی تشکیک گستری نظر انداز نہیں کی جا سکتی مگر گتھیوں کا ڈالنا اور گتھیوں کا کھولنا دونوں کی ایک حیثیت نہیں ہو سکتی۔ امام رازی بسا اوقات فکری پیچیدگیاں پیدا کر دیتے ہیں مگر ان کے قرار واقعی ازالہ کی طرف سے بے نیازانہ گزر جاتے ہیں۔ اور اسی لیے ان کے متعلق یہ فقرہ علماء میں متداول ہے کہ وہ اعتراض نقد کرتے ہیں اور جواب ادھار دیتے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد کی تفسیری کاوشوں کا رنگ ہی دوسرا ہے۔ وہ خواہ مخواہ کے لیے مسائل پیدا نہیں کرتے اور نہ غیر اہم اور دور از کار باتوں سے اپنی کتب کا حجم بڑھاتے ہیں۔ وہ قرآن فہمی کے متعلق ضروری اور کار آمد مسائل و مباحث ہی چھیڑتے ہیں۔ لیکن چھیڑتے ہیں تو پھر ان کو اس حد تک پھیلاتے ہیں جس سے حل کی منزل مل جائے کوئی پس و پیش نہیں کرتے۔ اس مقصد میں مولانا کے مطالعے کی حیرت انگیز وسعت اُن کے ذہن کی صفائی، اُن کے حافظے کی قوت، بیانِ مفاہیم و اظہارِ مطالب پر غیر معمولی قدرت نے انھیں خاص طور سے کامیاب کیا ہے۔

قرآن کریم نے کثیر مقامات پر تفکر و تعقل و تدبر پر زور دیا ہے اور اس کی اہمیت اس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح واضح کی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تفکر و تعقل اسلام کی خاص چیز ہے اور جو افراد اس سے تہی دامن ہیں، وہ اسلام کی حقیقی روح سے بیگانہ ہیں۔

مولانا نے اسلام کی اس خصوصیت کو اچھی طرح اپنایا ہے اور تفسیر کے نازک و اہم مقامات کو اس کے سہارے سے اس طرح طے کیا ہے کہ اسے پڑھ کر ایمان کی جلا ہوتی ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآنی مفاہیم میں مولانا کے تفکر و تعقل پر یونانی افکار و نظریات کی چھاپ نہیں ہے اور نہ ان کا اندازِ نظر مدرسانہ اور معلّمانہ نوعیت کا ہے۔ وہ قرآنی مطالب کی منزل تک پہنچنے کے لیے جدید ہیئت اور جدید فلسفہ کے مزعومات کا سہارا بھی نہیں ڈھونڈھتے وہ قرآن کو قرآن سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن کو ہدایتوں کا سرچشمہ سمجھ کر اس میں ڈوبتے ہیں۔ اس سے معانی و حقائق کے گہر ہائے بیش بہا نکالتے ہیں۔ عربی محاوروں اور احادیث و اقوالِ سلف سے غضِ بصر نہیں کرتے۔ شاید کہا جائے کہ ان کی تفسیر کے بیشتر مقامات "تفسیر بالرائے" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ مولانا نے سلف کے عقائد و خیالات ملحوظ رکھے ہیں اور انھیں کی روشنی میں تفکر و تعقل کے راستے پر چلے ہیں۔

خود مولانا کا ارشاد ہے:

"زمانے کی بد ذوقی نے بھی ہر کج اندیشی کو سہارا دیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرونِ اخیرہ میں درس و تداول کے لیے وہی تفسیریں مقبول ہوئیں جو قدما کے محاسن سے یک قلم خالی تھیں۔ وقت کا بہترِ انتخاب ہر علم و فن میں جاری رہا ہے۔ جو زمانہ جُرجانی پر سکاکی کو اور سکاکی پر تفتازانی کو ترجیح دیتا تھا یقیناً اُس کے دربار سے بیضاوی و جلالین ہی کو حسنِ قبول کی سند مل سکتی تھی۔ متداول تفسیریں اٹھا کر دیکھو! جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے۔ وہاں اکثر اسی قول کو ترجیح دیں گے۔ جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہو گا۔ جو اقوال نقل کریں گے ان میں بہتر قول موجود ہو گا۔ لیکن اُسے نظر انداز کر دیں گے۔"

ظاہر ہے ایسے خیالات رکھنے والا اپنے تفکر و تعقل کو "تفسیر بالرائے" کی آلودگیوں میں ملوث کرنے پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ بہتر ہو گا کہ خود مولانا کے خیالات "تفسیر بالرائے" کے متعلق غور سے سن لیے جائیں۔ انھوں نے جلد اوّل ترجمان القرآن میں اصولِ ترجمہ و تفسیر لکھتے ہوتے صفحہ ۱۵ و ۱۶ پر ارشاد فرمایا ہے:

"اشکال و موانع کا بڑا دروازہ "تفسیر بالرائے" سے کھل گیا جس کے اندیشے سے صحابہ و

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں "تفسیر بالرائے" کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں "تفسیر بالرائے" کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جاتے حالانکہ خود قرآن کا یہ حال ہے کہ اوّل سے لے کر آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ "اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا"

"دراصل "تفسیر بالرائے"، میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصطلحہ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس کے لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے۔ بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔"

"مثلاً جب باب عقائد میں ردّ و کد شروع ہوئی تو مختلف مذاہب کلامیہ پیدا ہو گئے۔ ہر مذہب کے مناظر نے یہ چاہا کہ اپنے مذہب پر نصوص قرآنیہ کو ڈھالے۔ وہ اس جستجو میں نہ تھے کہ قرآن کیا کہتا ہے بلکہ ساری کاوش اس کی تھی کہ کس طرح اسے اپنے مذہب کا مؤید دکھائیں اس طرح کی تفسیر "تفسیر بالرائے"، تھی۔ یا مثلاً مذاہب فقہیہ کے مقلدوں میں جب تحزب و تشیع کے جذبات تیز ہوتے تو اپنے اپنے مسائل کی اپج میں آیاتِ قرآنیہ کو کھینچنے تاننے لگے۔ اس کی فکر نہ تھی کہ لغت عربی کے صاف صاف معانی، اسلوب بیان کا قدرتی مقتضا، عقل و بصیرت کا واضح فیصلہ کیا کہتا ہے۔ تمام تر کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح قرآن کو اپنے امام کے مذہب کے مطابق کر دکھائیں۔ یہ طریق تفسیر "تفسیر بالرائے" ہے۔ یا مثلاً صوفیہ کا ایک گروہ اسرار و بطون کی جستجو میں دور تک نکل گیا اور پھر اپنے موضوعہ عقائد و مباحث پر قرآن کو ڈھالنے لگا۔ قرآن کا کوئی حکم، کوئی عقیدہ کوئی بیان تحریف معنوی سے نہ بچا یہ تفسیر "تفسیر بالرائے" تھی۔ یا مثلاً قرآن کے طریق استدلال کو منطقی جامہ پہنانا یا جہاں کہیں آسمان اور کواکب و نجوم کے الفاظ آ گئے ہیں یونانی علم ہیئت کے مسائل چپکانے لگنا یقیناً تفسیر بالرائے ہے۔"

"یا مثلاً آج کل ہندوستان و مصر کے بعض مدعیان اجتہاد و نظر نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ زمانۂ حال کے اصولِ علم و ترقی قرآن سے ثابت کیے جائیں یا جدید تحقیقاتِ علمیہ کا اس سے استنباط کیا جاتے۔ گویا قرآن صرف اس لیے نازل ہوا ہے کہ جو بات کوپرنیکس اور نیوٹن نے یا ڈارون اور ویلس وغیرہ نے بغیر کسی الہامی کتاب کی فلسفہ اندیشیوں کے دریافت کر لی ہے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چند صدی پہلے معمّوں کی طرح دنیا کے کان میں پھونک دے اور پھر وہ بھی صدیوں تک دنیا کی سمجھ میں نہ آئیں یہاں تک کہ موجودہ زمانہ کے مفسّر پیدا ہوں اور تیرہ سو برس پیشتر کے معمے حل فرمائیں۔ یقیناً یہ طریقِ تفسیر بھی ٹھیک ٹھیک تفسیر بالرائے ہے۔"

"تفسیر بالرائے" کے بارے میں جس مذہبی مفکر کا اتنا "متشددانہ نقطۂ نظر" ہو وہ اس خصوص میں شرعی حدود سے تجاوز کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض مقامات پر مولانا کی رائے سے اتفاق نہ کیا جا سکے اور مولانا کی بیان کردہ "تفسیر بالرائے" میں کچھ شوشے گھٹائے اور بڑھائے جا سکیں۔ لیکن مرکزی خیال کی نوعیت میں کوئی تغیر غالباً پیدا نہ ہو سکے گا۔ مولانا آزاد کی تفسیری کاوشوں پر اگر اس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے گا تو علم و دانش کے بہت سے نکتے حاصل ہوں گے۔

یوں تو قرآن حکیم کی ہر آیت نصائح و حکم اور مواعظ وغیرہ کا گنجینہ ہے لیکن سورۃ الحمد مخصوص خصوصیتوں کا حامل ہے۔ اس میں دینِ حق کے تمام مقاصد کا خلاصہ موجود ہے۔ سورۃ الحمد کی اس خصوصیت کی وجہ سے اس کے بہت سے نام ہیں۔ اُمّ القرآن۔ اساس القرآن وغیرہ اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ عربی میں اُمّ کا اطلاق ان تمام چیزوں پر ہوتا ہے جن میں کسی نہ کسی قسم کی جامعیت پائی جاتی ہو یا بہت سی چیزوں میں اسے نمایاں حیثیت حاصل ہو یا پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں چنانچہ سر کے درمیانی حصے کو "اُمّ الراس" کہتے ہیں کیونکہ وہ دماغ کا مرکز ہے۔ فوج کے جھنڈے کو "اُمّ" کہتے ہیں کیونکہ تمام فوج اس کے نیچے جمع ہوتی ہے۔ مکّہ کو "اُمّ القریٰ" کہتے تھے کیونکہ خانہ کعبہ اور حج کی وجہ سے عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی اس لیے اس سورت کو اُمّ القرآن کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایک ایسی سورت ہے جس میں مطالبِ قرآنی کی جامعیت اور مرکزیت ہے یا جو قرآن کی عام سورتوں میں اپنی نمایاں اور مقدّم جگہ رکھتی ہے۔ اساس القرآن کے معنی ہیں قرآن کی بنیاد۔ اس سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سورت میں دینِ حق کا ماحصل موجود ہے صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہے۔ "سورۃ الحمد" مجمل ہے اور باقی قرآن اس کے مطالب کی تفصیل۔ اس سورت کی تفسیر میں تمام مفسّرین نے پورا زورِ طبع اور زورِ قلم صرف کیا ہے امام رازی نے تفسیر کبیر میں اس کے مطالب کو بہت سے صرفی و نحوی اور فکری و علمی گوشوں پر بہت دور تک پھیلا دیا ہے۔ تفسیر کبیر مطبوعۂ مصر کے تقریباً ساڑھے ستّر صفحات اس سورت کی تفصیل و تشریح کے لیے وقف کیے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گئے ہیں۔ مولانا آزاد نے بھی اس کی تفسیر میں کافی اطناب سے کام لیا ہے اور تقریباً دو سو صفحات اس سلسلے میں لکھے ہیں۔ انھوں نے صرفی و نحوی مسئلوں اور نکتوں کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کی مفہوماتی دنیا ہی کی سیر سے واسطہ رکھا ہے اور ہدایت و ارشاد و موعظت سے وابستہ مسائل ہی پر غور کیا ہے۔

حمد اور اللہ سے علمی بحث کرنے کے بعد "ربوبیت" کی صفت کی تشریح کی ہے اس کی جامعیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اُس کے درجات اور انواع کی وضاحت کی ہے۔ (اس ضمن میں خوب خوب داد سخن سنجی دی ہے) "رب العالمین" کی معنوی وسعتوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد "الرحمٰن الرحیم" کی توضیح کی ہے اور رحمت کا مفہوم واضح کیا ہے اور رحمت و رافت و مغفرت و عفو وغیرہ کی کثرتِ تکرار سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "قرآن اول سے لے کر آخر تک اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمتِ الٰہی کا پیام ہے۔"

خدا کی صفت رحمٰن اور رحیم کا ذکر کرنے کے بعد اس کا ذکر آ ہی جاتا کہ مخلوق کو خالق کی صفات سے "تشبہ" پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہیے خدا رحمٰن اور رحیم ہے تو بندے میں بھی رحم اور فضل کی صفات کا موجود ہونا اس کی انسانیت کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ اب یہاں پر اسلامی تعلیم یا مسیحی تعلیم کی افضلیت کا مبحث چھڑ جانا ناگزیر تھا۔ مولانا نے اس مسئلے کی توضیح خاصی نکتہ رسی کے ساتھ کی ہے۔ اب اسے مولانا ہی کی زبان سے سُنیے:

"ہم نے قرآن کی آیاتِ عفو و بخشش نقل کرتے ہوئے ابھی کہا ہے کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ دشمنوں کو پیار کرو کیونکہ ایسا کہنا حقیقت نہ ہوتی مجاز ہوتا۔ ضروری ہے کہ اس کی مختصر تشریح کی جائے:

"حضرت مسیح (علیہ السلام) نے یہودیوں کی ظاہر پرستیوں اور اخلاقی محرومیوں کی جگہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی اخلاقی قربانیوں پر زور دیا تھا اور ان کی دعوت کی اصلی روح یہی ہے۔ چنانچہ ہم انجیل کے مواعظ میں جابجا اس طرح کے خطابات پاتے ہیں "تم نے سُنا ہوگا کہ اگلوں سے کہا گیا دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ لیکن میں کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا" یا "اپنے ہمسایوں ہی کو نہیں بلکہ دشمنوں کو بھی پیار کرو" یا مثلاً "اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو چاہیے کہ دوسرا گال بھی آگے کر دو" سوال یہ ہے کہ ان خطابات کی نوعیت کیا تھی۔ یہ اخلاقی فضائل و ایثار کا ایک موثر پیرایۂ بیان تھا یا تشریع، یعنی قوانین وضع کرنا تھا۔ افسوس ہے کہ انجیل کے معتقدوں اور نکتہ چینیوں دونوں نے یہاں ٹھوکر کھائی دونوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ تشریع تھی اور اس لیے دونوں کو یہ تسلیم کر لینا پڑا کہ یہ ناقابلِ عمل احکام ہیں"۔

"معتقدوں نے خیال کیا کہ اگرچہ ان احکام پر عمل نہیں کیا جا سکتا تاہم مسیحیت کے احکام یہی ہیں اور عملی نقطۂ خیال سے اس قدر کافی ہیں کہ اوائل عہد میں چند ولیوں اور شہیدوں نے ان پر عمل کر لیا تھا نکتہ چینوں نے کہا کہ یہ سرتاسر ناقابلِ عمل تعلیم ہے اور کہنے میں کتنی ہی خوشنما ہو لیکن عملی نقطۂ خیال سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ یہ فطرتِ انسانی کے صریح خلاف ہے۔ فی الحقیقت نوعِ انسانی کی یہ بڑی ہی درد انگیز ناانصافی ہے جو تاریخ انسانی کے اس عظیم الشان معلم کے ساتھ جائز رکھی گئی۔ جس طرح بے درد نکتہ چینوں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہ کی اسی طرح نادان معتقدوں نے بھی فہم و بصیرت سے انکار کر دیا۔ لیکن کیا کوئی انسان جو قرآن کی سچائی کا معترف ہو ایسا خیال کر سکتا ہے کہ حضرت مسیح کی تعلیم فطرتِ انسانی کے خلاف تھی اور اس لیے ناقابلِ عمل تھی۔

"حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی تصدیق کے ساتھ ایسا منکرانہ خیال جمع نہیں ہو سکتا۔۔۔"

"اصل یہ ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی ان تمام تعلیمات کی وہ نوعیت نہ تھی جو غلطی سے سمجھ لی گئی۔ اور دنیا میں ہمیشہ انسان کی سب سے بڑی گمراہی اس کے انکار سے نہیں بلکہ کج اندیشانہ اعتراف ہی سے پیدا ہوتی ہے حضرت مسیح کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا تھا جبکہ یہودیوں کا اخلاقی تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا اور دل کی نیکی اور اخلاق کی پاکیزگی کی جگہ محض ظاہری احکام و رسوم کی پرستش دینداری و خدا پرستی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے علاوہ جس قدر متمدن قومیں قرب و جوار میں موجود تھیں۔ مثلاً رومی، مصری، آشوری؛ وہ بھی انسانی رحم و محبت کی روح سے یکسر ناآشنا تھیں۔ لوگوں نے یہ بات تو معلوم کر لی تھی کہ مجرموں کو سزائیں دینی چاہییں لیکن اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی چارہ سازیوں سے جرموں اور گناہوں کی پیدائش روک دینی چاہیے۔ انسانی قتل و ہلاکت کا تماشا دیکھنا طرح طرح کے ہولناک طریقوں سے مجرموں کو ہلاک کرنا زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا، آباد شہروں کو بلا وجہ جلا کر خاکستر کر دینا، اپنی قوم کے علاوہ تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا رحم و محبت اور حلم و شفقت کی جگہ قلبی قساوت و بے رحمی پہ فخر کرنا رومی تمدن کا اخلاق اور مصری اور آشوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا"۔

"ضرورت تھی کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے ایک ایسی ہستی مبعوث ہو جو سرتاسر رحمت و محبت کا پیام ہو، اور جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے قطع نظر کر کے صرف اس کی قلبی و معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی تمام پیغمبرانہ ہمت مبذول کر دے۔ چنانچہ حضرت مسیح کی شخصیت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں وہ ہستی نمودار ہو گئی۔ اس نے جسم کی جگہ روح پر، زبان کی جگہ دل پر اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوعِ انسانی کو توجہ دلائی اور انسانیتِ اعلیٰ کا فراموش شدہ سبق تازہ کر دیا۔"

"معمولی سے معمولی کلام بھی، بشرطیکہ بلیغ ہو، اپنی بلاغت کے مجازات رکھتا ہے۔ قدرتی طور پر اس الہامی بلاغت کے بھی مجازات تھے جو اس کی تاثیر کا زیور اور اس کی دل نشینی کی خوبروئی ہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ دنیا جو اقانیم ثلاثہ اور کفارہ جیسے دور از کار عقائد پیدا کر لینے والی تھی ان کے مواعظ کا مقصد و محل نہ سمجھ سکی اور مجازات کو حقیقت سمجھ کر غلط فہمیوں کا شکار ہو گئی۔"

"انھوں نے جہاں کہیں یہ کہا ہے کہ "دشمنوں کو پیار کرو"، تو یقیناً اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ہر انسان کو چاہیے کہ اپنے دشمنوں کا عاشق زار ہو جائے بلکہ سیدھا سادہ مطلب یہ تھا کہ تم میں غیظ و غضب اور نفرت و انتقام کی جگہ رحم و محبت کا پر جوش جذبہ ہونا چاہیے اور ایسا ہونا چاہیے کہ دوست تو دوست دشمن تک کے ساتھ عفو و درگزر سے پیش آؤ۔ اس مطلب کے لیے کہ رحم کرو، بخش دو، انتقام کے پیچھے نہ پڑو، یہ ایک نہایت ہی بلیغ اور مؤثر پیرایۂ بیان ہے کہ "دشمنوں تک کو پیار کرو"۔ ایک ایسے گردوپیش میں جہاں اپنوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی رحم و محبت کا برتاؤ نہ کیا جاتا ہو یہ کہنا کہ اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہ کرو، رحم و محبت کی ضرورت کا ایک اعلیٰ اور کامل ترین تخیل پیدا کرنا تھا۔

شنیدم کہ مردانِ راہ خدا ۔۔۔ دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام ۔۔۔ کہ بادوستانت خلاف ست و جنگ

یا مثلاً اگر انھوں نے کہا: "اگر تمھارے ایک گال پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دو" تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ سچ مچ تم اپنا گال آگے کر دیا کرو بلکہ صریح مطلب یہ تھا کہ انتقام کی جگہ عفو و درگزر کی راہ اختیار کرو۔ بلاغتِ کلام کے یہ وہ مجازات ہیں جو ہر زبان میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں اور یہ ہمیشہ بڑی ہی جہالت کی بات سمجھی جاتی ہے کہ ان کے مقصود و مفہوم کی جگہ ان کے منطوق پر زور دیا جائے۔ اگر ہم اس طرح کے مجازات کو اُن کے ظواہر پر محمول کرنے لگیں گے تو نہ صرف تمام الہامی تعلیمات ہی درہم برہم ہو جائیں گی بلکہ انسان کا وہ تمام کلام جو ادب و بلاغت کے ساتھ دنیا کی تمام زبانوں میں کہا گیا ہے یک قلم مختل ہو جائے گا۔"

"باقی رہی یہ بات کہ حضرت مسیح نے سزا کی جگہ محض رحم و درگزر ہی پر زور دیا تو ان کے مواعظ کی اصلی نوعیت سمجھ لینے کے بعد بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ شرائع نے تعزیرد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عقوبت کا حکم دیا تھا، لیکن اس لیے نہیں کہ تعزیر و عقوبت فی نفسہ کوئی مستحسن عمل ہے بلکہ اس لیے کہ معیشتِ انسانی کی بعض ناگزیر حالتوں کے لیے یہ ایک ناگزیر علاج ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک کم درجہ کی بُرائی تھی جو اس لیے گوارا کر لی گئی کہ بڑے درجے کی برائیاں روکی جا سکیں۔ لیکن دنیا نے اسے علاج کی جگہ ایک دل پسند مشغلہ بنا لیا اور رفتہ رفتہ انسان کی تعذیب و ہلاکت کا ایک خوفناک آلہ بن گئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی قتل و غارت گری کی کوئی ہولناکی ایسی نہیں ہے جو شریعت اور قانون کے نام سے نہ کی گئی ہو۔ اور جو فی الحقیقت اسی بدلہ لینے اور سزا دینے کے حکم کا ظالمانہ استعمال نہ ہو۔ اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ انسانی ہلاکت کی سب سے بڑی تو تیں میدان ہائے جنگ سے باہر کون کون سی رہی ہیں؟ تو یقیناً اس کی انگلیاں ان عدالت گاہوں کی طرف اُٹھ جائیں گی جو مذہب اور قانون کے ناموں سے قائم کی گئیں۔ اور جنھوں نے ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کی تعذیب و ہلاکت کا عمل اس کی ساری وحشت انگیزیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ جاری رکھا۔ پس اگر حضرت مسیح نے تعزیر و عقوبت کی جگہ سرتاسر رحم و درگزر پر زور دیا تو یہ اس لیے نہیں کہ وہ نفسِ تعزیر و سزا کے خلاف کوئی تشریع کرنی چاہتے تھے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس ہولناک غلطی سے انسان کو نجات دلائیں جس میں تعزیر و عقوبت کے غلو نے مبتلا کر رکھا ہے وہ دنیا کو بتانا چاہتے تھے کہ اعمالِ انسانی میں اصل رحم و محبت ہے تعزیر و انتقام نہیں ہے۔ اور اگر تعزیر و سیاست جائز رکھی گئی ہے تو صرف اس لیے کہ بطور ایک ناگزیر علاج کے عمل میں لائی جاتے۔ اس لیے نہیں کہ تمہارے دل رحم و محبت کی جگہ سرتاسر نفرت و انتقام کا آشیانہ بن جائیں۔" گیارھویں پارے "یعتذرون" سورۂ یونس میں ایک آیت ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ؁ (۱۰:۱۰۸)

(ترجمہ:۔ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دو کہ اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے سچائی تمہارے پاس آگئی ہے۔ پس جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا تو اس کی گمراہی اسی کے آگے آئے گی۔ میں تم پر نگہبان نہیں ہوں (کہ زبردستی کسی راہ میں کھینچ لے جاؤں اور پھر اس سے نکلنے نہ دوں۔)

اس مقام پر تفسیری حاشیہ دیتے ہوئے قرآن مجید کی ایک اہم تعلیم کی دلنشین پیرائے میں توضیح کی گئی ہے۔ آیت کا مفہوم صاف ہے لیکن ہماری ذہنیتوں کا جو انداز ہو گیا تھا اس کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقتضا یہی تھا کہ ایسے اہم مقام سے بھی ہم سرسری طور سے گزر جائیں۔ لیکن مولانا کی نگاہِ حقیقت شناس ایسے مقام پر جم جاتی ہے اور وہ اسے مختلف اسالیب سے سمجھاتے ہیں۔ قرآن درحقیقت موعظت وارشاد کی ایک فصیح و بلیغ کتاب ہے اور جس اخلاقی روش کی طرف مولانا اس مقام پر اشارے کر رہے ہیں وہ موعظت کی جان ہے۔ اس سے پوری انسانی زندگی بنتی اور بگڑتی ہے۔ مولانا اس ضمن میں رقم طراز ہیں ۔

"ساتھ ہی واضح کر دیا کہ داعی حق کی حیثیت کیا ہے۔ "وما انا علیکم بوکیل" میں داعی اور مذکر ہوں کچھ تم پر وکیل نہیں بنا دیا گیا ہوں یعنی میرا کام یہ ہے کہ نصیحت کی باتیں سمجھا دوں۔ یہ نہیں کہ نگہبان بن کر تم پر مسلط ہو جاؤں اور سمجھوں " مجھے تمہاری ہدایت کی ٹھیکے داری مل گئی ہے۔ دوسری جگہ پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے یہی مطلب یوں ادا کیا ہے کہ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ (۵۰ : ۴۵) تو ان لوگوں پر ایک حاکم جابر کی طرح مسلط نہیں ہے کہ جبرًا و قہرًا بات منوا دے نیز فرمایا۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ، تجھے ان لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بٹھا دیا ہے کہ مانیں یا نہ مانیں لیکن تو انھیں راہِ حق پر چلا لینے کا ذمہ دار ہو"

"نیز جا بجا مختلف پیرایوں میں یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ پیغمبر کا مقام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سچائی کی پکار بلند کرنے والا ہے، پیام حق پہنچا دینے والا ہے، نصیحت کی بات سمجھا دینے والا ہے، ایمان و عمل کے نتائج کی خوشخبری دیتا اور انکار و بدعملی کے نتائج سے خبردار کر دیتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے سر کوئی ذمہ داری نہیں "

"غور کرو اس سے زیادہ صاف، بے لاگ اور امن و سلامتی کی کوئی راہ ہو سکتی ہے۔ اگر دنیا نے دعوت حق کی یہ روح سمجھ لی ہوتی تو کیا ممکن تھا کہ کوئی انسان دوسرے انسان سے محض اختلافِ اعتقاد و عمل کی بنا پر لڑتا ؟ لیکن مصیبت یہ ہے کہ انسان کے ظلم و سرکشی نے کبھی اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا۔ اور یہی بات ساری نزاعوں کی بنیاد بن گئی۔ قرآن نے پچھلی دعوتوں کی جس قدر سرگزشتیں بیان کی ہیں انھیں جا بجا پڑھو ہر جگہ دیکھو گے کہ بناء نزاع یہی تھی۔ خدا کے رسولوں کا ہمیشہ اعلان یہی ہوا کہ ہم نصیحت کرنے والے ہیں، ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ اگر نہیں مانتے تو تم اپنی راہ چلو اور ہمیں اپنی راہ چلنے دو اور دیکھو نتیجہ کیا نکلتا ہے لیکن ان کے منکر کہتے تھے کہ نہیں "نہ تو ہم تمہاری بات مانیں گے نہ تمہیں تمہاری راہ چلنے دیں گے"، سورۂ اعراف کی آیت (۸۸) میں حضرت شعیب کی سرگزشت گزر چکی ہے۔ جب ان کی قوم کے سرکشوں نے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہا اگر تم اور تمھارے ساتھی ملت میں پھر لوٹ نہ آئے تو ہم ضرور تمھیں اپنی بستی سے جلا وطن کر دیں گے؟" تو انھوں نے جواب میں کہا:- "اَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِيْنَ ؟" اگر تمھارے مذہب پر ہمارا دل مطمئن نہ ہو تو کیا جبراً اسے مان لیں ؟

"اسلام اور اس کے منکروں میں جو نزاع شروع ہوئی وہ بھی تمام تر یہی تھی۔ قرآن کہتا تھا۔ "میری راہ تبلیغ و تذکیر کی ہے" مخالف کہتے تھے۔ "ہماری راہ جبر و تشدد کی ہے۔" قرآن کہتا تھا — "اگر میری بات سمجھ میں آئے تو مان لو، نہ سمجھ میں آئے تو ماننے والوں کو ان کی راہ چلنے دو۔" وہ کہتے تھے — "ہماری بات تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے تمھیں ماننی ہی چاہیے نہیں مانو گے تو جبراً منوائیں گے۔"

"حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے اس آیت میں اور اس کی ہم معنی آیات میں جو بات کہہ دی ہے اگر دنیا اسے سمجھ لیتی تو نوع انسانی کی وہ تمام خونریزیاں جو فکر و عمل کے اختلاف سے پیدا ہوئیں، یک قلم ختم ہو جاتیں اور آج کل بھی جس قدر جھگڑے ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں۔ غور کرو سارے جھگڑوں کی اصل بنا کیا ہے؟ یہی ہے کہ لوگ "تذکیر" اور "توکیل" میں فرق نہیں کرتے اور قرآن کہتا ہے دونوں میں فرق کرو۔ تذکیر کی راہ یہ ہوتی ہے کہ جو بات ٹھیک سمجھتے ہو اس کی دوسروں کو بھی ترغیب دو مگر صرف ترغیب دو اس سے آگے نہ بڑھو۔ یعنی یہ بات نہ بھول جاؤ کہ پسند کرنے نہ کرنے کا حق دوسروں کو ہے۔ تم اس کے لیے ذمہ دار نہیں ہو۔ "توکیل" یہ ہوئی کہ ڈنڈا لے کر اٹھ کھڑے ہو جاؤ اور جو کوئی تم سے متفق نہ ہو اس کے پیچھے پڑ جاؤ۔ گویا خدا نے تمھیں لوگوں کی ہدایت و [illegible]ہی کا ٹھیکے دار بنا دیا ہے۔

جب قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ خدا کے رسولوں کا منصب بھی تذکیر و تبلیغ کے اندر محدود تھا حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے مامور تھے تو پھر ظاہر ہے کسی دوسرے انسان کے لیے کب گوارا کر سکتا ہے کہ "وکیل"، "مصیطر" اور "جبار" بن جائے! دراصل اعمال انسانی کے تمام گوشوں میں اصلی سوال حدود ہی کا ہے اور ہر جگہ انسان نے اسی میں ٹھوکر کھائی ہے۔ یعنی ہر بات کی جو حد ہے اس کے اندر نہیں رہنا چاہتا دو حق ہیں اور دونوں کو اپنی اپنی حدوں کے اندر رہنا چاہیے۔ ایک حق تذکیر و تبلیغ کا ہے ایک پسند و قبولیت کا ہے۔ ہر انسان کو اس کا حق ہے کہ جس بات کو درست سمجھتا ہے اسے دوسروں کو بھی سمجھائے لیکن اس کا حق نہیں ہے کہ دوسروں کے حق سے انکار کر دے یعنی یہ بات بھلا دے کہ جس طرح اسے ایک بات کے ماننے نہ ماننے کا حق ہے ویسا ہی دوسرے کو بھی ماننے نہ ماننے کا حق ہے ایک فرد دوسرے کے لیے ذمہ دار نہیں —

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"ہم نے یہاں جس بات کو "حق" سے تعبیر کیا ہے قرآن اسے ہر انسان کا "فرض" قرار دیتا ہے یعنی وہ کہتا ہے جس بات کو تم سچ سمجھتے ہو تمہارا فرض ہے کہ اسے دوسروں تک بھی پہنچاؤ۔ اگر اس میں کوتاہی کرو گے تو خدا کے آگے جواب دہ ہو گے لیکن ساتھ ہی یاد رکھو کہ فرض تذکیر و تبلیغ کا ہے توکیل و اجبار کا نہیں ہے اور جواب دہی اس میں ہے کہ تم نے تبلیغ کی یا نہیں کی، اس میں نہیں ہے کہ دوسروں نے مانا یا نہیں مانا۔ سورۃ اعراف کی آیت ۱۶۴ میں پڑھ چکے ہو کہ جو لوگ اصحاب سبت کو نصیحت کرتے تھے انھوں نے کہا تھا "مَعْذِرَةً اِلٰی رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ"۔ ہم جانتے ہیں کہ ان لوگوں کی سرکشی حد سے گزر چکی ہے۔ لیکن یہ جاننے پر بھی نصیحت کیے جاتے ہیں تاکہ خدا کے سامنے کہہ سکیں، ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا اور اس خیال سے بھی کہ کون جانتا ہے؟ شاید باز آجائیں۔ غور کرو قرآن نے کس درجہ صحت و عدالت کے ساتھ معاملے کے دونوں پہلوؤں کی حفاظت کی ہے اور پھر ان کی حدبندیوں کا خط کھینچ دیا ہے۔ اس نے ایک طرف تذکیر و دعوت پر زور دیا تاکہ حق کی طلب و قیام کی روح افسردہ نہ ہو دوسری طرف انسان کی شخصی آزادی بھی محفوظ کر دی کہ جبر و تشدد سے جامد اخلت نہ کر سکے حدبندی کا یہی خط ہے جو یہاں صحت و اعتدال کی حالت قائم رکھتا ہے۔ اسے اپنی جگہ سے ادھر ادھر کر دو۔ دونوں میں سے کوئی بات ضرور غلط ہو جائے گی اگر دعوت و تذکیر کا قدم آگے بڑھے گا، اعتقاد و فکر کی شخصی آزادی باقی نہیں رہے گی۔ اگر شخصی آزادی کے مطالبے میں بڑھ جاؤ گے، حق و عدالت کے طلب و قیام کا نظم مختل ہو جائے گا۔"

"قرآن کی بہت سی باتوں کی طرح اس بات کے سمجھنے میں بھی دنیا نے بہت دیر لگائی اور تاریخ کو بارہ صدیوں تک اس بات کا انتظار کرنا پڑا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محض اختلافِ عقائد کی بنا پر ذبح نہ کرے اور اتنی بات سمجھ لے کہ "تذکیر" اور "توکیل" میں فرق ہے۔"

"اب ڈیڑھ سو برس سے یہ بات دنیا کے عقلی مسلمات میں سے سمجھی جاتی ہے لیکن اسے معلوم نہیں کہ اس کے اعلان کی تاریخ امریکہ اور فرانس کے اعلانِ حقوقِ انسانی سے شروع نہیں ہوئی ہے، اس سے بارہ سو برس پہلے شروع ہو چکی تھی افسوس ہے کہ مسلمانوں نے بھی قرآن کی یہ تعلیم پس پشت ڈال دی۔ اگر انھوں نے یہ بات نہ بھلائی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ مختلف مذہبی فرقہ بندیاں پیدا ہوتیں اور ہر فرقہ دوسرے فرقے سے محض اختلافِ عقائد کی بنا پر دست و گریباں ہو جاتا۔"

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسئلہ تذکیر" اور" توکیل" کے بارے میں مولانا کے خیالات انھیں کی زبان میں بسط و تفصیل سے نقل کر دیے گئے ہیں۔ ان سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کا نقطہ نظر حقیقتہً ان بنیادی مسائل میں کس قدر امن پسندانہ اور صلح جو یانہ ہے۔ عام مفسران پہلوؤں پر زور اس لیے نہیں دیتے کہ بعد والے مسلمان بادشاہوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اور تسخیر ممالک کے لیے جس روش پر چلنے لگے تھے اس سے اسلام کا اصلی مقصد نگاہوں سے بڑی حد تک اوجھل ہو گیا تھا۔ اسلام کے مقصد اور مسلمان بادشاہوں کے اصلی مقصد میں خلط ملط نے مسلمانوں کے ذہن صاف نہیں رہنے دیے تھے اور صحیح مقامات پر زور دینے کی اہمیت اُن سے سلب کر لی تھی۔ مولانا نے انھیں مقامات پر پوری قوتِ بیان کے ساتھ زور دیا اور اسلامی نقطۂ نظر کی قدِ آدم تصویر قرآن کریم کی روشنی میں دنیا کے سامنے پیش کر دی۔ مولانا کی یہی وہ مفسرانہ خصوصیت ہے جس نے ان کی تفسیر میں غیر معمولی انفرادیت پیدا کر دی ہے۔

مولانا نہ صرف ایک بلند پایہ مفکر تھے بلکہ اعلیٰ سطح کے غیر جانب دار محقق بھی تھے اسی لیے اُن کے قلم سے جو رائے نکلتی تھی یا وہ جو تحقیق فرماتے تھے وہ ہر حیثیت سے بیشتر مکمل ہوتی تھی۔ اور آخری چیز ہوتی تھی اور فکر و تحقیق کے تمام راستے کبھی تقلیدی طور سے طے نہیں کرتے تھے۔ اُن کی ہر جنبش قلم سے اُن کی بلند مجتہدانہ حیثیت واضح ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس تفسیر میں ایسے مقامات ہی نہیں ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش نکل سکے۔ مولانا عدیم الفرصت انسان تھے۔ اُن کے مشاغل متنوع تھے۔ زیادہ تر حافظے پر اعتماد کر کے لکھنے کے عادی تھے۔ اس لیے ایسے مقامات بہر حال مل سکتے ہیں جن سے اختلاف کیا جانا جسارت نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمان القرآن

ڈاکٹر ریاض الحسن

قرآن کریم کی اب تک سیکڑوں کیا ہزاروں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں اور ان تفسیروں پر اپنے اپنے عہد کا اثر نمایاں ہے مثلاً اسلام کے ابتدائی زمانے میں جب مسلمانوں کا دماغ "تمدن کے وضعی اور صناعی سانچوں میں نہیں ڈھلا تھا اور فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت پر قانع تھا" قرآن کا سمجھنا، جیسا کہ وہ اترا تھا۔ آسان تھا، اور اس کے "فہم و معرفت میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی"۔ اس کے بعد جو تفسیریں لکھی گئیں ان پر اسرائیلیات کی خرافات کا اثر شروع ہو گیا اور جب صدر اول کے بعد یونان، روم اور ایران کی تمدنی ہوائیں چلنے لگیں اور یونانی علوم کے تراجم نے علوم و فنونِ وضعیہ کا دور شروع کر دیا"، تو قرآن کے فطری اسلوبوں سے ہٹ کر "تفسیروں پر فلسفہ اور منطق کا رنگ چڑھ گیا۔ پھر جب اسلامی ممالک پر یورپی تہذیب کا غلبہ ہوا، تو جدید نظریات کی بنیاد پڑی اور تفسیر پر بھی اس کا اثر پڑا، مثلاً سید احمد خاں کی تفسیر جس میں قرآنی آیات کو جدید سائنس یا نیچر کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر دورِ حاضر کے ایک جید مصری عالم رشید رضا ایڈیٹر المنار کی تفسیر سامنے آتی ہے جس میں قدیم و جدید کی آمیزش ملتی ہے۔ ان تمام تفسیروں کا لب لباب یہ ہے "کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر قرون آخیرہ تک جس قدر مفسر پیدا ہوتے ان کا طریقِ تفسیر ایک روبہ تنزل معیارِ فکر کی مسلسل زنجیر ہے جس کی ہر پچھلی کڑی پہلی سے پست تر اور ہر سابق لاحق سے بلند تر واقع ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں جس قدر اوپر کی طرف بڑھتے جاتے ہیں حقیقت زیادہ واضح، زیادہ بلند اور اپنی قدرتی شکل میں نمایاں ہوتی جاتی ہے جس قدر نیچے اترتے آتے ہیں حالت برعکس ہوتی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں یہاں تفسیر بالرائے کی ایک مثال پیش کرنے کا موقع دیجیے، کئی سال ہوئے ایک صاحب کی تصنیف "قرآن اور علوم جدیدہ" نظر سے گزری۔ اس میں فاضل مصنف نے قرآن کو نظریۂ ارتقا کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو قرآن سے ثابت کرنا مقصود ہے، یعنی اگر پہلے اسرائیلی اور یونانی خرافات کا دور تھا، تو اب سائنسی اور منطقیانہ خرافات کا دور ہے، اس روز افزوں پستی کا کیا علاج ہے؟ کیا انحطاطِ زمانہ کو قسمت کا چکر سمجھ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر قناعت کی جائے یا پھر ایسی کوئی سبیل نکالی جائے کہ قرآن کو اپنے انداز میں سمجھا سکے؟

مولانا ابوالکلام نے اپنی تفسیر میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ قرون وسطیٰ کے فلسفیانہ اور منطقیانہ پردوں کو ہٹا کر قرآن کو اس کی اصلی فطرت میں واضح کیا جائے اور " وضعیت کے استغراق نے منطق کا جو سانچا میں دیا ہے" اس سے ہٹ کر قرآن کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کیا جائے۔ پھر "تفسیر بالرائے" کا جو دروازہ علوم جدیدہ نے کھول دیا ہے اسے بند کیا جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے جب کلکتہ سے الہلال جاری کیا تھا تو اس میں جا بجا وہ قرآنی آیتوں سے استدلال کرتے تھے۔ دنیائے صحافت میں یہ ایک نیا طریقہ تھا اور پھر وہ اتنا مقبول ہوا کہ ان کو قرآن کی تفسیر لکھنے کا خیال پیدا ہوا، ان کے سامنے اس وقت تین چیزیں پیش نظر تھیں، ترجمہ، تفسیر، اور مقدمۂ تفسیر۔ ۱۹۱۶ء کے ابتدائی مہینوں تک ترجمہ پانچ پاروں تک پہنچ چکا تھا اور تفسیر سورۂ آلِ عمران تک پہنچ چکی تھی اور مقدمۂ تفسیر یادداشت کی شکل میں آچکا تھا، کچھ تفسیر کے فارم چھپ چکے تھے اور ترجمے کی کتابت شروع ہو رہی تھی کہ حکومت ہند نے ۱۹۱۶ء میں مولانا کو کلکتہ خارج البلد کیا وہ رانچی (بہار) چلے گئے۔ جولائی ۱۹۱۶ء میں انھیں وہیں نظر بند کر دیا۔ نظر بندی کے بعد تمام کاغذات خفیہ پولیس لے گئی اور ان میں قرآن کا ترجمہ اور تفسیر بھی تھی۔

پھر مولانا دسمبر ۱۹۲۱ء میں تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں گرفتار ہوئے۔ گرفتاری کے بعد حکومت نے محسوس کیا کہ مولانا کی گرفتاری اور سزا کے لیے کافی قانونی جواز موجود نہیں ہے تو اس نے تیسری دفعہ مولانا کے گھر کی تلاشی لی اور جو کچھ رہا سہا کاغذوں اور کتابوں کا ذخیرہ تھا، اسے ضبط کر لیا۔" افسران تفتیش نے جب ان کاغذات پر قبضہ کیا تو یہ علمی مسودات کے مختلف مجموعے تھے اور الگ الگ بٹھوں کی دفتیوں میں ترتیب دیے ہوئے تھے، ان میں مختلف مکمل و غیر مکمل تصنیفات کے علاوہ بڑا ذخیرہ یادداشتوں کا تھا لیکن جب ایک مدت اور کوشش بسیار کے بعد واپس ملے تو محض اوراقِ پریشاں کا ایک ڈھیر تھا اور نصف سے زیادہ اوراق یا تو ضائع ہو چکے تھے یا اطراف سے پھٹے ہوئے اور پارہ پارہ تھے۔" درحقیقت یہ مولانا کے لیے بڑی آزمائش کا وقت تھا مگر حوادث کا یہ تلخ جام مولانا نے صبر کی سل چھاتی پر رکھ کر پی لیا۔ مگر اس کی تلخی آخر زمانے تک مولانا کے مزاج کو برہم کرتی رہی۔ انھوں نے ایک نہایت مشکل مسئلے کے حل کی کوشش کی تھی، یعنی "سیاسی زندگی کی شورشوں اور علمی زندگی کی جمعیتوں اور فراغتوں" کو یکجا کرنے کی، جس کا خمیازہ ان کو تلخی اور رنج کی صورت میں اٹھانا پڑا۔ مگر اس براعظم میں وہ تنہا شخص ہیں جنھوں نے باوجود تلخی اور رنج کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زندگی کے ان دونوں گوشوں کو حسبِ ضرورت کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ یہاں ایک واقعہ بیان کروں گا جو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے۔ اس وقت کلکتہ کے ہفتہ وار انگریزی اخبار "مسلمان" کا مدیر تھا۔ عبدالرحمن صدیقی صاحب اس وقت کلکتہ سے باہر شاید یورپ میں تھے۔ ان کے مکان میں اسی زمانے میں روس کے مشہور عالمِ قرآن موسیٰ جار اللہ ٹھیرے تھے۔ یہ ماسکو کے رہنے والے تھے۔ ادھر بالشویک تحریک کے زمانے لینن سے واقف ہوگئے تھے اور بعد کو ان کے دوست بھی بن گئے تھے مگر جلد ہی بالشویک حکومت کی پالیسی سے اختلاف کی بنا پر ان کو روس چھوڑنا پڑا اور مصر میں آکر مقیم ہوگئے، دوسری جنگِ عظیم سے کئی سال قبل ہندوستان آگئے تھے اور یہاں کی اسلامی تحریکوں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ جنگ کے زمانے میں حکومت ہند نے ان کو روسی ہونے کی بنا پر نظر بند کر دیا تھا حالاں کہ برطانیہ اور روس اس وقت حریف ہونے کی بجائے ایک دوسرے کے حلیف تھے۔

موسیٰ جار اللہ تقریباً ایک ہفتے کلکتہ میں ٹھیرے۔ اُن ایام میں میں ان سے ہر روز جا کر ملتا، ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ "آپ کے خیال میں قرآن کا کوئی فلسفہ بھی ہے اور اگر ہے تو اس کی کیا صورت ہے"؟ کہنے لگے کہ بیشک قرآن کا ایک نظامِ فکر ہے اور جہاں اوامر و نواہی موجود ہیں وہاں زندگی کا ایک مربوط نظام بھی ہے اور اس کی بنیاد ایمان بالغیب پر ہے۔ یہیں سے سب کلّے پھوٹتے ہیں اور اسلام کے مختلف گوشے پیدا ہوتے ہیں جن میں عبادات اور معاملات کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر ایمان بالغیب نہ ہو تو انسان کو آزمایش کے وقت راہِ راست پر لانے والی اور کوئی چیز نہیں۔ پھر اس کی انھوں نے واقعات کی بنا پر ایک لمبی تشریح کی۔ میں نے آخر میں پوچھا کہ آپ کے خیال میں قرآن کے فکری نظام کا سمجھنے والا ہندوستان میں کوئی عالم ہے؟ تو انھوں نے مولانا ابوالکلام کا نام لیا۔

تحریک عدم تعاون کی شورشوں کے بعد جب مولانا رہا ہوئے تو انھوں نے پھر قرآن کی تفسیر اور ترجمے کی طرف توجہ کی۔ خود ان کے بیان کے مطابق :

"کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورت، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں۔ تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ وغیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتی الوسع میں نے تغافل اور جستجو میں تساہل کیا ہو۔"

یہ سطریں ۱۹۳۰ء میں میرٹھ جیل میں لکھی گئیں اور دو ایک سال بعد ترجمان القرآن کی جلد اول ۱۹۳۲ء میں اور جلد دوم ۱۹۳۶ء میں بڑی تقطیع پر شائع ہوئیں۔ ان دو جلدوں میں صرف ۱۸ پاروں کا ترجمہ ہے۔ اس میں سے مولانا نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر بطور دیباچے کے لکھی جو ۲۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اب یہی تفسیر موجودہ تیسرے ایڈیشن میں مزید اضافے اور تشریح کے ساتھ جلد اول کی شکل میں شائع ہوئی ہے۔ نئی ترتیب کے مطابق اب سابقہ دو جلدیں چار جلدوں میں شائع ہوں گی۔

سورۂ فاتحہ کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:

"اس سورت کے مطالب پر نظر ڈالتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں اور قرآن کے بقیہ حصے میں اجمال اور تفصیل کا سا تعلق پیدا ہو گیا ہے یعنی قرآن کی تمام سورتوں میں دین حق کے جو مقاصد بہ تفصیل بیان کیے گئے ہیں سورۂ فاتحہ میں انھی کا بہ شکل اجمال بیان موجود ہے" اس لحاظ سے سورۂ فاتحہ قرآن کا قلب ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ دین حق کا کیا ماحصل ہے۔ اس کو مولانا نے چار باتوں پر مشتمل لکھا ہے۔

اول: خدا کی صفات کا ٹھیک ٹھیک تصور،

دوم: قانون مجازات کا اعتقاد یعنی نیک عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور برے عمل کا برائی،

سوم: معاد کا یقین، یعنی انسانی زندگی اس دنیا تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد بھی زندگی ہے اور جزا کا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

چہارم: فلاح و سعادت کی راہ کیا ہے اور اس کی پہچان کیا ہے۔ یہ چاروں چیزیں سورۂ فاتحہ میں مجملاً موجود ہیں۔

ان مقدمات کو انسانی ذہن میں اتارنے کے لیے قرآن کا انداز بیان بالکل فطری اور اس کا طریق استدلال بالکل انسانی وجدان کے مطابق ہے اسی لیے منطق کے مبہمات کی اس کو ضرورت نہیں۔ "قرآن حکیم اپنی وضع، اپنے اسلوب، اپنے انداز بیان، اپنے طریق خطاب، اپنے طریق استدلال میں...... ہمارے وضعی اور صناعی طریقوں کا پابند نہیں ہے" اس میں نظری مقدمات نہیں ملیں گے اور نہ اس کا بیان ارسطو کے بنائے ہوئے منطقی اصول پر صحیح اترے گا۔ اس کے برعکس وہ انسانی فطرت اور انسانی وجدان سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے، وہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہتا ہے کہ خدا پرستی کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے۔ اگر ایک انسان اس سے انکار کرنے لگتا ہے تو یہ اس کی غفلت ہے اور ضروری ہے کہ اسے غفلت سے چونکا دینے کے لیے دلیلیں پیش کی جائیں لیکن یہ دلیل ایسی ہونی چاہیے جو اس کے نہاں خانۂ دل پر دستک دے اور اس کا فطری وجدان بیدار کر دے۔ اگر اس کا وجدان بیدار ہو گیا تو پھر اثباتِ مدعا کے لیے بحث و تقریر کی ضرورت نہ ہو گی، خود اس کا وجدان ہی اسے مدعا تک پہنچا دے گا، یہی وجہ ہے کہ قرآن خود انسان کی فطرت ہی سے انسان پر حجت لاتا ہے۔"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وجدان پر کیا چیز اثر پذیر ہوتی ہے، جو اس کو صحیح نتیجے کی طرف لے جاتی ہے؟ دراصل یہ کائنات کا نظام ہے جو وجدان پر اثر ڈال کر رب العالمین کی طرف لے جاتا ہے۔ مثلاً یہ کیسے ممکن ہے کہ نظام کائنات خود بخود وجود میں آ جائے اور اس کے اندر کوئی حکمت اور کوئی کارفرما ہستی نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کارسازی موجود ہو مگر کارساز نہ ہو، حکمت موجود ہو مگر حکیم نہ ہو۔ انسان کی فطرت کبھی یہ باور نہیں کر سکتی کہ نقش موجود ہو مگر نقاش لاپتا ہو۔ یہاں انسانی وجدان بول اٹھتا ہے کہ پس پردہ کوئی صاحب ادراک ہستی ضرور موجود ہے۔ اس طرح "انسانی فطرت اپنی بناوٹ میں ایک ایسا سانچا لے کر آتی ہے جس میں یقین و ایمان ہی ڈھل سکتا ہے، شک و انکار کی اس میں سمائی نہیں۔"

یہاں میں اٹھارھویں صدی کے مشہور فرانسیسی مفکر روسو کا ذکر کروں گا جس کا خدا کی ہستی کی بابت طریق استدلال قرآن سے ملتا جلتا ہے۔ اٹھارھویں صدی کا زمانہ یورپ میں لادینی کا زمانہ ہے۔ اس کو تاریخ میں "روشنی کے عہد" سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر روسو، جس نے عہد جدید کی سیاست اور طرز حکومت پر گہرا اثر ڈالا ہے، وہ خدا کی ہستی کا قائل تھا۔ مشہور انگریز فلسفی برٹ رینڈرسل نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ فلسفۂ مغرب" کے صفحہ ۷۰۸ پر روسو کا ایک خط نقل کیا ہے جو اس نے ایک خاتون کو لکھا تھا۔ روسو لکھتا ہے:

"میں اپنے کتب خانے کی تنہائی میں جب اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں آنکھوں پر رکھ کر ان کو بند کر لیتا ہوں، یا جب رات کی تاریکی محسوس کرتا ہوں تو اس وقت برابر یہ خیال ہوتا ہے کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے لیکن جب میں سورج کو علی الصباح نکلتے دیکھتا ہوں اور اس وقت وہ زمین پر چھائے ہوئے تمام کہر کو اڑا دیتا ہے اور قدرت کے تمام مناظر پر سے پردہ اٹھا کر ان کو چمکا تا ہے تو اس وقت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میرے دل کی تمام تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں اور میرا ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور میں خدا کی ہستی کا یقین کرتا ہوں اور اس کی پرستش بھی اور پھر اس کے سامنے سجدہ میں گر جاتا ہوں۔"

قرآن جب انسانی وجدان سے مخاطب ہوتا ہے تو اسے دعوت فکر دیتا ہے یعنی" انسان خدا کی دی ہوئی بصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے اندر اور اپنے وجود کے باہر جو کچھ بھی محسوس کر سکتا ہے اس میں تدبر اور تفکر کرے۔ اسی تدبر و تفکر سے خدا پرستی کا راستہ کھلتا ہے کیوں کہ انسان اسی سے قدرت کے اسلوب و قانون کا ادراک حاصل کر سکتا ہے۔ اقبال نے اسی انداز کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ :-

گو فکر خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادی افکار ہے شیطان کی ایجاد

یعنی جب انسان اپنی فطرت صحیحہ سے کام لے کر بزم قدرت پر نظر ڈالتا ہے تو اس پر بہت سے رموز و نکات کھلتے ہیں لیکن آزادی افکار سے مراد یہاں عقلی داؤں پیچ اور منطقی استدلال کا طریقہ ہے جس سے اصل حقیقت کا تو پتا نہیں چلتا مگر بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہو سکتا تھا۔ کہ گویا عقل حقیقت پر شبخون مارنے کی کوشش کرتی ہے مگر ناکام رہتی ہے اور منطقی دلائل و براہین پر راضی ہو کر بیٹھ رہتی ہے۔ یہی چیز شیطانی ہے اس لیے کہ اس سے یقین کے بجائے وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔

اس نظام کائنات میں جس کی تعمیر اور ارتقا میں لاکھوں برس گزرے ہیں انسان کا وجود ہوا اور انسان نے بھی اپنی جسمانی ترقی کے بعد ہزاروں برس میں روحانی اور عقلی ترقی کی۔ اب انسان جس کی پیدائش و ترقی میں فطرت نے ہزاروں سال صرف کیے کیا وہ انسان کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دے گی ؟ کیا اس کرۂ ارض پر انسان کی مختصر زندگی آبدی طور پر فانی ہے ؟ عقل ان مسلمات کی بنا پر اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے، یہاں معاد اور سزا و جزا کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے، کیوں کہ اگر حیات بعد موت ہے تو پھر جزا کا تصور لازمی ہے۔

رب العالمین کی تشریح کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں :

"رب العالمین ہونے کے معنی یہ ہوتے کہ جس طرح اس کی خالقیت نے کائنات ہستی اور اس کی ہر چیز پیدا کی ہے اسی طرح اس کی ربوبیت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سر و سامان بھی کر دیا ہے اور یہ پرورش کا سر و سامان ایک ایسے عجیب و غریب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظام کے ساتھ ہے کہ ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لیے جو کچھ مطلوب تھا وہ سب کچھ مل رہا ہے اور اس طرح مل رہا ہے کہ ہر حالت کی رعایت ہے اور ہر ضرورت کا لحاظ ہے۔ ہر تبدیلی کی نگرانی ہے اور ہر کمی بیشی ضبط میں آچکی ہے، چیونٹی اپنے بل میں رینگ رہی ہے کیڑے مکوڑے کوڑے کرکٹ میں پلے ہوئے ہیں۔ مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں۔ پرندہوا میں اڑ رہے ہیں۔ پھول باغ میں کھل رہے ہیں۔ . . . اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں لیکن فطرت کے پاس سب کے لیے پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضانِ ربوبیت سے محروم ہو۔"

اور اس فیضان ربوبیت کا مظاہرہ حسن وجمال کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو رحمٰن ورحیم کی شان ہے" فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں بلکہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ہے کہ اس کے ہر بناؤ میں حسن و زیبائی کا جلوہ اور اس کے ہر ظہور میں نظر افروزی کی نمود پیدا ہو گئی ہے کائنات ہستی کو اس کی مجموعی حیثیت سے دیکھو یا اس کے ایک ایک گوشۂ خلقت پر نظر ڈالو اس کا کوئی رخ نہیں جس پر حسن ورعنائی نے ایک نقاب زیبایش نہ ڈال دی ہو۔ ستاروں کا نظام ان کی سیر و گردش سورج کی روشنی اور اس کی بوقلمونی، چاند کی گردش اور اس کا اتار چڑھاؤ، فضائے آسمانی کی وسعت اور اس کی نیرنگیاں . . . . سمندر کا منظر اور دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندیاں اور وادیوں کا نشیب؟ پھولوں کی عطر بیزی اور پرندوں کی نغمہ سنجی، صبح کا چہرۂ خنداں اور شام کا جلوۂ محجوب، غرضیکہ تمام تماشا گاہ ہستی حسن کی نمایش اور نظر افروزی کی جلوہ گاہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس پردۂ ہستی کے پیچھے حسن افروزی اور جلوہ آرائی کی کوئی قوت کام کر رہی ہے۔"

اس کے بعد مولانا نے صفاتِ الٰہی کا قرآنی تصور پیش کیا ہے: "تاریخ شاہد ہے کہ خدا پرستی کی راہ کتنی نازک اور پرخطر ہے۔" "انسان کو خدا پرستی کی راہ میں جس قدر ٹھوکریں لگی ہیں وہ صفات ہی کے تصور میں لگی ہیں۔" اس سلسلے میں مولانا نے تمام قدیم وجدید مذاہب میں جو خدا کا تصور ہے اس پر نہایت عالمانہ اور محققانہ بحث کی ہے اور از روئے تحقیق جدید یہ ثابت کیا ہے کہ "انسانی دماغ کا سب سے زیادہ پرانا تصور جو قدرت کی تاریکی میں چمکتا ہے وہ توحید کا تصور ہے . . . . لیکن پھر اسی کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس جگہ سے اس کے قدم بتدریج پیچھے ہٹنے لگے اور توحید کی جگہ آہستہ آہستہ اشراک" "اور تعدد الٰہ" کا تصور پیدا ہونے لگا۔ یعنی . . . ایک معبود کی جگہ بہت سے معبودوں کی چوکھٹ پر انسان کا سر جھک گیا۔ اس خیال کی تشریح انھوں نے موجودہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مغرب محققین کی سند سے کی ہے اور انیسویں صدی کی تحقیق کو باطل کر دیا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان کے مذہبی خیالات اوّل اوّل اوہام سے شروع ہو کر آخر میں توحید الٰہی پر ختم ہوئے مولانا کا یہ بیان کہ پہلے پہل انسان کی فطرت میں جس چیز کی نشو ونما ہوئی وہ توحید الٰہی کا تصور تھا اوہام بعد کو پیدا ہوئے تحقیقات کا ایک نیا راستہ ہموار کر دیتا ہے۔

چنانچہ انھوں نے اس ارتقائی تصوّر کو نہ صرف قرآن کے خلاف بتایا ہے بلکہ تحقیق جدید کی روشنی میں یہ سمجھایا ہے کہ توحید الٰہی کا تصور اتنا ہی پرانا اور قدیم ہے جتنا کہ انسانی شعور۔ ویانا یونیورسٹی کے پروفیسر اشمٹ کا حوالہ دے کر انھوں نے لکھا ہے:

"اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی عمران و تمدن کے تصور کی اعلیٰ ترین ہستی فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا اور انسان کا دینی عقیدہ جو اس سے ظہور پذیر ہوا وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا"

قدیم یونانی، رومی، یہودی، چینی مذاہب کے تصورِ الٰہی کو واضح کر دینے کے بعد مولانا نے بدھ اور ہندو مت پر بڑی لمبی بحث کی ہے اور آپ نشد کے فلسفہ کی باریکیاں بتلانے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندو مذہب کے عقائد میں بھی خاص و عام کا امتیاز کیا جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ خدا کا ایک تصور تو حقیقی ہے اور وہ خواص کے لیے ہے، ایک تصور مجازی ہے اور عوام کے لیے ہے"

چنانچہ ہندوستان میں خدا شناسی کے تین درجے قرار دیے گئے۔ عوام کے لیے دیوتاؤں کی پرستش، خواص کے لیے براہ راست خدا کی پرستش، اخص الخواص کے لیے وحدۃ الوجود کا مشاہدہ" لیکن قرآن نے حقیقت و مجاز یا خاص و عام کا کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا۔ اس نے سب کو خدا پرستی کی ایک ہی راہ دکھائی اور سب کے لیے صفاتِ الٰہی کا ایک ہی تصور پیش کیا۔ وہ سب پر اعتقاد و ایمان کا ایک ہی دروازہ کھولتا ہے"

آخر میں مولانا نے بتایا ہے کہ فلاح و سعادت کی راہ کونسی ہے اور اس کی کیا پہچان ہے؟ یہ ایمان اور عمل صالح کا قانون ہے جس پر چل کر انسان فلاح پا سکتا ہے اور تفرقے سے بچ سکتا ہے۔ ایمان سے مراد خدائے واحد کی پرستش اور عمل صالح سے مراد وہ اعمال ہیں جن کی "اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہے۔ قرآن نے اس کو "الدین" اور "الاسلام" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس ایمان و عمل صالح میں نہ تو کسی خاص نسل و قوم کی خصوصیت رکھی گئی ہے۔ نہ کسی خاص مذہب اور اس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے پیروؤں کی۔ دنیا کے تمام نبی، تمام صدیق، تمام شہدائے حق، تمام صالح انسان خواہ کسی ملک و قوم میں ہوئے ہوں قرآن کے نزدیک "انعام یافتہ" انسان ہیں اور انھی کی راہ "صراط مستقیم" ہے۔"

اب آخر میں سورۂ فاتحہ کی تعلیمی روح پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ اس کا ماحصل کیا ہے۔ یہ سات آیتوں کی سورت انسان کو خدا کی حمد و ثنا سکھانے کے بعد اس کے ذہن میں "رب العالمین" کی پروردگاری، رحمت اور عدالت کا تصور پیدا کرتی ہے۔ پھر انسان "عبادت اور استعانت کو صرف ایک ہی ذات سے وابستہ کر کے، سیدھی راہ چلنے کی توفیق مانگتا ہے، وہ راہ جو گمراہوں کی نہیں ہے اور نہ کسی خاص نسل و قوم سے تعلق رکھتی ہے، گویا وہ تمام انسانیت کی راہ ہو گی۔ اس سورت سے متاثر ہو کر جو انسان بھی ہو گا وہ عالمگیر انسانیت کا انسان ہو گا اور دعوتِ قرآنی کی اصلی روح یہی ہے۔"

یہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا خلاصہ ہے اور جس رنگ میں یہ لکھی گئی ہے وہ تمام تفسیروں کے مقابلہ میں بالکل منفرد ہے اس میں نہ صرف نفسِ انسانی کی فلسفیانہ تشریح و تحلیل کی گئی ہے بلکہ ان کو تاریخی حقائق سے بھی ثابت کیا گیا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد بحیثیت ادیب و صحافی

مالک رام

مولانا ابو الکلام آزاد کی مادری زبان اردو نہیں، عربی تھی۔ اُن کی والدہ عرب تھیں، مدینہ منورہ کے مفتی محمد بن ظاہر کی بھانجی۔ اس لیے لامحالہ مولانا آزاد کی اُن سے بات چیت عربی میں ہوتی ہوگی۔ بچپن میں اُن کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور زبان سیکھنے کا امکان بھی نہ تھا۔ کیونکہ خاندان حجاز میں مقیم تھا جہاں اُردو کی تعلیم و تدریس کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بعد کو جب تعلیم شروع ہوئی تو وہ بھی عربی اور فارسی تک محدود رہی، اور چونکہ اُن کا خاندان اپنے علم و فضل اور مذہبی تقدس کے باعث برگزیدہ رہا تھا اس لیے جب تعلیم کا آغاز ہوا تو دینیات پر خاص توجہ رہی اُنھوں نے پندرہ برس کی عمر میں درس نظامی مکمل کر لیا تھا۔

لیکن وہ تصنیف و تالیف کے میدان میں اس سے پہلے داخل ہو چکے تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۹ء میں، جب ان کی عمر ہنوز گیارہ برس سے متجاوز نہیں ہوئی تھی، شعر گوئی شروع کی۔ عام حالات میں گیارہ برس کا بچہ کوئی علمی بات تو درکنار، اپنے خیالات اور مافی الضمیر کو بھی مسلسل اور قابل لحاظ پیرائے میں بیان کرنے پر قدرت نہیں رکھتا، چہ جائے کہ شاعری۔ مولانا آزاد نے اس عمر میں باقاعدہ شاعری شروع کر دی، تو اب دستور زمانہ کے مطابق استاد کی ضرورت پیش آئی۔ اس دور میں امیر مینائی اور داغ دہلوی کا ملک بھر میں طوطی بولتا تھا۔ بلا مبالغہ سیکڑوں شاگرد اُن کے دامن تربیت سے وابستہ تھے۔ قدرتاً مولانا آزاد کی نگاہ بھی انھیں پر پڑی۔ پہلے اُنھوں نے داغ سے تعلق قائم کیا ممکن ہے اس فیصلہ میں اُن کی دہلویت بھی کسی حد تک اثر انداز رہی ہو کیونکہ مولانا آزاد کا اپنا خاندان بھی دہلوی تھا۔ اگرچہ وہ خود مکۂ معظمہ میں پیدا ہوئے لیکن اُن کے والد مولانا خیر الدین پشتینی دہلوی تھے۔ مشہور کوچۂ پنڈت کے رہنے والے، وہیں اُن کا اپنا مکان تھا غرض انھوں نے شروع میں داغ سے سلسلۂ تلمذ قائم کیا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں، یہ تعلق دو تین غزلوں سے آگے نہ بڑھ سکا، اور وہ اُسے منقطع کر کے امیر مینائی سے مشورہ کرنے لگے۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔ دو چار غزلوں کے بعد دل اُچاٹ ہو گیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یوں معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ محض زبان اور اصلاح کا نہیں، بلکہ نظریہ اور مقصدِ شاعری کا تھا۔ داغ اور امیر دونوں کی شاعری میں زبان پر زیادہ توجہ رہی۔ گہرائی اس میں بہت کم بلکہ برائے نام تھی۔ داغ کی بہ نسبت امیر میں صلاحیت کہیں زیادہ تھی اور ان کی خاندانی روایت اور پس منظر بھی داغ سے بہتر تھا، لیکن داغ کی شہرت اور مقبولیت اور ہر دلعزیزی نے انھیں بہکایا، اور وہ بھی اسی سطح پر باتیں کرنے لگے جو داغ کا طرۂ امتیاز تھی۔ نتیجہ معلوم! خیر یہ دوسرا موضوع ہے، اس کے بارے میں پھر کبھی۔

امیر کے بعد مولانا آزاد نے چندے مولانا محمد ظہیر احسن شوق نیموی سے اصلاح لی۔ یہ تعلق نسبتاً طویل ثابت ہوا، لیکن نتیجے کے لحاظ سے اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ جلد ہی مولانا آزاد نے سرے سے شاعری ترک کر کے پوری توجہ نثر نگاری پر مرکوز کر دی۔ اُن کا سارا شعری سرمایہ جو دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے، ڈھائی تین سو شعر سے زیادہ نہیں۔

میں عرض کر رہا تھا کہ مولانا آزاد نے دس گیارہ برس کی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی لیکن یہ کوئی ایسی تعجب کی بات نہیں، بعض اور اصحاب بھی اتنی کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ مولانا آزاد کی فضیلت کی بات یہ ہے کہ انھیں اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ شاعری کے ساتھ ایک گلدستہ بھی شائع کرنا چاہیے، "تاکہ ہر مہینے طرح" پر ملک کے مختلف حصوں سے شعرا سے غزلیں منگوا کر اس میں شائع کی جائیں۔ اس سے جہاں ایک مشغلہ ہاتھ آجائے گا" وہیں مقابلے میں غزلیں کہنے سے مشق اور مزاولت میں بھی مدد ملے گی اور کلام میں ترقی کا موقع بھی ملے گا۔ ایک گیارہ برس کے لڑکے کا اس انداز سے سوچنا واقعی حیرت انگیز ہے۔ غرض انھوں نے غالباً نومبر ۱۸۹۹ء میں "نیرنگِ عالم" کے نام سے ایک ماہانہ گلدستہ کلکتہ سے جاری کیا۔ میری نظر سے اس کا کوئی شمارہ نہیں گزرا۔ اگرچہ اس کے ایک شمارے کی موجودگی میرے علم میں ہے۔ اس پرچے میں صرف شعری کلام چھپتا تھا، نثر بالکل نہیں تھی۔

"نیرنگِ عالم" پورا ایک برس بھی نہیں چلا، اس سے پہلے ہی بند ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے کلکتے ہی سے ایک اور ماہانہ "المصباح" نام کا جاری کیا، یہ بھی زیادہ دن نہ جیا۔ اس کے کسی پرچے کی موجودگی میرے علم میں نہیں ہے۔

"نیرنگِ عالم" اور "المصباح" دونوں مشق کی ذیل میں آتے ہیں۔ آپ نے بڑے بڑے خطاطوں اور خوشنویسوں کی مشق کے نمونے ملاحظہ کیے ہوں گے جب بھی کوئی خوشنویس وصلی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لکھنے کا عزم کرتا ہے تو اُس سے پہلے حروف اور دائرے کسی ترتیب اور نظام کے بغیر کاغذ پر بناتا رہتا ہے۔ بعض ایسی مشقیں جو مُرورِ زمانہ کے باوجود محفوظ رہ گئی ہیں۔ اُن کی عجیب شان ہے۔ حرف پر حرف اور دائرے پر دائرہ لکھا اور بنا ہوا ہے۔ اُستاد کا مقصد اس سے یہ ہوتا تھا کہ ہاتھ ذرا بیٹھ جائے تاکہ اصلی وصلی لکھتے وقت قلم میں لغزش نہ پیدا ہو۔ یہ دونوں پرچے بھی ایک طرح سے مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کے لیے گویا مشق کا حکم رکھتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۰۳ء میں کلکتے سے ایک نیا ماہنامہ "لسان الصدق" کے نام سے جاری کیا۔ یہ پہلے دونوں پرچوں سے الگ نوعیت کا تھا۔ "نیرنگِ عالم" توصرف شعری گلدستہ تھا جس میں کوئی نثری حصّہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ "المصباح" کا کوئی شمارہ کہیں نظر سے نہیں گزرا، اس لیے اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا محال ہے۔ لیکن اس کے نام سے شبہہ گزرتا ہے کہ شاید یہ پرچہ مذہبی نوعیت کا ہو۔ اب "لسان الصدق" جو جاری ہوا تو اس میں نظم بالکل نہیں تھی۔ اس کا پورا فائل میری نظر سے گزرا ہے۔

"لسان الصدق" کا پہلا شمارہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا۔ اس پہلے شمارے میں اس کے جو مقاصد چھپے ہیں وہ یہ تھے :

۱۔ سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنی۔

۲۔ ترقی اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔

۳۔ علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگالہ میں۔

۴۔ تنقید یعنی اُردو تصنیفات پر منصفانہ ریویو کرنا۔

جب یہ ماہنامہ جاری ہوا ہے تو مدیرِ محترم کی عمر پندرہ برس سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ یہ عمر اور پرچے کے یہ بھاری بھرکم مقاصد۔ پھر یہ محض دعاوی ہی نہیں رہے۔ انھوں نے واقعی "لسان الصدق" کو اسم بامسمّیٰ بنا دیا۔ اُس کے مضامین کا معیار اتنا معتبر اور بلند تھا، اور تحریر کا انداز ایسا دلکش کہ اُس نے فوراً صفِ اوّل کے پرچوں میں جگہ حاصل کر لی۔ ستارہ درخشید و ماہِ کامل شد۔ اس پر اس دور کے بعض پُرانے اور مشہور جرائد میں بہت اچھے تبصرے شائع ہوئے۔ اس کے مضامین میں لہجے کی متانت اور اسلوب کی ثقاہت سے بیشتر پڑھنے والوں کو خیال ہوا کہ مدیر کوئی معمر، سالخوردہ اور تجربہ کار بزرگ ہیں۔ اس رسالے نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ انجمنِ حمایتِ اسلام، لاہور اس دور کا مشہور ادارہ تھا، آج بھی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے سالانہ اجلاس بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتے تھے۔ اہلِ انجمن باہر کے صاحبِ علم حضرات کو خاص دعوت دے کر اس میں تقریر کرنے کو بلاتے ہیں۔ "لسان الصدق" کے مضامین کے معیار اور خطیبانہ انداز نے انجمن حمایت اسلام کے اصحابِ مجاز کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے اپنے ۱۹۰۴ء کے سالانہ جلسے کے لیے انھیں لاہور آنے اور اجلاس کو خطاب کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے خیال کیا کہ حضرت مدیر کوئی عمر رسیدہ عالم دین بزرگ ہوں گے۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ جب ابو الکلام آزاد کی شکل میں ایک ۱۵ - ۱۶ سال کا بے ریش و بروت لڑکا اُن کے سامنے پیش ہوا تو اُن پر کیا گزری ہوگی۔ بارے، اگلے دن اُن سے پھر تقریر کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اُن کا تقریر کا موضوع تھا۔ "تبلیغ اسلام کا طریق کار" یہ اجلاس یکم اپریل ۱۹۰۴ء تک ہوتے تھے۔

اسی موقع پر مولانا آزاد کی ملاقات مولانا حالی مرحوم سے ہوئی۔ اس کا قصہ بھی بڑا پُرلطف ہے مولانا آزاد انجمن کے اجلاس شروع ہونے سے ایک دن پہلے لاہور پہنچ گئے تھے۔ اسی دن وہاں ان کی ملاقات مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی سے ہوئی۔ سلیم کو جب معلوم ہوا کہ یہی "لسان الصدق" کے مدیر شہیر ہیں تو انھوں نے بجا طور پر اُسے عجائب عالم میں سے خیال کیا۔ وہ انھیں مولانا حالی کے پاس لے گئے جو جلسے میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔ جب سلیم مولانا آزاد کو ساتھ لے کر حالی کی خدمت میں پہنچے تو تعارف سے پہلے انھوں نے حالی سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں ان کی عمر کیا ہو گی؟ حالی کی طبیعت کا حزم و احتیاط معلوم ہی ہے انھوں نے تامل سے جواب دیا۔ ابھی بہت کمسن ہیں۔ اس پر سلیم نے اصرار کیا کہ نہیں فرمائیے۔ آپ کے خیال میں کیا عمر ہوگی؟ بالآخر مولانا حالی نے کہا پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ اب سلیم نے انھیں بتایا کہ یہی "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ پرچہ مولانا حالی کی نظر سے بھی گزرتا تھا اور وہ اس کے مضامین کے مدّاح تھے۔ ساری دنیا کی طرح وہ بھی یہی گمان کرتے تھے کہ رسالے کے ایڈیٹر کوئی تجربہ کار، عالم صحافی ہوں گے۔ یہ معلوم کر کے انھیں بہت تعجب ہوا کہ یہ نوعمر صاحبزادے اس ماہنامے کے ایڈیٹر ہیں۔ اُس دن جو تعلقات دونوں میں قائم ہوئے، امتدادِ زمانہ سے اُن میں استواری آئی۔ اور ایک دوسرے سے متعلق عزت اور محبت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔

افسوس کہ "لسان الصدق" نے بھی کوئی اٹھارہ مہینے میں دم توڑ دیا۔ مولانا آزاد کی سیمابی فطرت انھیں کوئی کام جم کر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ اس پر اُن کا اکثر سفر میں رہنا!

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلے پرچے کی باقاعدہ اشاعت پر اثر پڑا۔ بعض اوقات دو دو مہینوں کے لیے صرف ایک شمارہ شائع ہوا۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو گا کہ نومبر ۱۹۰۳ء کے بعد دسمبر کا پرچہ شائع ہوا اسی پر پہلی جلد کی تکمیل کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۹۰۴ء کے پورے سال میں صرف نو شمارے شائع ہوئے اور اس سال کا آخری پرچہ بھی اگست اور ستمبر (۱۹۰۴ء) کا مشترکہ شمارہ تھا، اسی پر دوسری جلد ختم ہو گئی۔ ۱۹۰۴ء میں اور کوئی پرچہ نہیں نکلا۔ ۱۹۰۵ء میں صرف ایک پرچہ شائع ہوا، جو اپریل اور مئی کا مشترکہ شمارہ تھا۔ اس کے بعد "لسان الصدق" بند ہو گیا۔

۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی نے انھیں دعوت دی کہ وہ لکھنؤ آئیں اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ماہانہ رسالے "الندوہ" کی ترتیب و تدوین میں اُن کا ہاتھ بٹائیں۔ "الندوہ" کا فائل آج بھی ملتا ہے۔ یہ خالص علمی اور تحقیقاتی پرچہ تھا اور ندوۃ العلماء کا آرگن ہونے کی وجہ سے اس کی ایڈیٹری بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔ چنانچہ مولانا شبلی خود اس کے ایڈیٹر تھے اور وہی مجلس ندوۃ العلماء کے سامنے اس کے لیے جوابدہ بھی تھے۔ مولانا شبلی جس پایے کے مصنف اور نقاد تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے اسے مدِّنظر رکھتے ہوئے ان کا سترہ سالہ نوجوان آزاد کو "الندوہ" کی ادارت میں شرکت کی دعوت دینا حیرتناک تو ہے ہی۔ لیکن اس سے بڑھ کر یہ مولانا آزاد کے علم و فضل کی، اُن کی تحریر کے معیار اور پختگی کی، اُن کی ذاتی متانت اور رکھ رکھاؤ کی عادت کی بھی اتنی بڑی سند ہے کہ مشکل سے اس کی مثال کہیں اور ملے گی۔

مولانا آزاد اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک چھ مہینے "الندوۃ" سے وابستہ رہے اور اس کے بعد انھوں نے کسی وجہ سے خود یہ تعلق قطع کر لیا۔

"لسان الصدق" کی ادارت کے زمانہ میں مولانا آزاد کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی تھی اور بہت لوگ ان کے مدّاح بن گئے تھے۔ انھیں میں ایک صاحب شیخ غلام محمد امرتسر کے رہنے والے تھے۔ وہ اُس زمانے کے مشہور سہ روزہ اخبار "وکیل" کے مالک تھے جو امرتسر ہی سے شائع ہوتا تھا۔ جب مولانا آزاد "الندوہ" کے ادارۂ تحریر سے الگ ہوئے تو شیخ غلام محمد نے اُنھیں امرتسر آنے اور "وکیل" کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ اس پر مولانا امرتسر چلے گئے۔ اُنھوں نے اپنے زمانہ ادارت میں "وکیل" میں بہت خوشگوار تبدیلیاں کیں جس سے پرچہ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ لیکن ایک نجی حادثہ ایسا پیش آ گیا کہ انھیں بادلِ ناخواستہ جلد ہی امرتسر سے واپس جانا پڑا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد کے ایک بڑے بھائی تھے، مولانا ابو نصر غلام یٰسین آہؔ۔ دونوں بھائیوں کی تعلیم ایک ہی نہج اور معیار پر ہوئی تھی۔ ان کے والد مولانا خیرالدین کا پیری مریدی کا سلسلہ بھی تھا۔ کلکتے اور بمبئی کے اطراف میں اُن کے مریدوں کی خاصی تعداد تھی۔ وہ بڑے بیٹے غلام یٰسین آہؔ کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ آہؔ بھی خو بو میں اپنے والد کے نقش قدم پہ تھے۔ لیکن خدا کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے! آہؔ عراق کے سفر پہ گئے اور وہاں بیمار ہو گئے۔ حالت خراب سے خراب تر ہو گئی۔ تو وہ واپس بمبئی آئے تاکہ یہاں مناسب علاج ہو سکے۔ حالت سُدھرنے کی جگہ اور بگڑ گئی۔ والد کلکتے سے بمبئی پہنچے اور انھیں ساتھ لے گئے۔ لیکن اُن کا وقت اخیر آپہنچا تھا۔ کلکتے پہنچنے کے بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ وسطِ ۱۹۰۶ء کی بات ہے، جب مولانا آزاد امرت سر میں "وکیل" سے وابستہ تھے۔ مولانا خیرالدین نے انھیں لکھا کہ اب تم گھر آ جاؤ اور کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ یہ ابھی جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ نومبر ۱۹۰۶ء میں والد نے ایک آدمی امرت سر بھیج دیا کہ اُنھیں اپنے ساتھ کلکتے لے آئے۔ اب کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا۔ یہ کلکتے چلے گئے۔ امرت سر کا زمانہ قیام اپریل ۱۹۰۶ء سے نومبر ۱۹۰۶ء تک صرف آٹھ مہینے رہا۔ وہ والد کے حکم کی تعمیل میں مجبوراً کلکتے چلے تو گئے لیکن سچ یہ ہے کہ وہاں جو کام ان کے سپرد کیا گیا، وہ کسی عنوان ان کی پسند کا نہیں تھا۔ مریدوں کی تعلیم و تربیت، پند و وعظ، وغیرہ سے وہ کوسوں دور تھے۔ اُدھر اخبار نویسی کا مشغلہ ان کا دل پسند کام تھا۔ شیخ غلام محمد بھی ان کے کام سے ہر طرح مطمئن اور خوش تھے۔ قصہ کوتاہ چند دن بعد انھوں نے اپنے والد سے کھل کر کہہ دیا کہ میں اس پیری مریدی کے کاروبار کو جاری نہیں رکھ سکتا، نہ مجھے یہ پسند ہے کہ لوگ آئیں اور میرے ہاتھ پاؤں کو فرطِ عقیدت سے بوسہ دیں۔ والد آدمی سمجھ دار تھے، انھوں نے دیکھ لیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں، ان کی مرضی کے خلاف انھیں کسی کام پر مجبور کرنے سے فائدہ۔ انھوں نے اجازت دے دی کہ اچھا اگر یوں ہے تو تم واپس امرتسر جا سکتے ہو۔ اس پر یہ اگست ۱۹۰۷ء میں امرتسر چلے گئے اور دوبارہ "وکیل" کی ادارت کی باگ ڈور ان کے سپرد کر دی گئی۔ لیکن اب کے ان کی صحت جواب دے گئی، اور وہ بیمار رہنے لگے۔ سال بھر بھی مشکل سے وہاں رہے، اور جولائی اگست ۱۹۰۸ء میں وکیل سے الگ ہو گئے۔

اب ان کی عمر ۲۰ سال کے لگ بھگ تھی، اس دوران میں انھوں نے کئی پرچوں میں کام کیا۔ ان میں سے بعض ان کی ذاتی ملکیت تھے، بعض دوسروں کے، جہاں وہ تنخواہ پر ملازم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ لیکن وہ کہیں بھی رہے ہوں، ان کا نصب العین ہمیشہ بلند رہا۔ ان کی یہی خواہش اور کوشش رہی کہ صحافت کو ملک و ملت کی بہتری اور بہبودی، خدمت گزاری اور خیر خواہی کا وسیلہ بنایا جائے۔ یہ اخبار اور رسالے گویا ان کی تجربہ گاہ تھے، جہاں وہ اس تلاش میں رہے کہ اخبار کا مطمح نظر کیا ہونا چاہیے! اور آخر کار انھیں معلوم ہوا تو یہ کہ جس منزلِ مقصود کی تلاش میں وہ اتنے دن سے بھٹک رہے ہیں، وہ کہیں باہر نہیں، بلکہ خود ان کے پاس تھی۔ ان کے نصب العین کو ان کے جاری کردہ ہفتہ وار "الہلال" نے پورا کیا۔

زبان پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا

اور سب باتوں کو چھوڑ کر "الہلال" کے صرف ادارۂ تحریری کو لیجیے، تو حیرت ہوتی ہے۔ مولانا آزاد کے علاوہ اس میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبداللہ عمادی مولانا عبدالسلام ندوی اور بعض دوسرے اصحاب کام کرتے تھے، اور سب کو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ ہفتہ وار تو درکنار، کیا آج تک کسی اردو ماہنامے کو بھی اتنا وقیع اور شاندار ادارۂ تحریر نصیب ہوا ہے؟ پھر اس کے مضمون نگاروں میں ملک کے صفِ اوّل کے ادیب اور انشا پرداز تھے۔ مولانا شبلی کی بعض معرکے کی نظمیں پہلی مرتبہ الہلال ہی میں شائع ہوئیں۔ غرض "الہلال"، صحیح معنوں میں ہماری سیاسی اور صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگِ میل ثابت ہوا۔

اس کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا تھا۔ مشکل سے تین برس چلا ہوگا کہ حکومت نے اس سے دو ہزار کی ضمانت طلب کر لی جو ادا کر دی گئی۔ جب یہ ضبط ہو گئی، تو اب کے دس ہزار طلب کیا گیا۔ یہ ان کی استطاعت سے کہیں زیادہ تھا! انھوں نے پرچہ بند کر دیا اور اس کی جگہ دوسرا پرچہ "البلاغ"، شائع کرنے لگے۔ صرف نام کا فرق تھا، ورنہ دونوں کی صوری یا معنوی حیثیت میں قطعاً کوئی فرق نہیں تھا، اوائل مارچ ۱۹۱۶ء میں حکومت بنگال نے ڈیفنس آف انڈیا آرڈی ننس (قانون) کے تحت ان کے صوبے سے اخراج کا حکم جاری کر دیا۔ چونکہ بیشتر دوسرے صوبوں کی حکومتیں اپنے ہاں ان کا داخلہ پہلے سے ممنوع قرار دے چکی تھیں، اب صرف بہار اور بمبئی ہی ایسے دو صوبے تھے، جہاں وہ جا سکتے تھے۔ بہار میں یہ سہولت تھی کہ کلکتے سے قریب تھا، لوگوں کو وہاں سے آنے جانے میں کم وقت اور خرچ پر ملاقات کا موقع مل سکتا تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے قیام کے لیے رانچی کا انتخاب کیا ابھی اس حکم پر اور ان کے رانچی میں قیام پر پانچ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومت ہند

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے ان کی رانچی ہی میں نظر بندی کا حکم جاری کر دیا۔ وہ چار سال بعد ۲۷ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوئے۔
"الہلال"، کئی لحاظ سے عہد آفریں ثابت ہوا۔ اس شان کا کوئی ہفتہ وار پرچہ اُردو میں شائع نہیں ہوا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے بعد بھی جو پرچے نکلے، ان کے سامنے نمونہ "الہلال" ہی کا رہا۔ ہر ایک کی یہی خواہش رہی کہ وہ شکل وصورت، مضامین کی ترتیب، اداریے، تصاویر وغیرہ میں "الہلال" کا تتبع کریں۔

لیکن ظاہری حسن اور طباعتی خوبیوں سے قطع نظر "الہلال" کا اصلی کارنامہ اس کے مدیر شہیر کی طرزِ تحریر کی بداہت تھی۔ کاہے کو کبھی کسی رسالے کے ایڈیٹر نے اپنے ہم وطنوں کو اربابِ حکومت کو، اکابر قوم کو علمائے دین کو یوں للکارا ہوگا۔ مولانا آزاد نے کسی کو نہیں بخشا، اور کوئی ان کی نگاہِ محاسبہ کی زد سے باہر نہیں رہا۔ جہاں بھی کوئی غلط بات اُن کے سامنے آئی، انھوں نے اس پر بے خوبی اور عواقب سے بے پروا ہو کر گرفت کی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ خوش نصیبی سے ان کی بے لاگ تنقید کا اثر ہوا، اور اس سے حسبِ دلخواہ نتائج پیدا ہوئے۔

بدیسی حکومت پر ان کی گرفت اور بھی شدید تھی۔ اور جب یہ خیال میں رہے کہ "الہلال" جولائی ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا اور "البلاغ" سمیت ۱۹۱۶ء میں بند ہو گیا۔ تو اس کے نتائج سے حیرت ہوتی ہے۔ اس وقت تک ہماری قومی تحریک اس مرحلے پر تھی کہ دوسرے کا تو کیا ذکر، کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بھی سب سے پہلی قرار داد قیصرِ ہند ملک معظم سے ملک و قوم کی وفاداری کی منظور کی جاتی تھی۔ مہاتما گاندھی ہنوز جنوبی افریقہ سے ہندوستان نہیں پہنچے تھے، اور پوری سیاسی تحریک بہت ہی نرم رو اور نرم گفتار تھی۔ حکومت پر اس کے اعمال و اقوال میں کڑی نکتہ چینی کی ابتدا "الہلال" ہی سے ہوئی۔

صحافت کو بوجوہ ادب میں شمار نہیں کیا جاتا۔ لیکن "الہلال" کے کئی مضمون ادب میں بھی بلند مقام پانے کے مستحق ہیں۔ انھوں نے جو مقالے مسلم یونیورسٹی سے متعلق لکھے تھے، اور جن میں طنز و مزاح کا عنصر نمایاں ہے، وہ ادبی لحاظ سے بھی بہت قیمتی اور اہم ہیں۔ "الہلال" کی ادبی خدمات اپنی جگہ، لیکن اس رسالے نے جو اثر اپنے زمانے کے اور بعد کے لکھنے والوں پر کیا، وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ ہمارے بعض مشہور ادیب "الہلال" اور مولانا آزاد کے اسلوب تحریر کے تتبع اور خوشہ چین تھے۔ اس سلسلے میں نیاز فتح پوری کا نام فوری طور پر ذہن میں آتا ہے۔
مولانا آزاد کی تعلیم سراسر عربی اور فارسی زبانوں کے ذخیرے تک محدود رہی تھی۔ اس کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعد ان کا مطالعہ بھی انھیں علوم تک محدود رہا۔ تقریر اور خطابت کا شوق انھیں بچپن سے تھا، جیسا کہ ان کی بڑی ہمشیرہ فاطمہ بیگم المتخلص بہ آرزو کی شہادت سے ظاہر ہے۔ فرماتی ہیں:

"بچپن میں بھائی کو ان کھیلوں کا شوق نہیں تھا، جو اکثر بچے کھیلا کرتے ہیں۔ ان کے کھیل سات آٹھ سال کی عمر میں عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے مثلاً کبھی وہ گھر کے تمام صندوقوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے تھے کہ یہ ریل گاڑی ہے۔

پھر والد کی پگڑی سر پہ باندھ کر بیٹھ جاتے اور ہم بہنوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ چلا چلا کر کہو، ہٹو، راستہ دو، دلّی کے مولانا آ رہے ہیں۔ ہم لوگ اس پر کہتے تھے کہ بھائی، یہاں تو کوئی آدمی نہیں ہے۔ ہم کس کو دھکا دیں اور کہیں کہ راستہ دو۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے۔ تم سمجھو کہ بہت لوگ مجھ کو لینے اسٹیشن پر آئے ہیں۔

پھر بھائی صندوقوں پر سے اترتے تھے اور بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلتے تھے، جیسے کہ بڑی عمر کے لوگ چلتے ہیں۔ کبھی وہ گھر میں کسی اونچی چیز پر کھڑے ہو جاتے تھے، اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم تالیاں بجاؤ اور سمجھو کہ ہزاروں آدمی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ میں کہتی تھی کہ بھائی، سوائے ہم دو چار کے یہاں اور کوئی نہیں ہے، ہم کیسے سمجھیں کہ ہزاروں آدمی یہاں کھڑے ہیں۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے، کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

خطابت کا یہ شوق عمر کے ساتھ اور بڑھا بلکہ اب یہ شوق ان کی تحریر میں بھی در آیا۔ لیکن تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے باوجود کہ ان کی تحریر عربی فارسی کے ثقیل الفاظ اور تراکیب سے گرانبار تھی، نہ اس کی روانی میں کمی آئی، نہ اس کی شگفتگی اور دلکشی میں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے فقرے ایسے ترشے ترشائے ہوتے تھے، جیسے کسی نے ہیرے کو کاٹ چھانٹ کر اسے اور بھی حسین بنایا ہو۔

کئی لوگوں نے ان کی تحریر کی ثقالت اور عربی فارسی کے مشکل الفاظ کی کثرت پر اعتراض کیا ہے۔ یہ اعتراض اپنی جگہ درست ہے اور اسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ لیکن اس کی توجیہہ بڑی آسان ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ "الہلال" میں ان کے مخاطب اہل علم بلکہ طبقہ علما کے لوگ تھے۔ بیشتر موضوعات بھی انھیں اصحاب کی دلچسپی کے تھے۔ ایک طرف ان کی اپنی تعلیم کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پسِ منظر پیشِ نظر رکھیے، اور دوسری طرف ان کے مخاطبوں کے علم وفضل کا معیار، تو آپ لازماً اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان مقالات میں انھوں نے جو زبان اور لب ولہجہ اختیار کیا۔ وہی درست تھا۔ وہ اس سے آسان زبان لکھنے پر قادر تھے۔ ترجمان القرآن میں (تفسیر سورۂ فاتحہ کے بعض حصّوں کو چھوڑ کر) ان کی تحریر بہت سلیس اور آسان ہے، خاص کر اس کا ترجمہ اور حواشی والا حصّہ۔ چونکہ انھیں معلوم تھا کہ اس کے پڑھنے والے بیشتر عوام اور تھوڑی استعداد کے لوگ ہوں گے، اس لیے انھوں نے تکلموا النّاس علیٰ قدرِ عقولھم کے مصداق یہاں اسی سطح پر بات کی، جو قاری کے علم وفہم کے مطابق تھی۔

اگرچہ ان کی تعلیم اپنی خاندانی روایات کے مطابق دینی علوم سے متعلق ہوئی تھی، لیکن وہ اسی پر مطمئن نہیں ہو گئے۔ انھوں نے وسیع اور گوناگوں مطالعے سے اس پر اضافہ کیا اور دوسروں کی تقلید ہی پر قناعت نہیں کر لی، بلکہ اپنے غور وفکر سے اپنی راہ آپ نکالی۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو پڑھا، اس کا بیشتر حصّہ دماغ میں محفوظ ہو گیا۔ شروع سے قرآن ان کے مطالعے اور غور وخوض کا محور ومرکز رہا تھا۔ "الہلال" میں انھوں نے قرآن کو ایسے انوکھے اور دل نشین انداز میں پیش کیا کہ اسے بالائے طاق سے اتار کر روزمرّہ کے استعمال کی چیز بنا دیا۔

اپنے طویل تفکّر اور تدبّر کے نتائج انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق تالیف ترجمان القرآن میں محفوظ کیے ہیں۔ افسوس کہ یہ تفسیر مکمل نہ ہو سکی! وہ نصف سے کچھ زیادہ شائع کر سکے تھے کہ سیاسی سرگرمیوں نے ان کے اوقات اور صلاحیتوں پر غاصبانہ قبضہ جما لیا اور وہ باقی حصّے کی تفسیر قلمبند نہ کر سکے۔ بیشک یہ علمی اور مذہبی دنیا کا عظیم نقصان رہا، لیکن اگر مسئلے کو اس پہلو سے دیکھا جائے تو دین کے بیشتر بنیادی مسائل قرآن کے نصفِ اوّل میں ہیں اور ان کے بارے میں انھوں نے اپنے افکار شائع شدہ دو جلدوں میں درج کر دیے ہیں، تو اس نقصان کا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور بات ہے۔ یہ ہے ان کا اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان۔ اگر واقعی پوری توجہ اور انشراحِ صدر سے ان دونوں جلدوں کا مطالعہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ قاری ان کے سوچنے کے طریقے سے متاثر نہ ہو، اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ قرآن کو کس ڈھنگ سے مطالعہ کرنے کے خواہشمند تھے۔ یوں ان کے دکھائے ہوئے رستے پر چل کر آپ خود بقیہ پاروں کی تعبیر وتفسیر کر سکتے ہیں۔ گویا ترجمان القرآن محض ترجمہ وتفسیر ہی نہیں، بلکہ ایک نئی تفسیر کی رہنما بھی ہے۔ میرے نزدیک ترجمان القرآن کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونانیات

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اسرائیلیات سے کاملاً اجتناب کیا اور علوم و دعوتِ قرآن کو دوبارہ اپنی اصلی اور سیاسی شکل میں پیش کر دیا جو شارع کا مقصود اور صدرِ اوّل کا اعتقاد تھا۔

چونکہ ترجمان القرآن میں قرآن کا ترجمہ اور حواشی ہیں، اس لیے اس کی ادبی اہمیت پر کما حقہ توجہ نہیں دی گئی، حالانکہ اس پہلو سے بھی یہ کچھ کم قابلِ قدر نہیں ہے۔

قرآن کے اردو ترجمے بیشتر ہیں، زیادہ نہیں تو آٹھ دس تو یقیناً خود میری نظر سے بھی گزرے ہوں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو لطف زبان و بیاں اور صحت و برجستگی ترجمان القرآن میں ملی، وہ الا ماشاء اللہ، ان کے کسی پیشرو یا پیرو کے یہاں دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ مترجم کو عربی اور اردو دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہو اور اس کا ادبی ذوق بھی اتنا بلند ہو کہ وہ محض معنی ہی کا خیال نہ رکھے۔ بلکہ موزونیت مقام اور اردو زبان کے مزاج سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ عربی تو ان کی مادری زبان تھی ہی، ذاتی مطالعے اور مشق سے انھوں نے اردو میں بھی اہلِ زبان کی سی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اس پہ قدرت کی طرف سے انھیں طبع موزوں اور شعر و ادب کا قابلِ رشک ذوق ودیعت ہوا تھا۔ ان سب باتوں نے مل کر ترجمان القرآن کو تخلیقی کارنامہ بنا دیا ہے۔

"الہلال" کے خالص ادبی مضامین کی طرف اشارہ کر چکا ہوں۔ لیکن اس کے بعد حالات کے تقاضے انھیں اس کوچے سے دور لے گئے۔ شعر و شاعری پہلے ترک ہو چکی تھی۔ اب ادب بھی مجبوراً چھوٹ گیا۔ حُسنِ اتفاق سے آخری قید کے دوران میں انھوں نے بعض ادبی مضامین خطوط کی شکل میں حوالہ قلم کیے، جو بعد کو "غبارِ خاطر" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ "الہلال" ان کے عہدِ شباب کی یادگار ہے، "غبارِ خاطر" عہدِ کہولت بلکہ بڑھاپے کی۔ لیکن کوئی شخص اسے پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی تھکے ہوئے دماغ یا قلم کی تخلیق ہے۔ یہاں بھی ان کے ذہن کی گرم جولانی، اور قلم کی گل افشانی میں وہی وسعت اور دلکشی ہے، جو روزِ اوّل سے ان سے منسوب رہی تھی۔ اسے دیکھ کر پھر ایک مرتبہ افسوس کرنا پڑتا ہے کہ علم و ادب نے ان کی ذات میں سیاست کی بارگاہ پہ کتنی بڑی قربانی دی۔ اگر تمام مشغولیتوں سے قطع نظر کر کے اپنے آپ کو علم و ادب ہی کے لیے وقف رکھتے، تو نہ معلوم آج اردو کے خزانے میں کیسے کیسے قیمتی جواہر کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔

سب سے آخر میں کسی حد تک ایک بے تعلق سی بات کہنے کی اجازت چاہتا ہوں بشرطیکہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسے گستاخی نہ خیال کیا جائے۔ ۱۱ر نومبر مولانا آزاد کی سالگرہ کے طور پر منایا جاتا ہے۔ لیکن یہ تاریخ غلط ہے۔

مولانا آزاد نے "تذکرہ" میں اپنی تاریخ ولادت کے بارے میں لکھا ہے:

"سنہ ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ ہجری میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا" (تذکرہ ص ۲۸۷ کلکتہ، طبع اوّل ۱۹۱۹ء)

اس سے بہتر اور زیادہ معتبر شہادت ان کی ولادت سے متعلق اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس کا مطلب ہے کہ مہینہ ذوالحجہ کا تھا اور ہجری سال ۱۳۰۵۔ ذوالحجہ کی تاریخ انھیں معلوم نہیں تھی، یا وہ اسے بھول گئے۔ البتہ عیسوی سال ۱۸۸۸ء جو ان کے علم میں تھا، وہ انھوں نے لکھ دیا۔ جنتری کی رو سے ۱۳۰۵ھ کا ذوالحجہ جمعرات ۹ر اگست ۱۸۸۸ء کو شروع ہوا اور جمعرات ۶ر ستمبر ۱۸۸۸ء کو ختم ہوا۔ جمعہ ۷ر ستمبر کو یکم محرم ۱۳۰۶ھ تھی۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، ان پرانی جنتریوں میں ایک آدھ دن کے فرق کا امکان ہے، لیکن مہینوں کا نہیں۔

پس ان کا یوم ولادت ۱۱ر نومبر کو قرار دینا قطعاً غلط ہے، اور اس کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہوسکتی۔ ۱۱ر نومبر تو سال ہجری ۱۳۰۶ھ میں پڑے گا۔ جب کہ وہ پیدا ہی ۱۳۰۵ھ میں ہوئے تھے۔

میں نے خود ایک مرتبہ اُن سے دریافت کیا تھا، اور جو اَتا پتا انھوں نے دیا تھا، اُس سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ غالباً بدھ کے دن ۲۲ر اگست ۱۸۸۸ء یعنی ۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ بہر حال یہ تو میرا تخمینہ ہے، جو صحیح بھی ہوسکتا ہے، غلط بھی۔ مولانا غلام رسول مہر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک موقع پر مولانا نے ان سے ذوالحجہ کی آٹھویں یا نویں کو اپنے یوم ولادت ہونے کا ذکر کیا تھا۔ اس صورت میں یہ ۱۶ یا ۱۷ اگست کے مطابق ہوگا، اور دن جمعہ یا ہفتہ کا۔ بہر حال اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں ہے کہ وہ ۱۱ر نومبر کو پیدا نہیں ہوئے تھے، وہ ۹ر اگست اور ۶ر ستمبر ۱۸۸۸ء کے درمیان کسی دن پیدا ہوئے۔ وما علینا الا البلاغ۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الہلال اور اردو صحافت

پروفیسر شمس الدین منیری

مولانا آزاد نے جب اردو صحافت کے میدان میں قدم رکھا، اس سے پہلے اردو صحافت کا گویا دورِ طفلی تھا۔ پیسہ اخبار، لاہور، مولوی محبوب عالم کی ادارت میں نکلتا تھا، یہ نہایت پرانا اور مقبول اخبار تھا۔ مگر یہ درحقیقت خبروں ہی کا اخبار تھا، علمی مضامین سے اسے کوئی تعلق نہ تھا، اس کے بعد وطن، لاہور اور وکیل، امرت سر کا دور آیا، وطن، وکیل سے زیادہ پرانا تھا اور زیادہ مقبول بھی تھا، اس کے مدیر مولوی انشاء اللہ خاں ایک سنجیدہ اور ذی علم شخص تھے، انھوں نے متعدد کتابیں بھی تصنیف کی تھیں، جن میں جنگ پلونا، (ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ) سب سے زیادہ مقبول اور معروف ہوئی۔ اسی کتاب کے ذریعہ سے اردو دانوں کو سلطان عبدالحمید خاں ثانی، سلطان ترکی اور ان کے شیر دل جنرل عثمان پاشا کے کارنامے معلوم ہوئے، مولوی انشاء اللہ خاں کو خلافت اسلامیہ سے خاص دلچسپی تھی اور حجاز ریلوے کی تحریک میں انھوں نے خاصہ حصہ لیا تھا۔ ان وجوہ سے ان کا اخبار وطن کافی مقبول تھا۔ وکیل اس کے مقابلہ میں پھیکا پھیکا معلوم ہوتا تھا، مگر جب مولانا آزاد نے باوجود صغر سنی وکیل کی ادارت سنبھالی، تو یکایک اس کی ظاہری اور معنوی حیثیتوں میں ایک انقلاب آ گیا اس کی ظاہری حالت بہت سنبھل گئی، نہایت اچھے کاغذ پر چھپنے لگا، کتابت بھی صاف اور خوبصورت ہو گئی معنوی طور پر بھی اس نے نمایاں ترقی کی، اس میں سنجیدہ اور وقیع مضامین چھپنے لگے اور اس کے مقابلہ میں اب وطن دبنے لگا، مگر وطن کا اصلی رقیب وکیل نہیں بلکہ اخبار زمیندار، لاہور ثابت ہوا۔ جب مولوی ظفر علی خاں مرحوم نے اس کی ادارت اختیار کی تو انھیں زمیندار کا حریف وطن ہی نظر آیا، انھوں نے اس کی ایسی خبر لی کہ بے چارہ وطن تھوڑے ہی دنوں میں قعر گمنامی میں گر گیا اور یوں کہنا چاہیے کہ بے موت مر گیا۔ دنیائے صحافت میں بوڑھے انشاء اللہ خاں اور جواں سال اور جواں طبیعت ظفر علی خاں کا مقابلہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے دنیائے شاعری میں انشاء اور مصحفی کا، مولوی انشاء اللہ خاں پرانے وقت کے ایک سنجیدہ بزرگ تھے، اور خلافت اسلامیہ سے ہمدردی رکھنے کے باوجود حکومت انگلشیہ سے بہت ڈرتے تھے۔ اور اس کے خلاف کسی تحریک میں شریک ہونا کجا ایک لفظ بھی سننا نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہتے تھے۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب علی گڑھ کے صرف گریجویٹ ہی نہیں تھے، بلکہ اُردو، فارسی ادب کے فاضل بھی تھے، ساتھ ہی نہایت پرجوش اور جنگجو طبیعت رکھتے تھے، انھوں نے جب انگریزی حکومت کے خلاف پنجاب میں جماعت احرار کی تنظیم کی تو مولوی انشاء اللہ خاں کے خلاف گویا صف آرا ہوگئے انشاء اللہ خاں نے اس تحریک کی مخالفت کی اور اس طرح ان میں اور مولوی ظفر علی خاں میں اَن بَن ہوگئی اور دونوں اخباروں میں ایک دوسرے کے خلاف نوک جھونک ہونے لگی، علامہ شبلی نے جب تحریک احرار کی حمایت کی تو انشاء اللہ خاں نے ان کی بھی مخالفت کی آخر وطن اخبار مولانا ظفر علی خاں کی تیز و تند نگاری کی تاب نہیں لاسکا اور ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی طرح بجھ کر رہ گیا۔

مولانا آزاد اگرچہ صحافت سے لگاؤ پیدا کرچکے تھے اور وکیل کے علاوہ الندوہ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے تھے، مگر اب تک اس میدان میں کھل کر نہیں آئے تھے، ان کا قیام زیادہ تر کلکتہ میں اپنے والد ماجد مولانا خیر الدین صاحب کے زیر سایہ رہتا تھا، مولانا خیر الدین صاحب عالم ہونے کے علاوہ بڑے پایہ کے صوفی اور بڑے مقبول اور ہر دلعزیز پیر تھے صرف کلکتہ میں ان کے لاکھوں مرید اور معتقد تھے، اس وجہ سے مولانا آزاد بھی نہایت خوش باش اور رئیسانہ زندگی گزارتے اور بے تکلف دوست احباب کے ساتھ ہر قسم کی آزادانہ صحبتیں رہتی تھیں راقم کے ماموں مولوی غلام محمد صاحب مرحوم بھی مولانا کے اس دور کے خاص دوستوں میں سے تھے اور عرصہ تک ان کے خلوت و جلوت کے شریک رہے، مگر ان کا بیان ہے کہ مولانا خیر الدین صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مولانا کی طرف توجہ کی اور تخلیہ میں ان کو تلقین کرنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں مولانا کی طبیعت کا رنگ بدل گیا، اور مولانا نے ان صحبتوں کو خیر باد کہا، بلکہ دوستوں سے ملنا جلنا بھی ترک کردیا، چنانچہ ماموں صاحب فرماتے تھے کہ ان ایام میں کئی بار وہ مولانا کے یہاں گئے اور ملاقات کے کمرے میں دیر تک منتظر بیٹھے رہے، مگر یا تو مولانا خلوت سے باہر ہی نہیں آتے یا آئے تو سرسری ملاقات کرکے اور خیر و عافیت دریافت کرکے واپس چلے گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ دوستوں کی آمد و رفت بھی مولانا کے یہاں نہیں رہی، اس کے بعد جب مولانا خیر الدین صاحب کا انتقال ہوا، تو ان کے مریدوں نے مولانا کو ان کی جگہ سجادہ نشین بنانا چاہا، مولانا میں اگر دور حاضر کے صوفیوں اور خانقاہیوں کی طرح کچھ بھی حرص دنیا ہوتی تو ان کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں تھا۔ ان کے والد مرحوم کے ہزاروں، لاکھوں مرید جاں نثاری کے لیے حاضر تھے، پھر خود مولانا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی شخصیت ایسی جاذب تھی کہ اگر یہ سلسلہ ارشاد و ہدایت مروجہ تصوف کے طریق پر پھیلاتے تو ان کے بھی لاکھوں جاں نثار مرید ہو جاتے اور ان کے قدموں پر زر و جواہر کا ڈھیر لگا دیتے جیسا کہ مولانا نے خود ایک موقع پر فرمایا کہ اگر میں چاہتا تو لوگوں سے اپنی پوجا کرواتا۔ مگر مولانا کی غیور طبیعت نے اس طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر حجرے میں بیٹھ جانے والی زندگی کو پسند نہیں کیا۔ بلکہ وہ میدان صحافت میں اپنی تمام فطری صلاحیتوں اور علمی قابلیتوں کے ساتھ نکل آتے اور دیکھتے ہی دیکھتے کاروانِ صحافت کے قافلہ سالار بن گئے۔

الہلال افق کلکتہ سے نکلا، اور اس آب و تاب سے نکلا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں مولانا کا ذوق جمالیات اتنا بلند تھا کہ اس سے کم درجہ کی چیز وہ نکال ہی نہیں سکتے تھے، اس کی ظاہری زیبائی و رعنائی ہی دامن کش دل تھی کہ دیکھنے والا اسی پر فریفتہ ہو جاتا تھا۔ اس کی معنوی خوبیوں کی طرف تو دیر میں توجہ ہوتی تھی، خوبصورت و رنگین سرورق پر مولانا کے نام کے ساتھ "مدیر مسئول و محرر خصوصی" کا فقرہ جاذب توجہ ہوتا تھا۔ آج کل یہ فقرہ رسالوں اور اخباروں میں عام طور پر مستعمل ہے، مگر بہت سے لوگوں کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ اردو زبان میں مولانا ہی نے پہلے پہل اس فقرہ کو داخل کیا۔ ان سے پہلے لوگ اس سے آشنا نہیں تھے اور خدا جانے اپنے دور صحافت میں مولانا نے ایسے ایسے کتنے الفاظ اور فقرے اُردو زبان و ادب میں داخل کیے)۔ جو آج کل سکۂ رائج الوقت بن گئے ہیں مولانا نے جریدہ الہلال کی ظاہری صورت میں ایک انقلاب انگیز تجربہ یہ بھی کیا کہ اسے بجائے لیتھو کے ٹائپ میں چھپوانا شروع کیا اور گو لوگ اس وقت تک اُردو ٹائپ میں چھپی ہوئی چیزیں پسند نہیں کرتے تھے۔ اور لیتھو کی نستعلیق ہی کے عادی تھے، مگر الہلال کا ٹائپ میں چھپنا اس کی مقبولیت میں بالکل مانع نہیں ہوا۔ الہلال میں کاغذ بھی نہایت اعلیٰ سفید گلیزڈ استعمال کیا گیا۔ اور اس میں تصاویر کا بھی خاص اہتمام تھا۔ تصویروں کے بلاک نہایت عمدہ اور صاف ہوتے تھے۔ اکثر نوجوان ترکوں کی تصویریں الہلال میں نہایت دیدہ زیب الفاظ میں چھپتی تھیں، خصوصاً انور پاشا کی تصویر جو انجمن اتحاد و ترقی، اور ترکی نوجوان تحریک کے روح رواں تھے، مختلف موقعوں پر اور مختلف زاویوں کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ اور اس کے نیچے مولانا اس شعر کو لکھ کر تصویر میں اور بھی چار چاند لگا دیتے تھے۔ ؎

تراچنانکہ توئی ہر کسے کجا داند بقدر طاقت خود می کنند استدراک

پھر ان تمام خوبیوں اور زیبائیوں کے ساتھ الہلال نہایت پابندی وقت کے ساتھ نکلتا تھا، اور مدتوں نکلتا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہا اب رہیں الہلال کی معنوی اور باطنی خوبیاں تو ابتدا ہی سے اس کے مضامین میں ایسی کشش اور جاذبیت ہوتی تھی کہ لوگ ہفتہ بھر اس کے لیے چشم براہ رہتے تھے اور جہاں جہاں یہ رسالہ آتا تھا اس کے پہنچتے ہی ایک مجمع ہو جاتا تھا اور لوگ اس پر گرے پڑتے تھے۔ یہ راقم کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ ان دنوں ہم لوگوں کا یہی معمول تھا کہ ایک شخص بلند آواز سے الہلال پڑھتا تھا اور سب حلقہ باندھ کر سنتے تھے اور سر دھنتے تھے۔

الہلال نے اردو زبان میں ایک خاص ادبیت کی بنا ڈالی اور اُردو صحافت کا ایک نیا اور نہایت رفیع الزیاں دلبستان قائم کر دیا۔ مولانا کی تحریروں میں ایک ایسا جادو ہوتا تھا کہ موافق و مخالف سب اس پر فریفتہ ہو جاتے تھے۔ مولانا اپنے جام بلوریں میں ایسی شراب دو آتشہ پیش کرتے تھے کہ پینے والا سرمست دبے خود ہو جاتا تھا، مولانا کی تحریر میں یہ وصف کیوں تھا، اس کا تجزیہ اور تحلیل مشکل ہے اچھے ادب سے لطف اندوز ہونا ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے، جو لوگ اس کے وجود اسباب تلاش کرتے ہیں وہ ادب پر ظلم کرتے ہیں۔

مولانا کی تحریر میں بلا کا زور بیان اور جوش وخروش ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے اُردو زبان میں کیا، دنیا کی بہت سی زبانوں میں ایسی پُرزور اور پرجوش تحریریں نہیں ملیں گی، الہلال کے پڑھنے والے تھوڑی دیر کے لیے ایسے سرمست اور بے خود ہو جاتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسری دنیا میں جا کر کھو گئے اور جب یہ نشہ کم ہو بھی جاتا تھا، جب بھی مولانا کی تحریر کی لذت دیر تک کام و دہن کو محسوس ہوتی رہتی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مولانا الفاظ کے بڑے جادوگر تھے، انھیں اس میں کمال تھا کہ ایسے الفاظ اور ترکیبیں اپنی تحریر میں استعمال کریں جن کا اثر مسحور کن ہو۔ ان کے کلام کا اثر اور جوش و خروش بس صرف الفاظ کا جادو تھا۔ راقم کو ان حضرات کے خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ جب تک لکھنے والے کے دل میں کوئی کیفیت نہ ہو، صرف الفاظ کی جادوگری سے دوسروں کے قلوب کو متاثر نہیں کرسکتا۔ یہ ایک کلیہ ہے، جس کے مستثنیات بہت مشکل سے ملیں گے، وہ پرانی مثل کہ "از دل خیزد بر دل ریزد"، اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے، مولانا کی پر زور اور پرجوش تحریریں یقیناً ان کی قلبی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی تھیں، وہ جو کچھ دل میں محسوس کرتے تھے وہی ان کی زبان وقلم سے الہلال کے صفحوں پر مترشح ہوتا تھا۔ ان کے لفظ لفظ سے ان کے دلی خلوص کا پتا چلتا تھا۔ ان کی نقل کرنے والوں میں بہت سے ذی علم لوگ بھی تھے، مگر ان کے قلوب اس کیفیت سے خالی تھے اس لیے ان کے کلام میں وہ تاثیر پیدا نہیں ہو سکی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد کی صحافتی عظمت

علامہ نیاز فتح پوری

مولانا آزاد کی تمام ذہنی خصوصیات اور جامعیتِ فضل و کمال سے ہٹ کر محض ان کی صحافتی عظمت و خصوصیت پر اظہارِ خیال بہت دشوار ہے۔ مولانا کے صحافتی بدائع کا ذکر کرنا اور اُن تمام عطایائے فطرت کو نظر انداز کر دینا۔ جو قدرت نے ان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کیے تھے ممکن نہیں کیونکہ مولانا کی صحافت عہدِ حاضر کی اصطلاحی اور ٹیکنیکل صحافت سے بہت مختلف تھی۔ اتنی مختلف کہ اگر ہم اسے ماورائے صحافت کسی اور چیز سے تعبیر کریں تو غالباً یہ تعبیر غلط نہ ہوگی۔

مولانا اپنی فطری افتاد، اپنے فکر و تصور، اپنے رجحانات و میلانات اور ذہنی اکتسابات کے تنوع کے لحاظ سے اس قدر غیر معمولی انسان تھے کہ بیک وقت نہ ہم ان کے جملہ فضائل و خصائص کا احصا کر سکتے ہیں، نہ ان کے دماغ کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے ان کی ادبی، علمی، مذہبی و صحافتی خصوصیات کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم کر سکتے ہیں۔

لائڈ جارج سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ "صحافی بننے کے لیے ایک انسان کو کیا کیا جاننا چاہیے"؟ انھوں نے جواب دیا "سب کچھ اور کچھ نہیں، یعنی صحافی دراصل وہ ہے جو دنیا کی تمام باتوں کو جانے، لیکن ماہر کسی کا نہ ہو۔" لیکن مولانا کی یہ عجیب و غریب خصوصیت کہ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور جو کچھ جانتے تھے ماہرانہ حیثیت سے جانتے تھے ایسی خصوصیت تھی جس کی نظیر دنیائے صحافت میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

مولانا کے فضل و کمال کا تنوع، ان کے مطالعہ کی وسعت ان کا پاکیزہ جمالیاتی ذوق اور ایک خاص قسم کا عالمانہ رکھ رکھاؤ ان سب کا اتنا دل کش امتزاج ان کے اندر پایا جاتا تھا کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا کر ہی نہیں سکتے۔ گویا وہ ایک ایسا کُل تھے جس کا کوئی جزو اس سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے سامنے اگر مختلف رنگ کے پھول علیحدہ علیحدہ رکھ دیے جائیں تو ہم ان کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رنگ و نکہت پر علیحدہ علیحدہ اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان سب کا گلدستہ بنا کر سامنے لایا جائے تو ہم اسے گلدستہ ہی کی حیثیت سے دیکھیں گے اور امتیازِ رنگ و نکہت کا کوئی سوال ہمارے سامنے نہ ہوگا۔ بالکل یہی حال مولانا کے ذہنی اکتسابات کے تعدد و تنوع کا تھا کہ ہم ان کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کر ہی نہیں سکتے۔ خواہ وہ شعر و ادب سے متعلق ہوں۔ خواہ مذہب و حکمت سے وابستہ ہوں۔ خواہ صحافت و سیاست سے!

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہو سکیں وہ اُن سے بہت کم تھیں جو چھپی ہوئی رہ گئیں۔ حالانکہ وہ بہت زیادہ وزنی و گراں قدر تھیں۔ ہم نے مولانا کو اتنا ہی جانا جتنا وہ چاہتے تھے کہ ہم جانیں اور ان کی ہستی کے بہت سے امکانات دنیا پر ظاہر نہ ہو سکے۔

وہ امکانات کیا تھے ان کی تعیّن و صراحت آسان نہیں، تاہم جس حد تک میرے ذاتی ربط و مطالعہ کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل کر وہ نہ ہو جاتی جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہو سکتے تھے۔ وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے متنبی و بدیع الزماں ہوتے۔ اگر وہ محض دینی و مذہبی اصلاح اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے۔ اگر محض علومِ حکمیہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجہ کے متکلم و فیلسوف نہ ہوتے۔ اگر فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی و نظیری کی صف میں انھیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف و اصلاحِ اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے۔ اور اگر وہ مسلکِ اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔

واصل بن عطا کا ذکر آیا ہے تو اس کے تبحرِ علمی کا بھی ایک لطیفہ سُن لیجیے۔ یہ پیدائشی توتلا تھا جسے عربی میں اَلثَّغ کہتے ہیں۔ رے کا تلفظ وہ صحیح نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی ذہانت اور لسانی مہارت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کسی مجمع میں تقریر کرنے کھڑا ہو جاتا تو وہ کوئی لفظ ایسا استعمال ہی نہ کرتا جس میں رے پائی جاتی ہے۔ ایک بار اس سے کسی نے پوچھا کہ اگر تم کو یہ کہنا ہو کہ "وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنا نیزہ تانا" تو کیا کہو گے۔ عربی میں اسی مفہوم کو یوں ادا کریں گے "رکب علی فرسه وجرّ رمحه" اس میں چار جگہ رے آتی ہے واصل نے کہا کہ میں اسے یوں کہوں گا۔ "استوی علی جوادہ وسحب عامله" خیر یہ تو ایک دل چسپ بات تھی جس کا ذکر ضمناً آ گیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مولانا آزاد کو زبان پر اتنا ہی عبور حاصل تھا۔

مولانا عجیب و غریب دماغی اہلیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جن کو زمانہ نے یا خود اُن

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی خلوت پسند طبیعت نے ابھرنے کا موقع نہ دیا اور آج ہم انہیں صرف الہلال و البلاغ کے رئیس التحریر یا تذکرہ، ترجمان القرآن اور غبارِ خاطر کے مصنف ہونے ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔

مولانا کے حالات زندگی اور ان کے امیال و عواطف سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ورنہ یہ حکایت لذیذ دراز تر ہو جاتی۔ لیکن اگر ہم محض ان کی صحافتی زندگی سامنے رکھیں تو بھی اس کی بوقلمونی اور بوالعجبی ایسی نہیں کہ اس سے سرسری گزر جایا جائے۔ کیونکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم نے ابوالکلام کو پہچانا اور اگر زمانہ مساعدت کرتا اور ان کے صحافتی مشاغل جاری رہتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کے اور کون کون سے قواء کامنہ بروئے کار آتے اور آج کتنا بڑا ذخیرہ علم و ادب کا ہمارے سامنے موجود ہوتا۔

مولانا کی فطری اہلیت و صلاحیت، قدرت کا ایک سربند راز تھی جس کے بعض گوشے تو ہمارے سامنے آگئے اور اکثر بے نقاب نہ ہو سکے۔ اس کا ایک سبب تو زمانہ کے حالات تھے۔ جنھوں نے ان کو اپنے ذوق کی پوری وسعت سے کام لینے کا موقع نہ دیا اور دوسرا سبب ان کی فطری خلوت پسندی و کم آمیزی تھی۔ وہ نام و نمود اور شہرت سے گریز کرتے تھے اور بربنائے متانت و خودداری وہ بے تکلفی میں بھی اپنی "شانِ گرانمایگی" ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

مولانا کے دورِ صحافت کی تاریخی تعیین دشوار ہے۔ کیونکہ ہم سمجھ نہیں سکتے کہ اس کا آغاز کب سے سمجھا جائے۔ مولانا کی علمی و صحافتی زندگی کے سلسلہ میں رسالہ لسان الصدق اخبار وکیل اور الندوہ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا لسان الصدق کے اجراء سے ہوتی ہے۔ جسے انھوں نے خود جاری کیا، خود مرتب کیا اور خود ہی بند کر دیا جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ جس فضا و ماحول میں رہ کر اسے جاری کیا گیا تھا وہ مولانا کے لیے بہت تنگ تھی اور بہت سی ایسی باتیں جنھیں وہ زیادہ کھل کر کہنا چاہتے تھے نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ زمانہ مولانا کی بہت کم سنی کا تھا اتنی کم سنی کا کہ اس عمر میں لوگ اپنی تعلیم بھی ختم نہیں کر چکتے کسی معلمانہ قدم اٹھانے کا کیا ذکر ہے لیکن مولانا کی غیر معمولی ذہانت اور قبل از وقت پختگی ذہن و دماغ نے ان کے مستقبل کو بھی حال میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور لوگ اس مستقبل کی درخشانی کو دیکھ کر حیران تھے۔

اس کے بعد جب مولانا شبلی کے اصرار پر الندوہ کی ادارت اپنے ہاتھ میں لی تو فضا دوسری تھی، ماحول کچھ اور تھا۔ معاملہ عوام کا نہیں خواص کا تھا اور خواص بھی جماعت علماء کا، لیکن مولانا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے اپنی انفرادیت کا اعتراف کرائے بغیران کو بھی نہ چھوڑا۔

علامہ رشید رضا اڈیٹر المنار ایک عظیم الشان اجتماع میں جو بڑے بڑے علماء پر مشتمل تھا تقریر کرنے جارہے ہیں اور ضرورت ہے ایک ایسے شخص کی جو عربی و اُردو دونوں کا ماہر ہو اور ان کی عربی تقریر کا برمحل ترجمہ کرتا جائے مولانا شبلی کے منصب سے یہ بات فروتر تھی کہ وہ خود اس خدمت کو انجام دیں اس لیے وہ اس باب میں بہت متفکر تھے۔ آخر جُزٌ قلیس کوئی اور نہ آیا بروے کار گئے مولانا ابوالکلام بے تکلفانہ سامنے آجاتے ہیں اور اس خدمت کو اتنی خوبی و دل کشی سے انجام دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ ترجمہ نہیں بلکہ خود تقریر کررہے ہیں۔

یہ تھا مولانا کی ذہانت و قابلیت کا پہلا عملی مظاہرہ جسے کھلے اسٹیج پر سینکڑوں مدعیان فضل و کمال نے دیکھا اور اسی وقت سے وہ حاسدانہ ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں جنھوں نے مولانا کو ندوہ و اہلِ ندوہ سے بے زار کردیا۔ علاوہ اس کے وہ یوں بھی اپنی موجودہ خدمت سے خوش نہ تھے۔ کیوں کہ الندوہ ایک خاص تعلیمی ادارہ کا آرگن تھا۔ مولویوں کا پرچہ تھا۔ جن کی باہمی سازشوں سے وہ تنگ آچکے تھے اس لیے انھوں نے الندوہ کو جس بلندی تک پہنچا دیا وہ الندوہ کا دورِ زرّیں کہا جاتا ہے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب مولانا کی خطیبانہ شہرت بھی ملک میں عام ہوتی جارہی تھی اور ان کے اندر زیادہ آزادی، زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ کام کرنے کا ولولہ تیزی سے ابھر رہا تھا۔ چنانچہ آپ کلکتہ واپس گئے اور وہاں سے الہلال جاری کیا جس کی خصوصیات سے آج ہر شخص واقف ہے۔

الہلال کے اجراء سے قبل مولانا کی صحافت زیادہ تر علم و مذہب تک محدود تھی اور بہت گھُٹی گھُٹی سی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب وہ صحیح طور پر میدانِ صحافت میں آئے تو اس شان سے کہ افقِ صحافت پر ایک نیا آفتاب طلوع ہورہا تھا اور اک نئی گرمی ہمارے دلوں میں پیدا ہو رہی تھی۔

مولانا کا رجحان سیاست کی طرف کب اور کیوں کر ہوا اس کی صحیح تاریخ متعین کرنا مشکل ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا اسی وقت ہوئی جب مصر کے جامعہ ازہر میں انھیں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریک آزادی کے لٹریچر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو یہ چنگاری اپنے سینہ میں لے کر آئے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی حدت تیزی سے بڑھتی گئی اور آخر کار شعلہ جوالہ بن کر الہلال کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس وقت الہلال جاری ہوا ہے اس وقت ہندوستان ذہنی اضطراب کے بڑے نازک دور سے گزر رہا تھا اور روئے زمین کی دوسری قوموں میں بھی سخت انتشار پیدا تھا۔ ملوکیت کہیں دم توڑ چکی تھی اور کہیں سنبھالا لے رہی تھی۔ ارستقراطیت و استعماریت اپنے بقاو تحفظ کے لیے ناخن و چنگال کی پوری قوت صرف کر رہی تھی۔ ڈماکریسی کی مدعی حکومتوں کے چہرے بے نقاب ہوتے جا رہے تھے اور قومی آزادی و خودداری کا احساس بڑے آزمایشی دور سے گزر رہا تھا۔ برطانوی مستعمرات کا طنطنہ ختم تو نہ ہوا تھا۔ لیکن اس سورج کو گہن لگنا ضرور شروع ہو گیا تھا اور وہ اپنے بقاو تحفظ کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے ہر انسانیت شکن اقدام پر آمادہ تھا۔ ہندوستان میں کانگریس آزادی کا بیج بو چکی تھی۔ اس کے کلّے پھوٹ چکے تھے۔ لیکن انگریز یہ طے کر چکا تھا کہ وہ اس پودے کو کبھی بار آور نہ ہونے دے گا اور جماعتی تفریق پیدا کر کے ملک کی ذہنیت کو دو متضاد حصّوں میں تقسیم کر دینا چاہتا تھا۔ مسلم لیگ وجود میں آ چکی تھی۔ لیکن مسلمانوں کی ذہنی رفتار ہندوؤں سے مختلف تھی ان کے سامنے ملکی مسائل ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی نگاہیں، ترکی، بلقان و طرابلس پر لگی ہوئی تھیں اور سرسید کی تعلیمات نے جو وقار انگریزوں کا مسلمان کے دل میں پیدا کر دیا تھا وہ بڑی حد تک اپنی جگہ قائم تھا۔ ہر چند مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جو انگریزوں سے منحرف ہو چلی تھی لیکن یہ انحراف و اختلاف داخلی نہ تھا، خارجی تھا، فاعلی نہ تھا۔ انفعالی تھا۔ وطن سے اس کا تعلق نہ تھا بلکہ مذہب و مذہبیت سے تھا۔ ملکی سیاست سے نہیں بلکہ ترکی کے انقلاب۔ بلقان و طرابلس کی تباہیوں اور مذہبی لامرکزیت کے احساس سے تھا۔ اس لیے ٹھیک اسی وقت جب کہ کانگریس اجتماعی تحریکِ آزادی کی بنیادیں استوار کر رہی تھی۔ مسلمان چند نفوس کو چھوڑ کر سب کے سب بیرونِ ہند کے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ جن کا تعلق زیادہ پان اسلامزم کی تحریک سے تھا۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے دو قابل ذکر اخبار جاری تھے۔ ایک زمیندار، دوسرا مسلم گزٹ، زمیندار کی توجہ تمام تر ترکی پر مرکوز تھی اور اس کا عظیم ترین مقصد شہدائے بلقان کے پسماندگان کے لیے چندہ جمع کرنا تھا۔ اندرونِ ملک کے معاملات اور یہاں کی داخلی سیاست سے اسے بہت کم دل چسپی تھی۔

مسلم گزٹ کے اڈیٹر مولانا وحید الدین سلیم، مولانا حالی کے عزیزوں میں تھے اور قدرتاً انھیں سرسید تحریک سے دل چسپی ہونا چاہیے تھی لیکن یہ کہنا غلط ہو گا کہ وہ علی گڑھ یا مسلم لیگ کا آرگن

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی تاہم اس میں کلام نہیں کہ وہ مسلمانوں کا جماعتی اخبار تھا اور سیاست میں اس کا نقطہ نظر ملت پرستی ہو تو ہو لیکن خالص وطن پرستی یقیناً نہ تھا۔ وہ آزادی کا محرک و معاون ضرور تھا۔ لیکن انھیں خطوط پر جو مسلم لیگ کے پیش نظر تھے وہ انگریزوں سے خوش نہیں تھا۔ لیکن اس کی برہمی نہ جارجانہ تھی نہ حریفانہ بلکہ اس کا انداز ایک ایسے دوست کا سا تھا جو روٹھتا ہے صرف منائے جانے کی توقع پر۔

یہ تھا وہ ماحول۔ یہ تھے وہ حالات، یہ تھی مسلمانوں کی عام ذہنیت جب مولانا آزاد نے الہلال جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا تصور ہمارے ذہن سے محو ہو گیا اور ہم سوچنے لگے کیا یہ آواز ہماری ہی دنیا کے کسی انسان کی ہے۔ کیا یہ زبان ہمارے ہی ابنائے جنس میں سے کسی فرد کی زبان ہے۔

ڈاکٹر طہٰ حسین نے اپنی مشہور کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" میں صدر اسلام کی حکومت پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ ملوکیت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ شخصی استبداد کا اس میں مطلقاً گزر نہ تھا۔ ہم اسے ارستقراطیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ارستقراطیت یا جماعت اشراف کی کوئی حکومت دنیا میں ایسی نظر نہیں آتی جس نے سماجی مساوات اور عدل و انصاف کی اتنی سخت پابندی کی ہو جتنی اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں کی گئی۔ ہم اسے ڈماکریسی یا جمہوریت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ خلفاء اسلام کا انتخاب جمہور کی رائے سے نہ ہوتا تھا۔ ہم اسے اشتراکیت یا اشتمالیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس نے شخصی و انفرادی رائے کی آزادی کو نہیں چھینا۔ اس لیے ہم یہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ ابتداء عہد اسلام کی حکومت خالص عربی اسلامی حکومت تھی جو خود مسلمانوں ہی نے وضع کی اور جس کی نوعیت حکومت کی تمام دوسری حکومتوں سے بالکل علیحدہ تھی۔

میں جس وقت مولانا ابو الکلام کی صحافت پر غور کرتا ہوں تو میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا ہوں کہ وہ مغربی انداز کی صحافت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ اس میں شانِ خطابت قطعاً نہیں ہوتی۔ مشرق میں البتہ بعض عربی رسائل و اخبارات کا لب و لہجہ خطیبانہ ہوتا ہے۔ لیکن ان میں وہ تنوع نہیں پایا جاتا جو الہلال میں نظر آتا ہے۔ خود ہندوستان میں البتہ زمیندار ایک بلند بانگ اخبار تھا، لیکن اس میں الہلال کی سی گہرائی، سنجیدگی اور علمی وزن کا فقدان تھا۔ مسلم گزٹ کے لب و لہجہ میں بے شک ایک قطعیت تھی لیکن اس کا خطاب صرف عوام سے تھا عوام ہی کی زبان میں، اور کوئی دوسری خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس لیے مولانا آزاد کی صحافت کے متعلق

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

بھی ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی زبان میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی صحافت خود ان کی اپنی صحافت تھی جسے خود انھوں نے ایجاد کیا اور جو انھیں کے ساتھ ختم ہوگئی۔

مولانا نے الہلال بہت سوچ سمجھ کر جاری کیا تھا اور ملک کے حالات کے نہایت غائر مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ وہ یہ فیصلہ تو الہلال کے اجراء سے قبل ہی کر چکے تھے کہ ملک کو آزاد ہونا چاہیے۔ اور فرنگی تسلط کو ختم، لیکن اسی کے ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنا بچوں کا کھیل نہیں اور یہ وہ راہ ہے جس میں "شرط اوّل قدم آن ست کہ مجنوں باشی" وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک ملک میں اجتماعی حیثیت سے ایک عام و مشترک جذبۂ وطنیت پیدا کر کے مذہب و ملت کے اختلاف کو نہ مٹایا جائے حصول مقصود ممکن نہیں۔ ملک کی آئندہ سیاست کا جو نقشہ ان کے سامنے تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ تعمیر سے پہلے عمل تخریب سے کام لیا جائے۔ کیونکہ مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ جب کوئی ڈھانچا اتنا بگڑ جائے کہ اس کی اصلاح و مرمت ممکن نہ ہو تو ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے اس ڈھانچے کو توڑ دیا جائے اور پھر از سر نو تعمیر کی جائے۔ وہ پرانے مٹے ہوئے نقوش اور کج مج خطوط پر تعمیر کے قائل نہ تھے بلکہ وہ ان کو مٹا کر نئی داغ بیل پر عمارت قائم کرنے کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب ذہن انسانی رسوم و روایات سے اس حد تک داغدار ہو جائے کہ اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تو بہتر صورت یہی ہے کہ پہلے اس کے پرانے نقوش کو مٹایا جائے اور ذہن و دماغ کو صفحۂ سادہ بنا کر اس پر دوسرے نقوش قائم کیے جائیں۔

یہی وہ اصول کار تھا جس کے پیش نظر انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے ذہن سے سید احمد خانی نقوش مٹانے کی کوشش کی کیونکہ وہ جانتے تھے ہندوستان اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک یہاں کی تمام آبادی بلا امتیاز ملت و مذہب، بلا امتیاز نسل و رنگ کسی ایک غرض مشترک پر متحد و متفق نہ ہو جائے اور یہ اشتراکِ ذہن و عمل ممکن نہ تھا جب تک مسلمان ہندوؤں سے کٹ کر اپنے جداگانہ مستقبل کی تعمیر کا خیال ترک نہ کر دیں اور اس راہ میں سب سے وزنی پتھر وہی ذہنیت تھی جس نے مسلمانوں کو انگریز کے رحم و کرم پر جینا سکھایا اور جو باوجود تلخ تجربات کے اب تک اپنے جذبات نیایش ہی کو حصول مقصود کا صحیح ذریعہ سمجھتے تھے۔

پھر آپ الہلال کے دورِ اوّل کے پرچے اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مولانا نے کس کس پہلو اور کن کن زاویوں سے اس ذہنیت کو توڑنا چاہا اور وہ کس حد تک اس میں کامیاب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتے۔ جیساکہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں یہ زمانہ بڑی آپا دھاپی کا زمانہ تھا۔ سخت ذہنی خلجان کا دور تھا اور مولانا کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ان غیر ملکی مسائل کو نظر انداز کر دیتے جس سے براہ راست یا بالواسطہ مسلمانوں کے اذہان متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اصل مقصد کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ انھوں نے طرابلس وبلقان کے مسائل پر بھی مجاہدانہ گفتگو کی، ترکی کی اندرونی کشاکش، اور اس کے خونچکاں انقلابات پر بھی واضح روشنی ڈالی اور جب مسجد کانپور کا حادثہ پیش آیا تو اس پر بھی اپنے قلم کی پوری قوت صرف کر دی۔ پھر یہ سب کچھ اس لیے نہ تھا کہ وہ مسلمان تھے اور ان مسائل کا تعلق اسلام واسلامیات سے تھا بلکہ اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ جب کسی قوم پر بیرونی قوتیں مسلط ہو جاتی ہیں تو اس قوم کا کیا حشر ہوتا ہے اور اسے کتنے ذہنی وجسمانی دُکھ جھیلنا پڑتے ہیں۔

مولانا کے سامنے ہی کانگریس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا اور وہ اس کے عزائم واقدامات سے بے خبر نہ تھے۔ اسی طرح وہ مسلم لیگ اور اس کے نصب العین سے بھی واقف تھے اور چاہتے تھے کہ یہ دونوں ادارے کسی طرح ایک ادارہ میں تبدیل ہو جائیں اور مسلم لیگ بھی کانگریس کے اصول پر اپنا لائحہ عمل مرتب کرے۔ چنانچہ الہلال کا اوّلین دور اسی سعی وکوشش کا دور تھا کیونکہ ان کی انتہائی خواہش یہ تھی کہ وہ کانگریس میں تنہا شریک نہ ہوں۔ بلکہ اپنی ساری قوم کو ساتھ لے کر شریک ہوں۔ لیکن وہ اس میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکے اور مجبوراً انھیں تنہا کانگریس میں شامل ہونا پڑا۔

مولانا ابناء ملک اور بالخصوص مسلمانوں کے ذہن تک جن جن راہوں سے پہنچنا چاہتے تھے ان میں سب سے زیادہ واضح اور روشن راہ مذہب کی تھی۔ چنانچہ آپ الہلال کا فائل اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ دنیاوی سیاست کی تعلیم کے سلسلہ میں ذہنی واخلاقی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کی تائید میں انھوں نے قرآنی دلائل پیش نہ کیے ہوں اور مسلمانوں کی ہدایت کے لیے احکام الٰہی کی حجت سے کام نہ لیا ہو۔

دوسری راہ جو مسلمانوں کے کلچر اور فطری ذوق کے لحاظ سے ان کے لیے زیادہ قابل قبول ہو سکتی تھی ادب وانشا کی راہ تھی۔ سو اس باب میں بھی الہلال کی یہ خصوصیت کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اس نے اتنا بڑا ذخیرہ شعروادب کا فراہم کر دیا کہ اگر آج تمام مشہور شعراء فارسی کا کلام دنیا سے محو ہو جائے تو بھی اس کا ایک بڑا ستھرا انتخاب آپ الہلال کی مدد سے پیش

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر سکتے ہیں۔

مولانا کی صحافتی عظمت کا تعلق کسی ایک چیز سے نہ تھا بلکہ اس کی تشکیل متعدد عناصر سے ہوئی تھی جن میں ایک بڑا زبردست عنصر ان کی غیر معمولی قوتِ حافظہ تھی۔

غالباً ۱۹۱۵ء کی بات ہے کہ انھوں نے مجھے کلکتہ سے دہلی جاتے ہوئے تار دیا کہ میں ان سے دہلی میں ملوں۔ وہ حاذق الملک حکیم اجمل خاں کے صاحبزادہ جمیل میاں کی تقریب شادی میں شرکت کی غرض سے دہلی آرہے تھے۔ یوں تو باہمی مراسلت اور میری نظموں کے ذریعہ سے جو الہلال میں شائع ہوتی رہتی تھیں میں مولانا سے غیر متعارف نہ تھا لیکن ذاتی ملاقات کا موقع نصیب نہ ہوا تھا۔ میں اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر فتح پور سے دہلی پہنچا اور کامل ایک ہفتہ تک ان کی معیت کی سعادت مجھے نصیب ہوئی۔ اس دوران میں ادب مذہب و سیاست سے متعلق کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر مولانا سے تبادلۂ خیال کا موقع مجھے نہ ملا ہو اور میں ان کی قوتِ حافظہ و استدلال کو دیکھ کر دنگ نہ رہ گیا ہوں۔

ایک بار حکماء اسلام کے سلسلہ میں ابن طفیل کا ذکر آگیا تو مولانا نے اس کی مشہور کتاب "حیّ بن یقظان" کی پوری داستان ایک نشست میں اس طرح سنا دی گویا وہ اس کے حافظ تھے۔

ایک دوسری صحبت میں جو سیاست سے شروع ہوئی اور ادب پر ختم ہوئی اس سے زیادہ دلچسپ تھی۔ انسان کے فطری احساس آزادی اور ضمیر انسانی کی بے اختیار پکار کے سلسلے میں، میں نے کہا کہ اس کے مظاہر انتہائی متضاد ماحول میں کبھی کبھی سامنے آجاتے ہیں۔ عُرفی مدحیہ قصیدہ لکھتا ہے اور جب وہ ذہن انسانی کا تجزیہ قسمیہ اشعار کے ذریعہ سے کرتا ہے تو ایک شعر بے اختیار اس کے قلم سے ایسا بھی نکل جاتا ہے جسے عہدِ حاضر کی اشتراکیت پسندی اور سرمایہ عمل کے تصادم کی بنیاد کہنا چاہیے۔ کہتا ہے ؎

بزورِ بازوِ پُر کاسیان ضعیف
بہ چین ابروِ بے وجہہ خواجگانِ کبار

حیرت ہے کہ مغلیہ دورِ ملوکیت و استبداد میں یہ خیال عرفی کے ذہن میں آئے یہ سُن کر مولانا کے چہرہ پر ایک رنگ آگیا اور وہ اس موضوع پر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ناگہاں ایک صاحب اور آگئے اور مولانا نے گفتگو کا سیاسی پہلو بدل کر اسے ادبی رنگ میں تبدیل کردیا اور فرمایا کہ اس میں شک نہیں عرفی کا یہ قصیدہ اس کا شاہکار ہے اور اس کے تمام قسمیہ اشعار اس طرح سنانا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شروع کیے گویا کتاب ان کے سامنے کھلی رکھی تھی۔

مولانا کا حافظہ اس میں شک نہیں عجیب و غریب خداداد ودیعت تھی اور مولانا کی صحافتی و علمی زندگی کی کامیابی بہت کچھ اسی انعام خداوندی کی ممنون تھی۔ اسی کے ساتھ دوسری خصوصیت جس نے الہلال کو معراج کمال تک پہنچایا وہ مولانا کا مخصوص اسلوبِ تحریر تھا۔ بہت کم ایسا دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص تحریر و تقریر دونوں پر یکساں قدرت رکھتا ہو لیکن وہ اس باب میں "ذوالریاستین" ہونے کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا کے اسلوبِ تحریر و تقریر کی دو خصوصیتیں ایسی تھیں جو کبھی ان سے منفک نہیں ہوئیں۔ ایک اس کی بلند ادبیت، دوسری اس کی شانِ خطابت کہ جب ہم الہلال کو پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بلند منارہ پر کھڑا ہوا پُرجوش خطبہ دے رہا ہے اور ایک بے پناہ ذخیرہ الفاظ کا اس کے پاس ہے جسے وہ موتیوں کی طرح بکھیرتا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں مولانا ایک ایسی عجیب و غریب طرزِ تحریر کے موجد و مخترع تھے کہ نہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال دیکھنے میں آئی اور نہ اس کے بعد کوئی شخص اس کی تقلید کی جرأت کر سکا۔

الہلال کے بعد جب مولانا نے البلاغ جاری کیا تو اس کا نصب العین بھی وہی تھا جو الہلال کا لیکن طریق ابلاغ کچھ مختلف تھا تیور وہی تھے لیکن رُخ دوسرا تھا، اندازِ قد وہی تھا مگر لباس بدلا ہوا تھا۔ الہلال نفسیاتِ عملی کا درس تھا اور البلاغ نفسیات ذہنی کا، الہلال حرکتِ عمل، جوش و ولولہ کا پیام رساں تھا اور البلاغ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا الہلال کا پیام تھا:

"شیر شو، شیرانہ در صحرا سے شیراں پائے نہ"

اور البلاغ کا: "جلوہ بر خود کن و خود را بہ نگاہے دریاب"

الہلال۔ خونِ منصور کی شعلہ آہنگی تھی اور دعوتِ دار و رسن، البلاغ بشارت روحانی تھی اور پیام طاغوتیت شکن۔

الہلال۔ عرفی کی زبان میں نوید سرفروشی تھا کہ

بدو پیالۂ خونیں بخر زِ قصا بان ۔۔۔ مشو گدائے شبانان کہ شیر می دوشند

اور البلاغ۔ بیدل کی زبان میں پیام تھا "دمے بہ جگر جمع کن و برون آ"، کا الہلال ایک کھلا ہوا چیلنج تھا۔ ایک بے باکانہ اعلان کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نازک دلانِ باغِ تو چوں شبنم سحر   بر روے برگِ گل شکنند آبگینہ ہا

اور البلاغ نہایت بلیغ درس تھا اس حقیقت کا کہ

دلِ گم گشتہ سراغے ست زکیفیتِ شوق   نشہ بالا اگر از دست رود شیشۂ ما

بات وہی ایک تھی لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ الہلال نے دامنِ کتاں چاک کیا اور البلاغ نے اس چاک سے نظارۂ پرتو ماہ کی دعوت دی۔

الہلال مولانا کی تمام خصوصیات ذہنی کا ایک ایسا رنگین دستۂ گل تھا جو بیک وقت اخبار بھی تھا اور قدرِ اوّل کا میگزین بھی، جس میں سیاسی مقالات، علمی و تاریخی مضامین، مذہبی و ادبی مباحث، مطائبات، منظومات الغرض وہ سب کچھ پایا جاتا تھا جس سے ہر ذوقِ انسانی آسودہ ہو سکتا ہے۔ اور جو اپنے بعد ایسا خلا چھوڑ گیا جس کا پُر ہونا ممکن نہیں اور البلاغ ایک مذہبی تبلیغی آرگن تھا جس کا خطاب زیادہ تر مسلمانوں سے تھا تاکہ ان کے ذہن و دماغ سے رسم و روایات کے نقوش محو کر کے ان کو صحیح تعلیم قرآنی سے آشنا کیا جائے اور وہ سمجھ سکیں کہ اسلام کا حقیقی مقصود انسانیت پرستی کے سوا کچھ نہیں اور جو بادرا، دیر و حرم" ہر جا کنیم بداں آستاں رسد" کا مبلغ ہے۔

اس طرح ہم مولانا کے زمانِ صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو لسان الصدق، اخبار وکیل اور الندوہ سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا دور الہلال کا اور تیسرا البلاغ کا۔ دورِ اوّل خالص ادبی و علمی تھا۔ دوسرا سیاسی اور تیسرا مذہبی و اصلاحی اور ان تینوں زمانوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کی انفرادیت و "انائیت" کا بڑا زبردست مظاہرہ تھا۔ میں نے "انائیت" کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ ان تحریروں میں جو خود اعتمادی و کیفیت ایقان پائی جاتی تھی وہ صرف لفظ "انائیت" ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ جس میں منطقی چوں و چرا اور استدلالی "این و آں" کی کوئی گنجایش نہیں۔

مولانا کے دینی و علمی مقالات کا فاضلانہ لب و لہجہ، سیاسی مضامین کا مجاہدانہ و قائدانہ انداز، مذہبی افکار کا حکیمانہ اسلوب اور اسی کے ساتھ ان کی خطیبانہ بلند آہنگی، سر عسکرانہ رجز خوانی، مردِ مجاہد کا سا اذعان و ایقان، کاہنوں کا سا وزن و وقار، جس نے ہم کو نیا ولولۂ حیات، نیا جوشِ زندگی بخشا، اب کہاں؟

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت

مولانا عبدالسلام قدوائی

تحریک ترک موالات کے شباب کا زمانہ تھا، میری عمر اس وقت ۱۳ سال کے قریب رہی ہوگی، گاؤں گاؤں میں خلافت اور کانگریس کمیٹیاں قائم تھیں گاندھی جی اور علی برادران کا نام بچے بچے کی زبان پر تھا، ان کے ساتھ دوسرے رہنماؤں کے نام بھی لیے جاتے، میرے ایک ماموں عبدالحی تھے وہ مولانا آزاد سے بہت عقیدت رکھتے تھے، اصل معتقد تو وہ علامہ شبلی کے تھے لیکن چونکہ انھوں نے مولانا آزاد کو مولانا شبلی کی مجالس میں اکثر دیکھا تھا، اور ان کی زبان سے بارہا تعریف وتحسین کے کلمات سنے تھے اس لیے مولانا آزاد سے بھی ان کو بہت تعلق ہوگیا تھا پھر جب الہلال نکلا تو اس کے مطالعہ سے ان کی عقیدت میں مزید اضافہ ہوا، ان کے پُراثر مضامین اور سحر آفریں تقریروں کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے، کبھی کبھی الہلال کے مضامین پڑھ کر لوگوں کو سناتے بعض اوقات مجھ سے بھی پڑھواتے، اس زمانہ میں میں ساتویں درجے میں پڑھتا تھا، الہلال ٹائپ میں چھپتا تھا اور لوگ مشکل سے پڑھ پاتے تھے لیکن میرا سابقہ ٹائپ سے اسکول میں اس طرح ہو چکا تھا کہ جنگ عظیم کے زمانہ میں انگریزی حکومت کی طرف سے ہفتہ وار لڑائی کا اخبار شائع ہوا کرتا تھا جو ٹائپ میں چھپا ہوتا تھا، جس دن اخبار آتا ہیڈ ماسٹر صاحب تمام لڑکوں کو جمع کرتے اور کسی لڑکے سے اخبار پڑھواتے، اس طرح مجھے ٹائپ میں چھپی ہوئی تحریروں کو پڑھنے کی مشق ہوگئی تھی، اس بنا پر ماموں صاحب مجھے اکثر الہلال دے کر سنانے کا حکم دیتے اس وقت میری تعلیمی استعداد زیادہ نہیں تھی اس لیے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ الفاظ کو پورے طور پر سمجھتا تھا لیکن مجموعی طور پر مولانا کے زورِ بیان کا اثر ذہن پر ضرور پڑتا تھا۔ اس طرح مجھے بھی مولانا آزاد سے عقیدت پیدا ہوگئی اور تمنا ہونے لگی کہ ان کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہو۔

اب میں لکھنؤ آگیا تھا اور ندوہ میں پڑھنے لگا تھا، ایک دن غالباً اگست ۱۹۲۳ء

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں معلوم ہوا کہ آج شام کو رفاہِ عام کے ہال میں مولانا آزاد کی تقریر ہوگی میں بہت خوش ہوا کہ دلی تمنا بر آئی وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی جلسہ میں پہنچ گیا یہ وہ زمانہ ہے کہ تحریک ترک موالات کا اثر کم ہونے لگا تھا اور ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی بجائے اختلاف کی فضا بڑھتی جا رہی تھی، انگریزوں کی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کامیاب ہو رہی تھی اور اتحاد و اتفاق کے نعروں کی بجائے ہر جگہ اختلافات کو ہوا دی جا رہی تھی جا بجا فرقہ وارانہ فسادات بھی ہونے لگے تھے، تحریک آزادی کے رہنما اصلاح حال کی کوششیں کر رہے تھے وہ چاہتے تھے کہ سنہ ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء کی متحدہ فضا پھر قائم ہو جائے لیکن فرنگی حاکموں نے اختلاف کی اس طرح تخم ریزی کی تھی کہ قومی رہنماؤں اور کارکنوں کی جدوجہد لاحاصل ہو رہی تھی اور سارے ملک میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس دن مولانا آزاد نے اسی موضوع پر تقریر کی اور واعیان اتحاد کو سمجھایا کہ اس صورت حال سے مایوس نہ ہوں آزادی کی راہ میں ایسے پیچ وخم آتے رہتے ہیں، ایسے مواقع پر قوم پرور رہنماؤں اور کارگزاروں کو ناامیدی کی بجائے عزم و حوصلہ سے کام کرنا چاہیے اس سلسلہ میں انھوں نے کلکتہ کے ایک خاندان کا حوالہ دیا کہ تیس برس کی طویل جدوجہد کے بعد ان کے اختلافات ختم ہو گئے پھر فرمایا کہ جب ایک خاندان کے درمیان صلح کرانے میں تیس برس صرف ہو سکتے ہیں تو قوموں اور ملکوں کا معاملہ تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے، مولانا کی تقریر بڑی پر زور اور موثر تھی اسے سن کر کارکنوں کی افسردگی دور ہوئی اور نئے جوش و ولولہ کے ساتھ ملک میں اتحاد کی فضا قائم کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

مولانا شروع سے ہندوستان کی آزادی کے علم بردار تھے، انھوں نے سنہ ۱۹۱۳ء میں لکھا تھا کہ "ایک چراغ جو روشن ہو کر پھر نہیں بجھتا وہ حریت صحیحہ کا چراغ ہے۔ مسلمان ہندوستان میں رہتے ہیں، ہندوستان کی خدمت ان کا دینی فرض ہے۔ جس کی بجا آوری لازم ہے انھوں نے جس جوش و ایثار سے جنگ طرابلس و بلقان اور مسجد کانپور کے معاملہ میں حصہ لیا تھا اس معاملہ میں بھی اسی طرح حصہ لیں۔ انسانیت اور حق و عدل کے پرستاروں کے لیے امتیاز این و آں نہیں ہے مسلمانوں کا نصب العین خدمت عالم ہے وہ انسانیت کے خادم ہیں ان کے لیے خدا کی زمین کا ہر ٹکڑا مقدس اور اس کے بندوں کا ہر گروہ محترم ہے"

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا بار بار کہتے تھے کہ آزادی کی ہوائیں ہر طرف چل رہی ہیں اور غلام قوموں نے تہیہ کر لیا ہے کہ غلامی کے طوق و سلاسل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینگے، یہ جذبہ نہ زور و قوت سے مٹ سکتا ہے اور نہ داد و دہش سے۔ آزادی کے متوالوں کو سیم و زر کے انبار متاثر کر سکتے ہیں، نہ جاہ و منصب کے وعدے انھیں راہ حق سے ہٹا سکتے ہیں، ظالم حکمران کے مظالم کی داستانوں سے تاریخ کے اوراق پُر ہیں، قید و بند، دار و رسن کسی تشدد سے کبھی حریت پسند مرعوب نہیں ہوتے اور بالآخر وہ وقت آگیا جب ظالموں کے تخت ہائے عظمت و جلال سرنگوں ہو گئے۔ اور مظلوموں نے آگے بڑھ کر حکومت کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ حق و باطل کی کشمکش کا ہمیشہ یہی انجام ہوا ہے، ممکن ہے ظالموں کی رسی کچھ عرصہ کے لیے دراز ہو جاتے لیکن وہ وقت ضرور آئے گا جب ظلم و ستم کا خاتمہ ہو جائے گا، ظالم فنا ہو جائیں گے اور عدل و مساوات کا دور دورہ ہو گا ایک موقع پر مسلمانانِ ہند کو مخاطب کر کے انھوں نے فرمایا جو سیاسی دور چند سال پیشتر تک تھا وہ گزر چکا ہے اب اس کی واپسی کی توقع فضول ہے، کسی شخص یا جماعت کے بس میں یہ بات نہیں ہے کہ آزادی کی تحریک کو روک دے آزادی تو حاصل ہو کر رہے گی جس کا جی چاہے اُس کے وابستگان کی فہرست میں اپنا نام درج کراتے اور جس کا جی چاہے مخالفت کی بدنامی مول لے، فتح و کامرانی آخر کار آزادی کے طلب گاروں ہی کی ہو گی۔

تحریک آزادی کی مخالفت میں برطانوی حکومت کے اشارے سے مذہبی حربہ استعمال کیا جا رہا تھا، اور مذہبی فرقوں کو ایک دوسرے کے خلاف مشتعل کر کے لڑانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ وطن دوستی اور قوم پروری کے خلاف نام نہاد پیشوایان مذہب احکام جاری کر رہے تھے لیکن مولانا نے ہمیشہ اس طرح کی تمام غلط بیانیوں کا پردہ فاش کیا اور ان غلط کار اشخاص کی غلطی واضح کی انھوں نے فرمایا کہ آزادی انسان کا فطری حق ہے کوئی مذہب اپنے پیروؤں کو اس حق سے محروم نہیں کر سکتا انھوں نے خاص طور سے مسلمانوں کو تلقین کی کہ ملک کی آزادی کے لیے جد و جہد تمہارا دینی فرض ہے اور یاد دلایا کہ ظلم و استبداد کو مٹا کر دنیا میں عدل و مساوات کو فروغ دینے کے لیے تم نے کیسی عظیم الشان جد و جہد کی ہے، تم نے دنیا کو جمہوریت صحیحہ کا چہرہ دکھایا تھا پھر آج لیت و لعل کیوں ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام اور نیشلزم کے عنوان سے الہلال (دور آخر ۱۹۲۷ء) میں ایک طویل مضمون لکھا جس میں یہ ثابت کیا کہ اسلام اور نیشلزم کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے وہ ہندستانی مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ان کے لیے ملک کی خدمت اور اس کی فلاح و بہبود کی فکر اسلام کا حکم ہے۔

رام گڑھ کے خطبۂ صدارت میں وضاحت سے بتایا کہ وطنیت اور اسلامیت کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے ایک مسلمان اپنی اسلامیت پر فخر کے ساتھ اپنے ہندوستانی ہونے پر بھی فخر کر سکتا ہے، جن لوگوں نے غور سے مولانا کی تحریریں نہیں پڑھی ہیں وہ الہلال والبلاغ کے ابوالکلام اور کانگریس کے صدر ابوالکلام کو ایک دوسرے سے مختلف سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر مولانا کا سارا لٹریچر وہ غور سے پڑھیں تو انھیں ان کی زندگی میں نہ تضاد نظر آئے گا نہ اختلاف بلکہ شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ ان پر چھایا ہوا محسوس ہوگا، مولانا کے یہاں دین و دنیا اور مذہب و سیاست کے علیحدہ علیحدہ خانے نہیں تھے، ان کی سیاست بھی مذہب ہی کی راہ سے آئی تھی، وہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں اس لیے لگے تھے کہ ان کے نزدیک یہ اسلام کی تعلیم کا تقاضا تھا وہ حکومت و سیاست کا کام ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے تھے۔

اسلام استبداد کو ناپسند کرتا ہے وہ کسی ایسے اقتدار کو گوارا نہیں کر سکتا جس سے خدا کے بندے آزادی کی نعمت سے محروم ہو کر غلامی میں مبتلا ہو جائیں۔ عہد فاروقی میں کسی حاکم نے اپنے ماتحتوں پر کچھ بے جا سختی کی حضرت عمرؓ نے اس کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :

" اللہ نے تو ان لوگوں کو آزاد پیدا کیا تھا تم نے انھیں غلام کب سے بنا لیا؟" حضرت عمرؓ کا یہ حریت آفریں قول ہمیشہ مولانا آزاد کے سامنے رہتا تھا اور وہ ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے تھے اور جہاں کہیں انسانیت غلامی کے شکنجے میں گرفتار نظر آتی تھی وہ بے چین ہو جاتے تھے وہ جس طرح ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے اسی طرح دنیا کے تمام ملکوں اور قوموں کی آزادی کے خواستگار تھے ایران ہو یا افغانستان، مصر ہو یا ترکی کہیں انھوں نے جابر حکمرانوں کو معاف نہیں کیا وہ جس زور شور سے برطانوی سامراجیت کے خلاف اظہار خیال کرتے تھے اسی قوت و شدت کے ساتھ سلطان عبدالحمید ناصر الدین

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قاچار، شریف حسین اور ان کے اعوان و انصار کے خلاف بیان دیتے تھے اور جو لوگ اس ظلم و استبداد کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے ان کی تائید اور ہمت افزائی کرتے تھے اسی نقطۂ نظر کے ماتحت انھوں نے سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، سعد زغلول، مصطفےٰ کامل، مدحت پاشا، محمود شوکت، انور پاشا، سید احمد شریف سنوسی، امیر عبدالقادر جزائری، عبدالعزیز ثعالبی وغیرہ علمبرداران حریت و استقلال کی حمایت کی۔ مولانا کی تمنا تھی کہ دنیا کے تمام مظلوم ظالم حکمرانوں سے نجات پائیں، ان کی غلامی کی زندگی ختم ہو اور وہ آزادی کی فضا میں سانس لیں۔ حق و باطل کے معرکہ میں مولانا ہمیشہ حق کی جانب رہتے تھے ان کو یقین تھا کہ باطل کے پاس خواہ کتنا ہی ساز و سامان ہو کیسے ہی دولت کے ڈھیر ہوں کتنی ہی طاقتور فوجیں ہوں اور ہلاکت خیز اسلحہ کے کیسے انبار ہوں لیکن اس کی قسمت میں ناکامی و نامرادی کے سوا اور کچھ نہیں اور حق کے لیے بے سر و سامانی کے باوجود فتح و کامرانی مقدر ہے وہ سمجھتے تھے۔

«الحق یعلو ولا یعلی» حق میں خود سربلندی کی صلاحیت ہے اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے وہ کہتے تھے کہ تاریخ کے اوراق کھلے ہیں جس کا جی چاہے حق و باطل کی کشمکش و انجام دیکھ لے بعض اوقات باطل اس ساز و سامان کے ساتھ میدان میں آیا کہ نگاہیں خیرہ ہو گئیں لیکن حق کی ایک ہی ٹکر نے اسے چور چور کر دیا تاریخ کے علاوہ قرآن مجید کے مطالعہ نے بھی ان کے اس یقین و اذعان میں اضافہ کر دیا تھا۔ قرآن مجید نے اقوام و ملل کی سرگزشت بڑی وضاحت سے بیان کی ہے اور حق و باطل کی رزم آرائیوں کے محیر واقعات سنائے ہیں اور بتایا ہے کہ حق جب سامنے آجاتا ہے تو باطل کو فرار پر مجبور ہونا پڑتا ہے حق کی ضرب سے باطل کا بھیجا نکل جاتا ہے اور وہ فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ کو دیکھ کر فرعون کہتا تھا کہ میں مصر کا فرماں روا ہوں میرے مقابلہ میں یہ مہین (بے حیثیت) جسے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے کیسے غالب آسکتا ہے اور طاقت سے مرعوب درباری اور مصاحب تائید کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ دم بھر میں انھیں پلیس کر رکھ دیں گے لیکن پھر کیا ہوا صاحب تاج و تخت فرعون اور اس کے حمایتی فنا ہو گئے اور بے حقیقت اسرائیلی ساری مملکت کے مالک ہو گئے ہمارے سامنے کی بات ہے کہ بہت سے لوگوں کو یقین نہ آتا تھا کہ انگریز مغلوب ہو سکتے ہیں وہ کہتے تھے جن کے پاس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لاتعداد فوجیں ہیں، عظیم الشان جنگی بیڑہ ہے، کثیر التعداد ہوائی جہاز اور بے شمار اسلحہ ہیں کس طرح ممکن ہے کہ وہ نہتے ہندوستانیوں سے شکست کھا جائیں لیکن مولانا تاریخ عالم اور صحف سماوی کی روشنی میں یقین رکھتے تھے کہ انگریزوں کا سارا جاہ و جلال دھرا کا دھرا رہ جائے گا اور ایک دن بے سر و سامانی کے باوجود ہندوستانی غالب آجائیں گے۔ لوگ کہتے تھے کہ شیشہ و سنگ کے تصادم میں شیشہ چور چور ہو جائے گا لیکن مولانا فرماتے تھے کہ حق کی طاقت شیشہ کو وہ قوت عطا کردے گی کہ اس سے ٹکرا کر پتھر کیا لوہا بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ چند ہی برس میں مولانا کی دور بینی اور روشن ضمیری عیاں ہو گئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ با ایں ہمہ جاہ و جلال اور عظمت و جبروت انگریزی حکومت سرنگوں ہو گئی اور یونین جیک کی جگہ قومی جھنڈا لہرانے لگا۔

مولانا کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی تمام قومیں متحد رہیں اور انگریزوں کے جانے کے بعد سب مل جل کر حکومت کا انتظام سنبھالیں لیکن ساحرانِ فرنگ نے کچھ ایسا افسوں پھونکا کہ حقائق نگاہوں سے اوجھل ہو گئے عقل دور بین جذبات کے وقتی پردوں میں دب گئی ظنون و اوہام نے اعصاب کو مجہول کر دیا اور تابناک مستقبل پر خوف کا ایسا سایہ پڑ گیا کہ ایک گروہ نے علیٰحدگی ہی میں عافیت محسوس کی مولانا نے بہت سمجھایا، مستقبل کے نقشے کھینچ کر دکھا دیے اور اطمینان دلانے کی پوری کوشش کی مگر فرنگیوں کا جادو کسی طرح نہ اُترا اور ایک چھوٹا سا حصہ ملک سے الگ ہو گیا۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۶ء میں مولانا کسی کام سے لکھنؤ آئے تھے کارلٹن ہوٹل میں قیام تھا خبر ملی تو میں بھی ملاقات کے لیے گیا صبح کا وقت تھا اطلاع کرائی تو بلا لیا کچھ اور اشخاص بھی آگئے باتیں ہونے لگیں میری عادت تھی کہ سیاسی معاملات کے بجائے علمی مسائل پر گفتگو کرتا تھا قرآن مجید پر مولانا کی نظر بہت گہری تھی زیادہ تر اسی کے متعلق سوالات کرتا تھا اور مشکل آیات کے بارہ میں ان کا نقطۂ نظر معلوم کرتا تھا لیکن فضا ایسی سیاست آلود تھی کہ دوسرے لوگوں نے مجھے اس کا موقع نہ دیا اور ملک کے موجودہ حالات، ان کے علل و اسباب اور مستقبل کے امکانات پر گفتگو چھیڑ دی مولانا نے صورت حال سمجھائی، مسلم لیگ کے شبہات کا ذکر کیا، کانگریس کے نقطۂ نظر کی تشریح کی اور اپنی وہ تجاویز بتائیں جن پر عمل کر کے ملک تقسیم سے بھی محفوظ رہ سکتا تھا مسلمانوں کو جو خطرات محسوس ہوتے تھے ان کا سدباب بھی ہو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکتا تھا اور اکثریت و اقلیت دونوں ایک ہی ملک میں امن و اطمینان کے ساتھ رہ سکتی تھیں اور ملک کا انتظام بھی حسن و خوبی کے ساتھ چل سکتا تھا یہ پلان بہت واضح اور اس کے فوائد نمایاں طور پر نظر آرہے تھے لیکن عقلیں کچھ اس طرح پروپیگنڈے کا شکار تھیں کہ ایک صاحب نے کہا مولانا! یہ تدبیریں کافی نہیں ہیں موجودہ حالات میں تقسیم ناگزیر ہے مولانا نے فرمایا آپ کی تجویز اس سے زیادہ خطرناک ہے تقسیم کے عمل جراحی سے ملک کو جو صدمہ پہنچے گا وہ تو پہنچے ہی گا لیکن ملک کے باشندوں کے سر پر بھی ایسی قیامت گزر جائے گی جس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کروڑوں آدمی گھر سے بے گھر ہو جائیں گے اربوں کی جائداد تباہ ہو جائے گی، تجارت و کاروبار تہس نہس ہو جائے گا اور وہ خون خرابہ ہوگا جس کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں آج مسلمانوں کو جو سبز باغ دکھایا جا رہا ہے آئندہ کہیں اس کا پتا نہیں ہوگا اور اسلامی حکومت کا جو خواب وہ دیکھ رہے ہیں جب آنکھ کھلے گی تو اس کی تعبیر معکوس نظر آئے گی اس وقت یہ ایسے جوش کے عالم میں ہیں کہ اپنے دوستوں اور خیر خواہوں کو نہیں پہچانتے ہیں لیکن کل جب اس کے ہولناک نتائج ان کے سامنے آئیں گے تو انہیں ہوش آئے گا کہ کتنی بڑی غلطی انھوں نے کی ہے اس وقت جو لوگ بڑھ کر باتیں کر رہے ہیں اور ان کی تائید و نصرت اور حفاظت و اعانت کا اعلان کرتے ہیں کل ان کا کہیں پتا نہیں ہوگا وہ انھیں جہنم کے حوالہ کر کے جنت کی ہوا کھا رہے ہوں گے افسوس ہے کہ مسلمان مخلص و خود غرض اشخاص کے درمیان فرق نہیں کر پاتے کاش انھیں نظر آجاتا کہ لوگ ان کی لاشوں پر اپنے محل تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف ثابت ہوئی کروڑوں اشخاص تباہ و برباد ہو گئے جان و مال اور عزت و آبرو کی ایسی بربادی ہوئی کہ جس کا کبھی کسی نے تصور بھی نہ کیا تھا اور ایسی خوں ریزی ہوئی کہ الامان والحفیظ پھر اس ساری تباہی کے باوجود کچھ حاصل نہ ہوا اسلامی حکومت کا کیا ذکر ہے پائدار، مستحکم اور پُر امن حکومت کے لیے بھی سرحد پار کر کے لوگ ترس گئے اسلام پسندوں کا جو حشر ہوا اس کی سرگزشت بڑی ہی عبرت انگیز ہے۔ حریت نوازوں کا حال بھی عیاں ہے۔ تقسیم کی حمایت میں اعلان کیا جاتا تھا کہ اس سے مسلمانوں کا ایک ذہن بن جائے گا اس غرض سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے مسلمانوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان کا رُخ کیا لیکن آج ان مہاجروں سے پوچھیے کہ یہ سودا کتنا گراں پڑا جن کی تائید و نصرت کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھروسہ پر وطن ترک کیا تھا ان کی نصرت کی امید موہوم ثابت ہوئی زبان، تہذیب اور نسل و خون کے جھگڑے اس شدت سے اٹھے کہ کبھی ہندوستان میں اس کا تصور بھی نہیں کیا گیا تھا بنگالی بہاریوں کے دشمن ہو گئے سندھی یوپی والوں سے خار کھانے لگے تقسیم نے پے بہ پے تقسیم در تقسیم کی شکل اختیار کی مشرقی بنگال سے جان بچا کر بھاگنا مہاجروں کو دشوار ہو گیا اس کے باوجود ہنوز اطمینان نہیں ہے اور مستقبل مزید خطرات سے لبریز نظر آتا ہے

آج مولانا یاد آتے ہیں اگر ان کا مشورہ مان لیا گیا ہوتا اور تقسیم کی بجائے ان کا متحدہ ہندوستان کا پلان تسلیم کر لیا جاتا تو برصغیر کی تاریخ کچھ اور ہوتی اور دو عظیم الشان قوموں کے اتحاد سے سارے عالم کی قومیں اتحاد کے مضبوط رشتے میں منسلک ہو جاتیں اور ساری دنیا آفات و مصائب کی بجائے اخوت و محبت اور امن و سکون کی فضائیں ترقی کی منزلیں طے کرتی۔

۷۲ء کے موسم حج میں کچھ ہندوستانی اور پاکستانی احباب مکہ معظمہ میں اکٹھا تھے ماضی قریب کے واقعات پر تبصرہ ہونے لگا اس موقع پر ایک مورخ دوست نے فرمایا کہ تاریخ قوموں کی غلطیوں کا فیصلہ صدیوں میں کرتی ہے لیکن ہندوستان کی تقسیم کی غلطی ۲۵ برس کے اندر ہی واضح ہو گئی۔

اس غلطی کے اعتراف کے بعد مولانا آزاد کی دوربینی اور سیاسی بصیرت کا اعتراف لازمی تھا سب کے دل ان کی عظمت کے احساس سے لبریز تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد کا سیاسی کارنامہ

ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی

مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات میں قدرت نے بیک وقت اتنی خصوصیات جمع کر دی تھیں۔ جن کا ظہور کسی ایک شخصیت میں نادر الوجود ہے۔ وہ خطیب بھی تھے اور ادیب بھی، عالم دین بھی تھے اور صحافی بھی، مفکر بھی تھے اور مدبر بھی، عملی سیاست دان بھی تھے اور مفسر قرآن بھی۔ پھر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان کی کون سی خصوصیت باقی سب خصوصیتوں پر حاوی تھی۔ اس بارے میں مختلف لوگوں کی رائیں مختلف ہیں۔ تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ خطابت ہو یا انشاپردازی، صحافت ہو یا تفسیر نویسی ان کی اہمیت کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا دشوار ہے کہ ان میدانوں میں کسی شخص نے جو کارنامہ انجام دے دیا ہے وہ حرفِ آخر ہے اور اب اس پر اضافے کا امکان نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ "الہلال" اور "البلاغ" کے بعد کم سے کم اردو میں آج تک اس پائے کا کوئی اور جریدہ شائع نہیں ہوا ہے، یہ بھی درست ہے کہ "ترجمان القرآن" کا قرآن مجید کے تفسیری لٹریچر میں بہت اونچا مقام ہے اور اردو میں تو میرے نزدیک اس سے عظیم تر تصنیف تا حال وجود ہی میں نہیں آئی ہے۔ اہل نظر ہمیشہ اس کا ماتم بھی کرتے رہیں گے کہ یہ تفسیر اپنی مکمل صورت میں ہماری نظروں کے سامنے نہیں آسکی، بااین ہمہ میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا ادب و صحافت یا تفسیر نویسی کے میدانوں میں بہرحال اس کی گنجایش ہے کہ قدرت اپنی فیاضانہ بخششوں سے کام لے کر کل کوئی دوسرا "ابوالکلام" پیدا کر دے جو اس کمی کو پورا کر سکے۔ لیکن ایک میدان اور ہے اور اس میدان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا کارنامہ ایسا ہے جس کے دوبارہ ظہور میں آنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ میدان ہے سیاسی فہم و تدبر کا اور وہ کارنامہ ہے ہندوستانی قومیت کو مستحکم کرنے کا۔ یہ بات میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ اب وہ حالات پیش ہی نہیں آئیں گے جن میں وہ کارنامہ انجام پذیر ہوا۔ تاریخ کا وہ موڑ گزر چکا ہے اور اب تاریخ اپنے کو اس طرح کبھی نہیں دہرائے گی جس میں ابوالکلام کی سیاسی فراست کا امتحان ہو گا۔

یہ ہندوستان کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اپنی تحریک آزادی کے دوران میں کئی ایسی قد آور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شخصیتیں میسر آئیں جن کا مثیل کسی اور جگہ ملنا دشوار ہے لیکن اگر معیار کی بلندی کو پوری طرح پیش نظر رکھ کر ایسی شخصیتوں کی کھوج لگائی جائے جنھوں نے اس میدان میں ہمیشہ باقی رہنے والا کارنامہ انجام دیا تو میری ناچیز رائے میں تعداد چار، پانچ سے آگے نہیں بڑھے گی (اور کسی ملک کے لیے یہ تعداد بھی کم نہیں ہے)۔ اس ضمن میں میرے ذہن میں سب سے پہلا نام لوکمانیہ تلک کا آتا ہے۔ لوکمانیہ تلک کے سیاسی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے ہماری قومی تحریک غیر ملکی حکومت کے سامنے عرض معروض کرنے کے اسٹیج سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ انھوں نے اسے پہلی دفعہ انقلابی رنگ و آہنگ عطا کیا۔ گاندھی جی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہماری قومی تحریک کو عوامی تحریک بنایا اور اس کا رشتہ دیہات میں رہنے والے لنگوٹی بند کسانوں سے جوڑا نیز اسے ایک مستقل فلسفہ اور ایک مستقل تیکنیک عطا فرمائی۔ مولانا آزاد نے اس تحریک کو صحیح معنی میں قومی تحریک بنایا کیوں کہ ہندستان میں کوئی تحریک اس وقت تک قومی تحریک بن ہی نہیں سکتی تھی جب تک اس میں ہندؤوں کے دوش بدوش مسلمان بھی شریک نہ ہوتے۔ مولانا آزاد نے یہ کارنامہ کس طرح انجام دیا اس کی تفصیل آگے آئے گی لیکن یہاں اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ مولانا آزاد کے ساتھ اس جدوجہد میں مولانا محمد علی برابر کے شریک تھے۔ البتہ یہ بڑا افسوس ناک واقعہ ہے کہ آگے چل کر مولانا محمد علی قومی دھارے سے کٹ گئے اور مسلمانوں کو قومی تحریک سے وابستہ رکھنے کی ذمہ داری تنہا مولانا آزادؒ کی رہ گئی۔ جب میں یہ عرض کرتا ہوں تو میرا مقصد دوسرے نیشنلسٹ رہنماؤں خصوصاً جمعیۃ العلماء کی خدمات کو نظر انداز کرنا نہیں ہوتا ہے لیکن میں یہ کیوں سمجھتا ہوں یہ بھی آگے چل کر عرض کیا جائیگا۔ اس فہرست میں آخری (لیکن مرتبے میں کسی سے کم نہیں) نام پنڈت جواہر لال نہرو کا ہے۔ جنھوں نے ہماری تحریک کو جدید ذہن عطا کیا، اس کا تعلق دوسرے ملکوں کی قومی تحریکوں سے استوار کیا اور حصول آزادی کے بعد ہندوستان کا جو سیاسی اور اقتصادی نقشہ بننے والا تھا اس میں سب سے پہلے رنگ بھرنے کی کوشش کی۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنے سیاسی سفر کا آغاز ۱۹۱۲ء میں کر دیا تھا جب انھوں نے کلکتہ سے "الہلال" جاری کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۴ سال تھی اور جب ۱۹۵۸ء میں ستر سال کی عمر میں ان کی وفات ہوئی اس وقت تک وہ اسی راستے پر گامزن رہے جو ۴۶ سال قبل انھوں نے اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ راستہ ہندستان کی آزادی (جس کی تکمیل مولانا کی زندگی ہی میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سنہ ۱۹۴۸ء میں ہو گئی تھی) اور ہندو مسلم اتحاد کا راستہ تھا لیکن ان کے ذہن میں ہندوستان کا جو نقشہ تھا اس میں ہندو مسلم اتحاد کو آزادی پر بھی فوقیت حاصل تھی کیوں کہ انہوں نے خود فرمایا تھا کہ "اگر بادلوں سے اتر کر ایک فرشتہ قطب مینار کی چوٹی پر کھڑا ہو جاتے اور یہ اعلان کرے کہ ہندوستان کو آزادی آج ہی مل سکتی ہے بشرطیکہ وہ ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں آزادی سے دستبردار ہو جاؤں گا لیکن ہندو مسلم اتحاد کو نہیں چھوڑوں گا کیونکہ اگر ہمیں آزادی نہ ملی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہندو مسلم اتحاد قائم نہ رہ سکا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔" "الہلال" کا بنیادی پیغام یہی تھا اور اس کے بارے میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی جیسے عالم دین نے فرمایا تھا کہ ہم اپنا سبق بھولے ہوئے تھے جو ہمیں "الہلال" نے یاد دلا دیا مولانا محمود حسن کے اس بیان پر غور فرمائیے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ میرے اس دعوے میں کہاں تک صداقت ہے کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت کو استحکام بخشنے میں سب سے بڑا کارنامہ مولانا آزاد نے انجام دیا ہے۔

"الہلال" کے اجرا سے پہلے مولانا آزاد بنگال کے دہشت پسندوں سے متاثر رہے تھے لیکن یہ نوجوانی کا ابال تھا جو جلدی ہی بیٹھ گیا۔ البتہ اس دوران میں بھی انھوں نے یہ عظیم خدمت انجام دی کہ ان دہشت پسندوں کو مسلمانوں کی طرف سے جو بے اعتمادی اور شکوک تھے اور جو نتیجہ تھے مسلمانوں کے سیاست سے دور رہنے کا انہیں اپنی ذاتی مثال سے بڑی حد تک رفع کر دیا۔ مولانا آزاد کی سیاسی زندگی میں سب سے بڑا موڑ اس وقت آیا جب وہ سنہ ۱۹۲۰ء میں رانچی کی نظر بندی سے رہا ہونے کے بعد دہلی میں پہلی دفعہ گاندھی جی سے ملے۔ یہ صحیح معنی میں کعبہ و کاشی کا قران السعدین تھا اور اس نے ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔ اسی ملاقات کے بعد گاندھی جی نے تحریکِ خلافت کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا اعلان فرمایا اور عدم تعاون کی تحریک کا جنم ہوا جس نے ایک طرف ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جڑیں ہلا دیں اور دوسری طرف ہندو مسلم اتحاد کے ایسے روح پرور مناظر دنیا کو دکھا دیے جنھیں دیکھنے کے لیے بعد میں نگاہیں ترستی ہی رہیں سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک کانگریس نے آزادی ہند کے لیے جتنی تحریکیں چلائیں ان میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یہ سب سے زیادہ مولانا آزاد کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ قدرت نے انہیں قلم اور زبان دونوں پر جو دسترس عطا فرمائی تھی اور ان کا کردار جتنا ارفع و اعلیٰ تھا اس نے عام مسلمانوں اور ان سے زیادہ مسلم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ
www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

علماء اور دانشوروں کو اتنا متاثر کیا جتنا کسی دوسرے نے نہیں کیا۔ یہ خود مولانا آزاد کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا بھی سب سے زیادہ شاندار اور تابناک دور تھا۔

ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن دوسری طرف صیاد بھی تاک میں لگا ہوا تھا۔ غیر ملکی حکومت اس صورت حال کو کیسے برداشت کر سکتی تھی کیونکہ اسے برداشت کرنا اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھکوانے کے مترادف تھا۔ اس نے ایسا پانسہ پھینکا اور ایسی چال چلی کہ ہندو مسلم اتحاد کا یہ لہلہاتا ہوا چمن خاکستر میں تبدیل ہو کر رہا۔

ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی گئیں اور فساد کا بیج کس طرح بویا گیا یہ ایک لمبی داستان ہے جس کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔ بہر حال شکوک کی فضا میں ۱۹۳۵ء کا قانون نافذ ہوا اور اس قانون کے مطابق جداگانہ اور محدود حق رائے دہندگی کی بنیاد پر مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن لڑے گئے۔ یہی وقت تھا جب ۱۵ سال کی جلا وطنی کے بعد مسٹر محمد علی جناح انگلستان سے ہندوستان واپس آئے ۱۹۲۰ء تک مسٹر جناح کا تعلق کانگریس سے رہا تھا اور وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی سمجھے جاتے تھے لیکن جب ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو انکی عافیت پسند طبیعت اس سے اپنے کو ہم آہنگ نہیں کر سکی اور وہ سیاست سے دست کش ہو کر انگلستان چلے گئے۔ کچھ عرصہ قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے ایک دوست نے کہا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں خطیب اور مدبر تو موجود تھے لیکن قائد کی کمی تھی اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مسٹر جناح کو انگلستان سے واپس بلانا پڑا۔ پوچھنے کی بات یہ ہے کہ انھیں واپس بلانے کے لیے کن مسلمانوں کا وفد انگلستان گیا تھا؟ کسانوں کا؟ دستکاروں کا؟ درمیانی طبقے کے لوگوں کا؟ کسی کا بھی نہیں بلکہ مسلمان جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کے نمائندے نواب زادہ لیاقت علی خاں تشریف لے گئے تھے اور ظاہر ہے کہ اس طبقے کے مسلمانوں کے مفاد کی نگرانی مسٹر جناح سے بہتر کون کر سکتا تھا؟ بہر حال ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں براہ راست سرکار پرست مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے ایک پارلیمنٹری بورڈ بنایا گیا جس میں مسلمانوں کی سب جماعتوں (بشمول مسلم لیگ) کے نمائندے شامل تھے میرے نزدیک یہ ایسی بنیادی غلطی تھی جس نے ہندستان کے کئی صوبوں میں مسلم لیگ کو حیات نو اور مسٹر جناح کو "قیادت عظمیٰ" عطا کر دی۔ الیکشن کے بعد ایسے حالات پیش آئے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ادوار کا پیش آنا لازمی تھا) کہ یہ اتحاد قائم نہیں رہ سکا اور مسلم لیگ خم ٹھونک کر کانگریس اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے حریف کی حیثیت سے میدان میں اتر آئی۔ اس واقعے کا ذکر مسلم لیگ کے ایک چوٹی کے رہنما چودھری خلیق الزمان نے اپنی خود نوشت سوانحعمری "شاہراہ پاکستان" میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ علماء کی جو جماعت ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں ہمارے ساتھ آ گئی تھی وہ محض مولانا آزاد کے اثر سے دوبارہ کانگریس سے جا ملی اور یہ سب سے بڑی "بدخدمتی" (Disserice) ہے جو مولانا آزاد نے ملت اسلامیہ کی انجام دی۔ اس کے برعکس میری یہ قطعی رائے ہے کہ یہی سب سے بڑی خدمت ہے جو قدرت کے مخفی ہاتھوں نے مولانا آزاد کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کی انجام دلائی کیونکہ آنے والے دور میں (جس کا ذکر آگے آئے گا) علماء کی یہی جماعت تھی جس نے مولانا آزاد کی سرپرستی میں ان ہندوستانی مسلمانوں کے جان، مال اور آبرو کی حفاظت کی جنھیں لاوارث سمجھ کر مسلم لیگ اور اس کے رہنما چھوڑ گئے تھے۔

۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے تقسیم وطن کی قرارداد منظور کی اور اس طرح ہندوستان کے مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے، فرقہ پرست اور وطن دوست۔ اور اس کے بعد جو معرکۂ کارزار گرم ہوا اس میں وقت کی کون سی گالی تھی جو وطن دوست مسلمانوں کو نہیں دی گئی اور کون سا حملہ تھا جو ان کے کردار اور ان کی شخصیت پر روا نہیں رکھا گیا۔ اور ان گالیوں کی سب سے زیادہ بوچھار کس پر ہوئی اور ان حملوں کی زد میں سب سے زیادہ کون رہا؟ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نیشنلسٹ مسلمانوں میں سب سے زیادہ قد آور شخصیت ان ہی کی تھی اور یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اگر اس نیر تاباں پر گرد ڈالی جا سکی تو دوسرے چاند، ستارے خود بخود روپوش ہو جائیں گے۔ اس طوفان بدتمیزی کے جواب میں مولانا آزاد کے کردار کے جو پہلو نمایاں ہوتے ان کا ذکر اس وقت ممکن نہیں ہے کیونکہ ہمارا موضوع دوسرا ہے۔

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک قومی رہنما (بشمول مولانا ابوالکلام آزاد) نظر بند رہے۔ ۱۹۴۵ء میں ان کی رہائی کے بعد برطانوی حکومت سے حصول آزادی کے لیے مذاکرات اور ۱۹۴۶ء کے فیصلہ کن الیکشن کا دور ہے اور یہی دور ہے جب مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی تدبر کا سب سے کڑا امتحان ہوا اور اس سے وہ اس طرح سرفراز نکلے کہ اس کی کوئی دوسری مثال ملنا محال ہے ــــ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک مولانا آزاد انڈین نیشنل کانگریس کے صدر رہے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس میں تین سال کی مدت (۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۵ء) جیل خانے کی چار دیواری کے پیچھے گزری لیکن جو مدت جیل خانے سے باہر گزری اسی میں انتقالِ اختیارات کے فیصلہ کن مذاکرات برطانوی حکومت اور کانگریس کے درمیان ہوتے جن میں تیسرے فریق کی حیثیت سے مسلم لیگ نے بھی شرکت کی۔ شری مہادیو ڈیسائی نے مولانا آزاد کی جو سوانح عمری انگریزی میں لکھی ہے اسکے مقدمے میں مہاتما گاندھی نے تحریر فرمایا ہے کہ ہندوستانی سیاسیات کے کسی طالب علم کو یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ آج کل مولانا آزاد انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلم لیگی سیاست کے اس دورِ عروج میں جس ایک واقعہ نے ہماری قومی تحریک کو واقعی "قومی" بنائے رکھا وہ مولانا آزاد کی صدارت کانگریس ہی تھی۔ قیادت عظمیٰ کے دارالافتاء سے "شو بوائے" کا فتویٰ اور اس قیادت کے کمتر پیروؤں کی زبان سے اس سے بھی گھٹیا درجے کی لاکھ گالیاں نکلتی رہی ہوں لیکن ہماری تحریک آزادی بہرحال قومی تحریک بنی رہی اور ہندو تحریک نہیں بن سکی۔ یہ فیضان ہے مولانا آزاد کے اس کرسی پر بیٹھنے کا جو ان کے وجود سے حقیقی معنی میں سج گئی تھی۔

۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن ہندوستان آیا تو مولانا آزاد نے پریس کو ایک بیان دیا تھا۔ مشہور برطانوی صحافی اور مصنف لیونارڈ موسلے نے اپنی کتاب "ہندوستان میں برطانوی حکومت کے آخری ایام" میں لکھا ہے کہ اس بیان کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ مستحق تھا۔ مجھے اس بیان کا ایک جملہ آج تک یاد ہے اور اس جملے کے پیچھے فہم و فراست اور دور اندیشی کی جو دنیا آباد ہے اس کے رموز وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ عیاں ہوتے جاتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ پاکستان کا قیام جتنے مسائل حل کرے گا ان سے بہت زیادہ مسائل پیدا کر دے گا۔ آج کوئی ہے جو اس جملے کی صداقت سے انکار کر سکے اسی طرح کا ایک اور جملہ مولانا آزاد نے "انڈیا ونس فریڈم" میں املا کرایا تھا اور وقت نے اس کی صداقت پر بھی ایسی مہر ثبت کر دی ہے جو کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتی ہے۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ قیام پاکستان کے وقت مسٹر جناح اور ان کے مقلد یہ بھول گئے تھے کہ جغرافیہ ان کے خلاف تھا۔ کیا بنگلہ دیش کے قیام نے یہ ثابت نہیں کر دیا ہے کہ جس شخص کی زبان سے یہ جملہ نکل رہا تھا وہ اپنے وقت سے کتنا آگے تک دیکھ سکتا تھا؟

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو واقعی بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور دراصل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس نے تقسیم وطن کی جنگ اسی وقت جیت لی۔ لیکن اس سلسلے میں دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں جن رائے دہندگان نے اسے یہ جنگ جتائی ان کا حلقہ بہت محدود تھا۔ اگر یہی انتخابات عام بالغ حق رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا نتیجہ کیا رہتا۔ دوسرے مسلم لیگ کو مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں جتنی نشستیں حاصل ہوئیں ووٹ ان کے مقابلے میں کافی کم ملے۔ یوپی جیسے صوبے میں جہاں فرقہ پرستی اپنے عروج پر تھی نیشنلسٹ مسلمان ۲۲ فیصدی ووٹ حاصل کر لے گئے یہ اثر تھا ہمارے علمائے کرام کا اور ان علماء کو پشت پناہی حاصل تھی مولانا ابوالکلام آزاد کی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جتنے مسلمان اس وقت کانگریس کے ساتھ تھے وہ سب علمائے کرام کے اثر ہی سے تھے۔ بلا شبہ ایسے لوگ بھی تھے جو بصورت دیگر بھی کانگریس سے وابستہ رہتے اور اسکا ساتھ دیتے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی اور ان کی حیثیت محض انفرادی تھی، اجتماعی ہرگز نہیں تھی۔ یہی وہ بات ہے جو چودھری خلیق الزمان نے بعنوان دیگر "شاہراہ پاکستان" میں لکھی ہے اور جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شہادت سب سے زیادہ معتبر وہی ہوتی ہے جو دشمن کی زبان یا قلم سے نکلتی ہے۔

تقسیم ملک کے باوجود ہمارے قومی رہنماؤں نے ہمارے ملک کا جو دستور بنایا اس کی بنیاد سیکولرزم پر رکھی اور اس میں اقلیتوں کو ہر میدان میں اکثریت کے مساوی حقوق عطا کیے۔ بے شک یہ بہت بڑا کارنامہ تھا اور اس کا سب سے زیادہ کریڈٹ پنڈت جواہر لال نہرو کو جاتا ہے جنہوں نے اس معاملے میں صحیح معنی میں مہاتما گاندھی کے جانشین ہونے کا ثبوت دیا ساتھ ہی اس میں بھی کلام نہیں ہے کہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمان تھے اور اگر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کے طوفانی دور میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد قومی تحریک سے وابستہ نہ رہی ہوتی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور اس نے بھی سواد اعظم کی اندھی تقلید کو اپنا شعار بنا لیا ہوتا تو کیا گاندھی جی اور پنڈت جی اپنی تمام تر نیک نیتی کے باوجود وہ کر سکے ہوتے جو انہوں نے کیا؟ اس طرح ہماری نئی قائم شدہ ریاست کا سیکولر کردار گاندھی جی اور پنڈت جی کے علاوہ جس شخص کا سب سے زیادہ رہین منت ہے وہ مولانا آزاد ہی کی ذات ہے صرف یہی نہیں بلکہ دستور سازی کے ہر مرحلے پر مولانا عملی طور پر اس سے وابستہ رہے اور جہاں تک ان سے ممکن ہوا بدلے ہوئے حالات کے باوصف انھوں نے دستور ساز اسمبلی کو صحیح راستے سے ہٹنے نہیں دیا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کام میں انہیں سب سے زیادہ مدد پنڈت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جواہر لال نہرو سے ملی۔

یہ تو مستقبل کی نقشہ آرائی تھی لیکن تقسیم ملک نے جو فوری مسائل پیدا کر دیے تھے ان میں سب سے بڑا مسئلہ مسلمانوں کے وجود کا اس ملک میں قائم رکھنے کا تھا، اس لیے کہ اگر وہی یہاں نہ رہ پاتے تو مستقبل کی نقشہ آرائی کس کے لیے ہوتی کیونکہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اس ملک کی ساخت کچھ اس قسم کی ہے کہ جب تک اس کی تعمیر میں ہندو اور مسلمان دوش بدوش حصہ نہ لیں اس کا اپنی منزل مقصود تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت نے گذشتہ سات سال میں جن لیڈروں کی پیروی میں اپنی نجات سمجھی تھی وہ یا تو نئی مملکت کے اعلیٰ عہدوں کو زینت بخشنے کے لیے وہاں تشریف لے جا چکے تھے یا کہیں کونوں کھدروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ گویا مولانا آزاد کے الفاظ میں پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست انہیں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کی ہمت بندھانے اور ان کی راہنمائی کرنے کے لیے کون میدان میں آیا، مولانا آزاد یا کوئی اور؟ دہلی کی شاہجہانی مسجد سے کس کی آواز فضا میں گونجی جس نے انہیں یاد دلایا کہ اس ملک میں جو جلیے نقوش تمہیں نظر آ رہے ہیں وہ تمہارا ہی قافلہ یہاں لایا تھا، اس لیے انھیں چھوڑو نہیں، یہاں سے بھاگو نہیں کیونکہ اگر تم بھاگنا نہیں چاہتے تو کوئی تمہیں بھگا نہیں سکتا۔ ساتھ ہی انہیں عزت نفس کا یہ سبق بھی پڑھایا کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو، خوشامد اور کاسہ لیسی کی وہی پالیسی اختیار کرو جو غیر ملکی حکومت کے دور میں تمہارا شعار تھا۔ وقت کے جو حالات تھے ان میں یہ درس دینا کس دل گردے اور ساتھ ہی کس سیاسی تدبر اور دور بینی کا کام تھا اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے اور کیا آج بھی یہی درس اس قابل نہیں ہے کہ اسے ہم اپنا لائحہ عمل بنائیں؟

پھر لکھنؤ کے پلیٹ فارم سے مولانا آزاد نے مسلمانوں سے کہا کہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر جماعت سازی کا تجربہ تم بہت کر چکے اور اس کے نتائج بھی دیکھ چکے اب ملک کی مشترک سیاسی جماعتوں میں شریک ہو کر کام کرنے کا تجربہ کر دیکھو۔ آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں اور گذشتہ ۲۹ برسوں میں ہم نے جو سفر طے کیا ہے وہ انہی قیمتی مشوروں پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہم ان مشوروں پر پوری طرح عمل نہیں کر سکے ورنہ نہ معلوم اور کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہوتے۔

یہ اس شخص کا سیاسی کارنامہ ہے جس کے بارے میں منجملہ اور باتوں کے پروپیگنڈا بھی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا گیا تھا کہ وہ اصلاً علم وادب کے میدان کا شہسوار ہے۔ اس سے علم وادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور سیاسیات کو کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ یہ پروپیگنڈا کچھ اس شدومد سے کیا گیا کہ مولانا کے مخالفین ومعاندین ہی نہیں، بعض پیر اور مقلدین بھی اس پر ایمان لے آئے حالانکہ جو امور اوپر گوش گزار کیے گئے وہ اس امر کی شہادت دینے کے لیے کافی ہیں کہ اگر مولانا آزاد کسی شہ نشین میں علم وادب کی مسند پر جلوہ افروز رہے ہوتے اور سیاسیات کے خارزار سے انہوں نے اپنے تلوے چھلنی نہ کیے ہوتے تو ممکن ہے بیش قیمت کتابوں کا ایک ذخیرہ ہمارے ہاتھ آجاتا لیکن ایسے ذخائر تو بہت سوں نے مہیا کیے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ زہر کا وہ پیالہ کون پیتا جسے پینے کے لیے قدرت صدیوں کے بعد کوئی سقراط اور کوئی ابوالکلام پیدا کرتی ہے اور اگر مولانا نے زہر کا وہ پیالہ نہ پیا ہوتا تو آج ہماری زندگیاں کتنی زیادہ مسموم ہوتیں بلکہ میری ناچیز رائے میں تو یہ کہنا دشوار ہے کہ ہم اس ملک میں ٹک بھی پاتے! ... اور یہ تو یقینی امر ہے کہ ہندوستان ایک سیکولر ریاست نہ ہو کر دھارمک راشٹر بن گیا ہوتا جس سے پورے ملک کو ایسا نقصان پہنچتا جس کی تلافی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا ابوالکلام آزادؔ اور ہندی فلسفہ

صفی الدین صدیقی

مولانا آزاد کی شخصیت اس قدر جامع اور مکمل ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کو آشکار کرنے کے لیے کئی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی۔ مولانا مرحوم ایک بڑے محب وطن، زبردست صحافی، عظیم انشاء پرداز، علوم اسلامیہ کے ماہر اور ایک اعلیٰ درجے کے سیاس تھے۔ مولانا کی تمام زندگی پیہم جدوجہد کی ایک طویل داستان رہی۔ انھوں نے اردو زبان کو ایک نئے معیار سے روشناس کیا۔ اتنی تمام باتوں کا ایک ذات میں جمع ہوجانا یقیناً ایک غیر معمولی امر ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

عام طور پر پڑھے لکھے حضرات مولانا مرحوم کو محض اسلامی فلسفۂ الہیات کے عالم اور ایک زبردست انشاء پرداز کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا آزاد کا دائرہ فکر اس سے بھی کہیں زیادہ وسیع تھا۔ قدیم وجدید علوم کے تقریباً تمام گوشے مولانا کی دسترس سے باہر نہیں تھے۔ جب بھی آپ کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تھے تو پوری ذمہ داری کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہوتے تھے اور قاری کو کبھی یہ محسوس نہ ہونے پاتا کہ کوئی بات تشنہ چھوڑ دی گئی ہے۔ چنانچہ یہی وہ خصوصیت ہے جو ایک مصنف کو مفکر اور فلسفی کا درجہ عطا کرتی ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ مولانا آزاد کا فکری و ذہنی نشو و نما ہندوستانی ماحول میں ہوا تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ہند قدیم کے فکری سرمایے سے ناآشنا رہتے۔ ہند قدیم کے سرمایے سے میری مراد ہندی فلسفہ ہی ہے۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ہمارے اکثر اردو داں حضرات ابھی تک ہندی فلسفہ کے خدوخال اور اس کی اہمیت سے نابلد اور ناآشنا ہیں۔ اس عدم واقفیت کا باعث بڑی حد تک وہ ماحول ہے جس کے اندر ان لوگوں کی ذہنی تربیت آج تک ہوتی رہی ہے۔ ہندوستان پر انگریزوں کے مکمل اقتدار نے بہت ساری نئی نئی تبدیلیوں کو جنم دیا۔ سب سے بڑا انقلاب تو تعلیم کے شعبہ میں رونما ہوا۔ انگریز حکمرانوں نے ملک کے بعض عظیم شہروں میں یورپی طرز کی یونیورسٹیوں کی بنیاد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈالی جہاں یورپی علوم ہی کو زیادہ اہمیت دی گئی، اور یہ سب علوم انگریزی زبان کے واسطے ہی سے ہندوستانی دماغ میں اتارے گئے۔ ان یونیورسٹیوں میں علوم مشرقیہ کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو انھیں ملنا چاہیے تھا۔ مثال کے طور پر ہندی فلسفہ کی تعلیم پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس طرح ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ یہ سمجھتا رہا کہ اگر فلسفہ کہیں پایا جاتا ہے تو وہ محض یورپی اقوام میں۔ چنانچہ فلسفہ کی داستان کو یونان قدیم سے شروع کر کے جدید دور کے کسی فلسفی پر ختم کر دیا جاتا تھا۔ ہندی فلسفہ کی عظمت کا اعتراف تو دور رہا بعض یورپی مصنف ایک عرصہ تک یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ مشرقی اقوام میں فلسفہ جیسے علم کا وجود بھی پایا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت پروفیسر تھلی (Thilly) کی وہ تاریخ فلسفہ ہے جو بہت زمانے تک ہندوستانی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل رہی۔ مگر اب پروفیسر تھلی کے نقطہ نظر کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ تمام عالم اب ہندی فلسفہ کی عظمت کا اعتراف کر چکا ہے۔

دور جدید میں ہندی فلسفہ کے بڑے بڑے مفسر ہندوستان میں پیدا ہوئے ان میں پروفیسر داس گپتا اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی "تاریخ ہندی فلسفہ" جو دو ضخیم جلدوں میں تصنیف کی گئی ہے درحقیقت ایک بے مثال کارنامہ ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس موضوع پر آئے دن نئی نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اب ہر پڑھا لکھا شخص ہندی فلسفہ کے مطالعہ کی اہمیت کو سمجھنے لگا ہے۔

یہ تو ان ماہرین کا ذکر ہے کہ جنھوں نے ایک عمر ہندی فلسفہ کے مطالعہ میں گزاری ہے۔ مگر یہاں پر میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ایک چھوٹے سے مگر اہم مضمون کا ملخص پیش کرنا چاہتا ہوں جو رادھا کرشنن کی مرتب کی ہوئی کتاب "مشرق اور مغرب کے فلسفے" سے ماخوذ ہے، اس مضمون میں مولانا نے ہندی فلسفے کا نہ صرف تنقیدی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے بلکہ وہ نہایت عالمانہ انداز میں ہندی فلسفہ کا تقابل یونانی فلسفہ سے بھی کرتے ہیں اور بعض اہم ترین نتائج تک پہنچتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا نے ہندی فلسفہ کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ مولانا کا یہ مضمون فلسفہ کے طالب علم کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا آزاد نے اپنے مبحث کو چار عنوانوں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے پہلے وہ فلسفہ کے آغاز اور ماخذ کا ذکر چھیڑتے ہیں فلسفہ کی داستان کا آغاز کہاں سے ہونا چاہیے؟ آیا یونان سے ہم اس داستان کا آغاز کریں یا ہندوستان سے یہاں پر یہ بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملک میں فلسفہ کے ابتدائی نشوونما کا حال ہم پر تاریخ کی روشنی میں عیاں ہوتا ہے؟

جہاں تک یونانی فلسفہ کی ابتداء کا سوال ہے اس کو ہم ملیطہ (Ionia) کے ایک فلسفی طالیس (Thales) سے شروع کرتے ہیں۔ طالیس کے دور کا تعین یوں کیا گیا ہے کہ اس مفکر نے ۵۵۸ ق۔م میں واقع ہونے والے ایک گرہن کی پیش گوئی کی تھی۔ اس طرح طالیس کا وجود ۶۰۰ ق۔م سے قبل ہرگز قابل قبول نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہی یونانی فلسفہ کے آغاز کا بھی زمانہ ہے۔ طالیس ملیطی کے بعد جن دو فلسفیوں نے یونانی فلسفہ کو ایک نئے موڑ سے روشناس کیا وہ فیثا غورث (۵۳۲ ق۔م) اور سقراط (وفات ۳۹۹ ق۔م) ہیں۔

اس کے برخلاف جب ہم ۶۰۰ ق۔م کے ہندوستان پر نظر ڈالتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ زمانہ ہندی فلسفے کے آغاز کا نہیں بلکہ اس کے انتہائی نشوونما کا زمانہ ہے۔ یونان کی طرح یہ فلسفہ کی نمود صبح نہیں بلکہ ہندوستان کے تعلق سے فلسفہ کا نصف النہار ہے۔ انسانی تفکر جس وقت محض فلسفہ کا جو یار تھا وہاں ہمارے ہندی فلسفیوں نے فکری زندگی کی ایک طویل مسافت طے کر لی تھی۔ یہاں پر میں اسی بات کو ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے اپنے مضمون میں اس قسم کی تفصیل سے اجتناب کیا ہے مگر ان کے اختصار کے پیچھے لازماً یہ تفصیل چھپی ہوئی ہے۔

ہندی تفکر کے نشوونما کو ہم بہ آسانی چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ویدوں کا دور ہے۔ یہ دور تاریخی اعتبار سے بڑا ہی مدھم ہے کیوں کہ ویدوں کے دور کے تعین میں خود ماہرین ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ پھر بھی ہم اس دور کا تعین ۲۵۰۰ ق۔م، اور ۶۰۰ ق م کے درمیان کر سکتے ہیں۔ اس دوران میں وسط ایشیا سے ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ جب وہ اپنے نئے وطن میں آباد ہو گئے تو آہستہ آہستہ آریائی کلچر اور تمدن کی بنیادیں استوار ہونے لگیں۔ صحیح معنوں میں اس وقت فلسفیانہ غور و فکر کی شروعات نہیں ہوئی بلکہ مذہب فلسفہ اور توہمات یہ سب ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں فلسفیانہ غور و فکر کا آغاز ہو چکا تھا جیسا کہ بعض اہم اپنشدوں کے مطالعہ سے اس کا پتا چلتا ہے۔ یہی چار ویدوں کی تدوین کا زمانہ ہے جنھیں بالترتیب رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھر وید کے نام دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے۔ ایک وید چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ منتروں کا، بھجنوں کا ہے۔ دوسرا برہمنوں کا، تیسرا آریہ نیکاس کا اور چوتھا اپنشدوں پر مشتمل ہے۔ رگ وید کے بھجن دراصل ہندی فلسفہ کے آغاز کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہمارے نقطۂ نظر سے اپنشد ہی سب سے زیادہ اہم ہیں کیونکہ ان میں باقاعدہ طور پر فلسفیانہ مباحث آئے ہیں۔ مگر اس موڑ پر حقیقت اولیٰ کے تحقیق کے سلسلے میں عقلیت سے زیادہ وجدان اور روایت پر . . . . زور دیا گیا ہے۔

دوسرا دور مہا کاویہ (Epic Period) کا ہے جس کا تعین ۶۰۰ ق م اور ۲۰۰ بعد از مسیح کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ دور ہندی فلسفہ کے نشو و نما کے لیے بڑا ہی اہم ہے۔ رامائن اور مہا بھارت جیسی عظیم نظمیں تصنیف ہوئی ہیں۔ یہی زمانہ بدھ مت، جین مت، شیو مت اور وشنو مت کی اشاعت کا زمانہ ہے۔ بھگوت گیتا کے فلسفہ کی بنیاد پڑتی ہے اور اس کے علاوہ ہندی فلسفہ کے تمام آستک اور ناستک (Orthodox and unoythodox) مذاہب معرض وجود میں آتے ہیں۔ یہی وہ دور ہے جس میں کہ دھرم شاستر لکھے گئے ہیں اور اخلاقی اور عمرانی فلسفوں پر متعدد مقالے قلم بند ہوئے ہیں۔

تیسرا دور سوتروں کا ہے۔ سنسکرت میں سوتر کے معنی دھاگے کے ہیں۔ چنانچہ ان سوتروں میں منتشر فلسفیانہ خیالات کو منظم طریقہ پر جمع کیا گیا ہے اور یہی خالص فلسفیانہ تصنیفات کہلاتی ہیں۔ چنانچہ ہر ہندی فلسفیانہ مذہب کی بنیاد کسی نہ کسی خاص سوتر پر رکھی گئی ہے جیسے کہ نیایے کے فلسفہ کی بنیاد رشی گوتم کے نیایے سوتر پر رکھی گئی ہے۔ سانکھیہ فلسفہ کی عمارت رشی کابل کے سانکھیہ سوتر پر کھڑی کی گئی ہے وغیرہ، سوتروں کے دور کا تعین عیسٰی کی ابتدائی صدیوں میں ہوتا ہے۔

چوتھا اہم دور تشریحات کا ہے اس کی ضرورت یوں پیش آئی کہ متذکرۂ بالا سوتر بڑی ادق اور مشکل زبان میں لکھے گئے تھے اور وہ مختصر بھی تھے اسلیے لازمی تھا کہ ان کی تفسیریں لکھی جاتیں۔ مگر دلچسپ بات تو یہ ہے کہ بعض شرحیں سوتروں ہی کی طرح ادق اور مشکل ہیں اس لیے بعد کو اُن کی تفسیروں کی مزید شرحیں لکھی گئیں یہی وجہ ہے کہ اس دور کو (Scholiastic Period) کہا گیا ہے۔

چنانچہ یہ پس منظر ہے ہندی فلسفہ کے آغاز اور نشو و نما کا۔

اس تمام بحث سے مولانا دو اہم نتائج اخذ کرتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس دور میں بدھ مت اور جین مت ظہور میں آئے ہیں دوسری بات کہ گوتم بدھ اور مہاویر جیسے مفکروں اور دانشوروں کے منظر عام پر آنے سے بہت پہلے ہی فلسفہ اپنی نشو و نما کی کافی منزلیں طے کر چکا تھا، اس کے علاوہ دیگر مذاہب فلسفہ کافی تیزی سے ترقی کر رہے تھے۔

یہاں پہنچ کر مولانا نے گوتم بدھ کی شخصیت کو خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ مولانا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا خیال ہے کہ گوتم بدھ دنیا کے تمام عظیم انسانوں کے درمیان ایک الگ ہی مقام کے حامل ہیں۔ ماہروں کے نزدیک یہ مسئلہ ابھی تک ما بہ النزاع ہے کہ آیا گوتم بدھ کا شمار پیغمبروں کے زمرے میں ہونا چاہیے یا پھر انھیں فلسفیوں کی صف میں داخل کیا جائے؟ گوتم بدھ کی تعلیمات کی آخر کیا نوعیت ہے؟ ان کے مواعظات کو الہامی کہنا چاہیے یا پھر انھیں کوئی نئی فلسفیانہ دریافت سے تعبیر کیا جاتے؟ اس طول طویل بحث کا آخر کار نتیجہ یہی نکلا کہ آج تک مذہب اور فلسفہ دونوں ہی گوتم بدھ کو اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ مولانا کی رائے میں بدھا کو پیغمبر کی بجائے ایک فلسفی کے روپ ہی میں دیکھا جانا چاہیے کیونکہ وہ ایک فلسفی کی طرح حیات کے گوناگوں مسائل کا حل دریافت کرتے ہیں۔ پیغمبروں کی طرح خدا کے تحقق پر زور نہیں دیتے۔ گوتم بدھ نے آغاز ہی میں یہ واضح کر دیا تھا کہ ان کا نقطۂ نظر غیر ما بعد الطبیعیاتی ہے۔ اس لیے ان کی تعلیمات میں نہ تو خدا کے لیے کوئی گنجایش نکل سکی اور نہ روح اور آتما کے تحقق پر انھوں نے زور دیا۔ بدھا اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں کہ روح کے وجود کو ماننا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک خوبصورت عورت کے دام محبّت میں گرفتار ہو جائے جب کہ ایسی عورت کا سرے سے وجود ہی نہ پایا جاتا ہو وہ تو محض اس حقیقت پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں کہ ایک شخص کیونکر دکھ اور الم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح گوتم بدھ نے قدیم ہند کی اس مذہبی زندگی سے اپنا ناتہ توڑ لیا جس میں بے شمار دیویوں اور دیوتاؤں کے لیے جگہ نکل آتی تھی۔ اس لحاظ سے گوتم بدھ کا طریقہ فکر خالص فلسفیانہ ہے۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بدھا کے بعد ان کی تعلیمات کی وہ ابتدائی شکل باقی نہیں رہی، اور ایسی تمام باتیں بدھ دھرم میں داخل ہو گئیں جن کی مخالفت خود بدھا نے اپنی زندگی میں کی تھی اور اس طرح بدھ مت کے بعد کے دور میں مابعد الطبیعیاتی رجحان داخل ہو گیا۔ اس انقلاب کا ذمہ دار بدھ مت کا مہایانی مذہب ہے جس کا بانی ایک غیر معمولی بدھی ناگ ارجن گزرا ہے۔ مہایانا بودھ دھرم پر ہمیں صاف طور پر ہندو مذہب کی چھاپ نظر آتی ہے۔ بدھ مت کی ابتدائی صورت میں خدا کی جو خالی مسند چھوٹ گئی تھی اس پر اب خود گوتم بدھ کو براجمان کر دیا جاتا ہے۔ یہاں پر مجھے ڈاکٹر رادھا کرشنن کا ایک فقرہ یاد آتا ہے وہ یہ کہ ہندو مت نے ایک التفات آمیز ہم آغوشی کے ذریعہ بدھ مت کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بدھ مت کے دو اہم مذاہب ہنایانہ اور مہایانہ پر کافی لکھا جا سکتا ہے مگر فی الحال ہمیں اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے بعد مولانا جین مت کے بانی مہاویر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لگ بھگ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسی زمانے میں مہاویر منظر عام پر آئے۔

ان کی تعلیمات میں بھی خدا کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ لہذا مہاویر کے نقطۂ نظر کو خالص فلسفیانہ کہنا چاہیے۔ مولانا نے اپنے مضمون میں گوتم بدھ اور مہاویر کی شخصیت کا خاص طور پر ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہ دراصل اس فکری پس منظر پر زور دینا چاہتے ہیں جس کے اندر ایسی دو زبردست شخصیتوں کا ظہور ہوا۔ چنانچہ تاریخ فلسفہ کے طالب علم کے لیے یہی پس منظر زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ ۶۰۰ ق م میں بدھا اور مہاویر کا اس طرح کا نقطۂ نظر اختیار کرنا خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان دو دانشوروں سے بہت پہلے ہند میں فلسفہ کا خاصا نشوونما ہو چکا تھا۔

مگر اس قسم کا فلسفیانہ مزاج یونان میں ایک عرصہ تک پیدا نہ ہو سکا۔ آیونیا کا فلسفہ جو کہ یونان کا ابتدائی فلسفہ مانا جاتا ہے وہ خود علم الاساطیر (Mythology) سے متاثر معلوم ہوتا ہے کیوں کہ یونان کے ..... ابتدائی فلسفیانہ مذاہب نے ارواح کے ایک ایسے نظریہ کو مانا تھا جس کی رو سے پودوں اور ستاروں وغیرہ میں مختلف الاقسام ارواح کا بسیرا تھا۔ یہ بات دیو مالا کے اَن گنت دیویوں اور دیوتاؤں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہ دیو مالائی اثر یونان میں ارسطو کے دور تک بھی کارفرما رہا۔ اس میں شک نہیں کہ سقراط نے ایسے خداؤں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، مگر یہ عظیم مفکر بھی خداؤں کے مقبول عام تصور کو یونان کی زندگی سے نکالنے میں ناکام رہا۔

اس منزل پر مولانا یونان اور ہند کے تعلق سے فلسفہ اور مذہب کا تقابل بھی پیش کرتے ہیں۔ یونان میں فلسفہ کا آغاز حیرت سے ہوتا ہے۔ وہاں کے مفکر مذہب سے آزاد ہو کر ظاہری کائنات پر عقلی حیثیت سے غور کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہندی مفکروں نے ایک نیا ہی زاویۂ نظر اختیار کیا۔ یہاں فلسفہ حیرت کا آفریدہ نہیں بلکہ ضروریات زندگی اس کو جنم دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہند میں مذہب اور فلسفہ کے درمیان کبھی اجنبیت نہیں رہی۔ دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔ یونان کی طرح فلسفہ ہند میں محض اکیڈمیوں کی چار دیواری میں قید نہیں رہا بلکہ وہ لاکھوں ہندیوں کا مذہب بن گیا۔

جیسا کہ اوپر بتلایا جا چکا ہے گوتم بدھ اور مہاویر نے مسائل حیات پر ایک خالص فلسفیانہ نقطۂ نظر سے غور کیا تھا لیکن ان کی تعلیمات نے بعد کو مذاہب کی شکل اختیار کر لی۔ یونان کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تمام فلسفیوں کے مقابلے میں سقراط کی شخصیت بالکل الگ قسم کی جان پڑتی ہے۔ ویسے تو وہ صحیح معنوں میں ایک فلسفی تھا۔ مگر سقراط کو محض فلسفی کہہ دینے سے اس کی شخصیت کے دوسرے اجزا آشکارا نہیں ہوتے۔ جب ہم اس کے بارے میں سوچتے ہیں تو لازماً یسوع مسیح کا خیال آجاتا ہے۔ سقراط کی زندگی کے واقعات بنی اسرائیل کے پیغمبروں اور ہندوستان کے رشیوں، منیوں کے حالات سے کافی مشابہت رکھتے ہیں۔ مثلاً سقراط پر اکثر جذب و کیف کا عالم طاری ہو جایا کرتا تھا۔ جب اس کی ذہنی زندگی میں کوئی مشکل موڑ آتا اور عقلی قوت بے بس ہو جاتی تو وہ ہمیشہ ہاتف غیبی سے رجوع کرتا تھا یعنی وہ ایسی غیبی قوت پر ایمان بھی رکھتا تھا۔ ایتھنیا کی عدالت میں جب وہ عوام کو مخاطب کر رہا تھا تو کسی صدائے غیبی نے اس کی رہنمائی کی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود سقراط فلسفی ہی مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ سقراط کی موت کے بعد اس کی تعلیمات یا اس کی شخصیت کو محور بنا کر کسی مذہبی فرقے کی بنیاد اس کے حواریوں نے نہیں ڈالی۔ چنانچہ یہ وہ حقائق ہیں جو یونان اور ہند کی اسپرٹ کے فرق کو ظاہر کرتے ہیں۔ یونان میں مذہبی عناصر نے فلسفہ کی شکل اختیار کر لی تھی اور اس کے برخلاف ہند میں خود فلسفہ نے مذہب کا روپ دھار لیا۔

گوتم بدھ اور مہاویر کے تذکروں سے مولانا کا مقصد اس وقت کے ہندوستان کی ذہنی و فکری فضا کو پیش کرنا تھا اور اس کے ذریعہ مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہند میں یونان سے پہلے فلسفہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ مزید شہادتوں کے اجتماع سے ہندی فلسفہ کی قدامت کو اور بھی پیچھے لے جاتے ہیں۔ آخر وہ شہادتیں کونسی ہیں؟ ہندی فلسفہ کا طالب علم یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اپنشدوں کا زمانہ بدھا اور مہاویر سے بہت پہلے کا ہے۔ اپنشد لگ بھگ آٹھویں صدی قبل مسیح میں مدون کیے گئے اس کے علاوہ ہند کے دیگر فلسفیانہ مذاہب کی ابتدا کے بارے میں ماہروں کے درمیان کافی اختلافات ہیں۔ بعضوں کی رائے میں چارواک کا مذہب بہت پہلے کا ہے کیونکہ اپنشدوں میں کائنات کے ایک ایسے تصور کا پتا چلتا ہے جو اپنی ماہیت میں خالص مادی ہے اور چارواک کے نظریہ سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ اسی طرح بعض ماہروں کی رائے میں سانکھیہ اور یوگ بھی بہت پرانے نظام ہائے فلسفہ ہیں کیونکہ بدھ مت کے خیالات اور سانکھیہ یوگ کے خیالات میں کافی مماثلت نظر آتی ہے۔ اگر ہم سانکھیہ اور یوگ کو بدھ مت سے پہلے کا مذہب نہ مانیں تب بھی انھیں بدھ ازم کے ہمعصر مذاہب تسلیم کیا جا سکتا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ ان شہادتوں کی روشنی میں غلط نہ ہوگا اگر ہم ہند میں فلسفہ کے آغاز کا تعین چھٹی صدی قبل مسیح کے بجائے ایک ہزار قبل مسیح میں کریں۔

مگر مولانا ہندی فلسفہ کے طالب علموں کو اس بات سے خبردار کرتے ہیں کہ وہ چارواک، سانکیہ اور یوگ مذاہب کی قدامت ثابت کرنے میں تاریخی شہادتوں کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، کیونکہ کسی نقطہ نظر کی بنیاد محض ظن اور قیاس پر نہیں رکھی جاسکتی۔ بہرحال ان تمام بحثوں سے مولانا یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہند میں فلسفہ کا آغاز یونان سے بہت پہلے ہو چکا تھا اس لیے تاریخ فلسفہ کا آغاز یونان سے نہیں بلکہ ہندوستان سے ہونا چاہیے۔

مولانا کا دوسرا اہم عنوان علم باطن اور فلسفہ کے تعلق کا ہے۔ علم باطن کے لیے انگریزی میں (Mystecism) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قدیم جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ نے اس کے لیے سریت کی اصطلاح کا بھی استعمال کیا ہے مگر ہم یہاں اول الذکر اصطلاح ہی کا استعمال کریں گے۔

یہ تو واضح ہو چکا ہے کہ ہند کا ابتدائی فلسفہ اپنشدوں میں ملتا ہے مگر ان اپنشدوں کا لہجہ صاف طور پر باطنی اور مذہبی ہی ہے۔ یہاں پر ہم زیلر (Zeller) اور اڑڈمان (Erdmann) جیسے مستشرقین کی رایوں سے متفق نہیں ہیں کہ ہند کے ابتدائی فلسفہ کو بالکل ہی خارج کردیا جائے کیوں کہ یہ تجربی اور عقلی فلسفہ سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب تک باطنیت کا تجربہ فرد تک محدود ہوا سے ہم فلسفیانہ انتقاد کا موضوع نہیں بنا سکتے لیکن اگر اسی تجربہ کو بنیاد بنا کر اس پر ایک منطقی نظام فکر کا ہیولیٰ تیار کیا جائے تو اسے فلسفہ کہنا ہی پڑے گا۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو اس کے لیے کوئی اور موزوں اصطلاح دستیاب نہیں ہوتی۔

آخر فلسفہ ہے کیا؟ وہ نام ہے حیات اور وجود کے تحقق کا۔ صداقت کو جاننے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو وہ طریقہ ہے جو آغاز سے لے کر اختتام تک محض الہام اور روایت کا سہارا لیتا ہے چنانچہ اسی کا نام مذہب ہے۔ اس کے برخلاف ایک اور طریقہ ہے جو صرف عقلیت پر مبنی ہے۔ اسی کو ہم فلسفہ کا نام دیتے ہیں۔

ازمنہ اولیٰ ہی سے فلسفیوں نے حیات و کائنات کے مسائل کی اصل دریافت کرنے کے سلسلے میں انہی دو طریقوں کو دریافت کیا ہے۔ مگر ہندی فکر کی ہمیشہ ہی سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ یہاں خارجی دنیا سے زیادہ فرد کی باطنی دنیا پر توجہ دی گئی۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے فلسفیوں نے خارجی حقائق کو نقطۂ آغاز بنا کر باطنی حقیقت تک رسائی حاصل نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی، بلکہ انھوں نے ہمیشہ باطن سے خارج کی طرف سفر کیا ہے۔ چنانچہ اس نقطہ نظر کا پتہ ہمیں اپنشدوں کے مطالعہ سے چلتا ہے۔ یونان کے فلسفیانہ مذاہب نے بھی کم و بیش یہی نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔ اس کا بیّن ثبوت فیثاغورث کا فلسفہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سقراط کا جدلی طریقہ بڑی حد تک منطقی تھا۔ لیکن سقراط نے صاف لفظوں میں یہ بھی بیان کر دیا تھا کہ وہ صداقت تک رسائی کسی غیبی یا باطنی قوت ہی کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ ہندی فلسفہ کی طرح بعض یونانی فلسفیوں کا بھی یہی موٹو رہا ہے کہ "خود کو پہنچانو" افلاطون کے فلسفہ تصوریت میں ہم کو آیندہ علم باطن کے نشو و نما کے نقوش صاف طور پر نظر آتے ہیں البتہ اس کے شاگرد ارسطو نے افلاطون کے فلسفہ کے اس پہلو پر زیادہ زور نہیں دیا تھا۔ لیکن ارسطو کے بعد علم وفن کے ایک بڑے مرکز اسکندریہ میں افلاطون کے اس فلسفہ کا احیاء ہوا جو نو افلاطونی فلسفہ کے نام سے مشہور ہوا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اسکندریہ کے اسکول پر اپنشدوں کا اثر پڑا ہو، یہ بات تحقیق طلب ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اس وقت اسکندریہ مذاہب عالم کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہاں پر مشرق و مغرب کے افکار کا ٹکراؤ ہوا تھا انسانی فکر کے مختلف دھاروں کا وہ سنگم تھا۔

علم باطن کا بنیادی اصول آخر کیا ہے؟ یہ صداقت کا ایسا علم ہے جو حواس کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر ہمیں صداقت تک پہنچنا منظور ہو تو پھر حسّی دنیا سے رشتہ توڑ کر باطنی تجربوں کی گہرائیوں میں ڈوبنا ہوگا۔ یہی اصول فیثاغورث اور افلاطون کے فلسفوں میں کارفرما رہا خاص طور پر افلاطون کے فلسفہ میں یہ بات شدت سے ابھر کر سامنے آگئی۔ افلاطون نے دنیائے فکر اور دنیائے حواس کے فرق کو ایک شاعرانہ تشبیہہ کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ ایک تو شام کا جھٹپٹا ہے اور دوسرا دن کا بھرپور اجالا۔ چنانچہ آلات حواس کے ذریعہ جو ادراک ہوتا ہے اس کی حیثیت شام کے جھٹپٹے کی ہے جس میں ہر چیز مدھم نظر آتی ہے۔ اس کے برخلاف وجدان کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی حیثیت دن کے اجالے کی سی ہے۔ یہی بات شاعر مشرق علامہ اقبال نے شعر کی زبان میں کہی تھی ؎

خرد سے آدمی روشن بصر ہے — خرد کیا ہے چراغ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا — چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے

چنانچہ یہیں پر ہم افلاطون کے فلسفہ مظاہر و حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کی پہنچ فقط مظاہر تک ہے اور حقیقت تک ان کی رسائی ناممکن ہے۔ افلاطون کے نزدیک انتہائی حقیقت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خیر ہے۔ حکمت و دانش محض خیر کے ظل سے بحث کرتے ہیں۔ افلاطون اپنی شاہکار تصنیف جمہوریہ میں بھی اس فلسفہ کی وضاحت کے لیے غار والا مثالیہ (Parable) پیش کرتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو افلاطون کو باطنیت سے قریب تر کر دیتا ہے اور یہی اپنشدوں کا نقطۂ نظر ہے۔

ہندی اور یونانی طرز فکر میں ایک اور مماثلت پائی جاتی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یونانی فلسفہ کا تصور عقل (Nous) ہندی فلسفے کے آتما سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ افلاطون دو طرح کی روحوں کا ذکر کرتا ہے۔ ایک تو لافانی و ازلی روح ہے اور دوسری فنا ہونے والی روح۔ موخر الذکر غیر عقلی اور مقید ہے جسم سے متاثر ہوتی ہے اسی کو افلاطون ایغو (Igo) کا نام دیتا ہے اس کے برخلاف لافانی و ازلی روح تصور کائنات ہے۔ ہر قید و بند سے آزاد ہے اس کو افلاطون "روح کل" (Universal Soul) سے تعبیر کرتا ہے چنانچہ افلاطون کا ایغو اور "روح کل" ہندی فلسفہ کی "جیو آتما" اور پرماتما سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

لہذا اپنشدوں کے فلسفہ کو عام تاریخ فلسفہ سے محض اس بناء پر خارج نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں باطنیت کے نقوش ملتے ہیں اگر ہم یہ نقطہ نظر اختیار کرتے ہیں تو پھر یونانی فلسفہ کے ایک بڑے حصہ کو بھی عام تاریخ فلسفہ سے خارج کر دینا پڑے گا۔ یہاں پر یہ جان لینا چاہیے کہ جو چیز فلسفہ کو غیر فلسفہ سے ممیز کرتی ہے وہ موضوع بحث نہیں بلکہ اس کو برتنے کا طریقہ کار ہے۔ اگر کسی دانشور کے نتائج الہام یا کشف کا سہارا نہ لے کر عقلی طور پر وجودی مسائل کا حل دریافت کرتا ہے تو پھر اس کے نظام فکر کو فلسفہ کے زمرے میں شامل کرنا پڑے گا خواہ اس پر مذہبی تصورات اور باطنی عقائد کے اثرات کیوں نہ پڑے ہوں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ فلسفہ کا بہت سارا مواد انھیں اقسام کے تجربوں کا اخذ کردہ ہے۔

یہاں پر مولانا نے اسلام اور عیسائیت کے ان نظام ہائے فلسفہ کا ذکر کیا ہے جنھوں نے فلسفہ کو مذہب کا تابع بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود ایسے تمام مقالات کو فلسفہ کے لٹریچر میں جگہ دی گئی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان اسکولوں نے عقلی طریقہ کے ذریعے ہی مذہب کو بیرونی حملوں سے بچانا چاہا تھا۔

سینٹ آگسٹائن اور دوسرے عیسائی مدرسین (Scholiasts) کے خطبات کو بھی فلسفہ ہی کے لٹریچر میں شامل کیا جاتا ہے اور یہی بات مسلمان مدرسین پر بھی صادق آتی ہے۔ اگر ہم مدرسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لٹریچر کو فلسفہ میں جگہ نہیں دیتے تو پھر ہمیں عرب فلسفہ کے ایک عظیم مذہب کے کارناموں کو بالکلیہ طور پہ خارج کر دینا پڑے گا۔

عرب فلسفیوں میں ابن سینا اور ابن رشد کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں مگر یہ واضح رہے کہ ابن رشد اور ابن سینا صحیح معنوں میں عرب فلسفہ کے نمایندے نہیں کہلائے جا سکتے۔ اصل میں وہ ارسطو کے فلسفہ کے شارح اور خوشہ چین تھے۔ اگر ہم خالص عربی فلسفہ سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو پھر مدرسین کی اُن تصنیفات کا مطالعہ کرنا ہوگا جو فلسفہ یونان کا رد کرتی ہیں۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دورِ جدید میں بشپ برکلے کو ایک زبردست فلسفی مانا جاتا ہے حالانکہ مذہب کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے اس نے فلسفیانہ تفکر کا سہارا لیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی بھی تاریخ فلسفہ برکلے کے بغیر مکمل نہیں ہے۔

لہذا زیلر کی یہ تنقید کہ ہندی فلسفہ نے کبھی مذہب کا دامن نہیں چھوڑا اور اس کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکا صحیح نہیں ہے غالباً اس نے یہ رائے اس لیے قائم کی ہے کہ ہندی فلسفہ نے ویدوں کے اقتدار کو تسلیم کیا ہے مگر زیلر ہندی فلسفہ کے ان مذاہب کو نظر انداز کر جاتا ہے جو ویدوں کو تسلیم نہیں کرتے ان نظام ہائے فلسفہ میں چارواک، بدھ مت اور جین مت کا شمار ہوتا ہے جو ناستک مذاہب کہلاتے ہیں بعض آستک مذاہب جیسے سانکھیہ اور نیائے ہیں وہ بھی ویدوں کی شہادت پر زیادہ زور نہیں دیتے۔ اس سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ بدھا کے زمانے میں ہندی فلسفہ نے مذہب سے ہٹ کر اپنا ایک علیحدہ مقام پیدا کر لیا تھا۔

تیسرا اہم مبحث یونان اور ہند کے فلسفیانہ ربط و تعلق کا ہے۔ بہر حال یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہند میں فلسفہ کا آغاز یونان سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اس بناء پر کیا ہم یہ رائے قائم نہیں کر سکتے کہ ہندی فکر نے یونانی فلسفہ پر اپنا اثر ڈالا ہوگا۔ وادیٔ نیل اور وادی فرات کی تہذیبیں یونان کے دور سے بہت پہلے اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھیں اور ہمارے پاس ایسی تاریخی شہادتیں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یونان کے فلسفہ پر ان تمدنوں نے اپنا اثر ڈالا تھا۔ اسی طرح کیا یہ بات ممکن نہیں ہو سکتی کہ ہند نے بھی راست یا بلا واسطہ طور پہ یونان کو متاثر کیا ہوگا؟

دورِ جدید کے مورخوں نے اس مسئلے پہ کافی غور کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ ابھی تک کسی فیصلہ کن نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں مگر اس حقیقت کو کوئی بھی طالب علم نہیں جھٹلا سکتا کہ یونان کے بعض فلسفیانہ مذاہب کی تعلیمات اور ہند کی تعلیمات میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے اس سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ ہندی فلسفہ نے یونانی فکر کو ضرور متاثر کیا ہوگا۔ مورخین اس نکتہ پر بہرحال متفق ہیں کہ یونانی فلسفے میں بعض ایسے فکری عناصر پائے جاتے ہیں جو اپنی نیچر کے لحاظ سے بالکل غیر یونانی ہیں۔ لازمی طور پر وہ ایشیا سے یونان کی فکری زندگی میں داخل ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر نجات یا موکش کا تصور یونان کے آرفک فرقہ (Orphic Cult) کا مرکزی تصور ہے۔ زیلر جیسا ماہر یہ تسلیم کرتا ہے کہ موکش کے تصور نے سب سے پہلے ہندوستان میں جنم لیا مگر وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ نجات کا تصور آرفک فرقہ میں ہند سے آیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ موکش کا تصور ایران سے وہاں آیا تھا۔ لیکن بعد کی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ایران قدیم کی زردشتیت میں نجات کے تصور کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ زیادہ صحیح قیاس تو یہ ہوگا کہ سب سے پہلے اس تصور کو ایران نے ہند سے لیا اور وہ پھر ایران کے ذریعہ یونان میں داخل ہوا۔

اس کے علاوہ یونان قدیم میں یہ عقیدہ رائج تھا کہ علم کی تلاش اور جستجو کے لیے مشرق کا سفر لازمی ہے اور تاریخ سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے کہ بیشتر یونانی فلسفی تلاش علم کی خاطر مشرقی ممالک میں جاتے ہیں چنانچہ مشہور یونانی فلسفی دیمقراطیس نے ایک طویل عرصہ مصر اور ایران میں گزارا تھا۔ فیثا غورث نے بھی مصر کا سفر کیا تھا۔ اسی طرح افلاطون اور سولن بھی مشرقی ممالک کا دورہ کر چکے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ یونانی مفکر ہند میں بھی آتے ہوں مگر یہ بات تاریخ سے ثابت نہیں ہوتی۔ فیثا غورث کے فلسفے میں ہندی فکری عناصر کافی طور پر سموتے ہوتے ہیں۔ اگر فیثاغورث کے فلسفہ کو ہندی فلسفہ کے طالب علم کے سامنے اس کا نام لیے بغیر رکھا جاتے تو وہ لازماً اسے کسی ایک ہندی مفکر کے فلسفہ سے تعبیر کرے گا۔

سکندر اعظم کی فتوحات سے بھی یونان و ہند کے روابط کا پتا چلتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ سکندر کے اتالیق ارسطو نے خود اسے ہند کی فکری بلندی کے بارے میں بہت کچھ بتلایا تھا۔ سکندر نے وادئ سندھ اور بحر متوسط میں کئی یونانی نو آبادیات قائم کی تھیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ہند سے یونان کے روابط اور بھی گہرے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد بدھ مت کو اشوک اعظم جیسے زبردست حکمران کا سہارا ملا تو بدھی تعلیمات مختلف تبلیغی اداروں کے ذریعہ مغرب اور مشرق بعید کے دور دراز ممالک تک پھیل گئیں۔

ان تمام شہادتوں کے ذریعہ مولانا غور و فکر کے آغاز کی حد تک یونان پر ہند کی سبقت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ ہندی فکر پر یونان کا بھی اثر پڑا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خاص طور پر یونانی علم ہئیت نے ہند کو متاثر کیا تھا ہند کا ایک مشہور ماہر ہئیت وراہا میرا (وفات ۵۸۷ عیسوی) اپنی کتاب "برہت سمہتیا" میں چند یونانی ماہرین علم ہئیت کے نام گناتا ہے ما لبیرونی کی "کتاب الہند" سے بھی یہ بات ثابت ہوئی ہے۔

اس مضمون کے خاتمہ پر مولانا ایک نہایت ہی اہم نتیجہ اخذ کرتے ہیں جو فلسفہ کے طالب علم کے لیے خاص اہمیت کا حامل ہے مولانا فرماتے ہیں ان تمام مباحث کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ کسی ملک یا قوم کی فوقیت کو ثابت کیا جائے اور ایشیا یا ہند کی برتری کا چرچا کیا جائے۔ اس طرح کی تہذیبی لین دین تو تاریخ کا پرانا سبق ہے۔ علم و دانش کو ہم جغرافیائی حدود میں مقید نہیں کر سکتے۔ وہ ان قیود سے آزاد ہے اس کا کوئی ملک نہیں۔ دانش کا فیضان کسی خاص قوم تک محدود نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ بارش کرم تو ہر مقام پر ہوتی ہے۔ اس پر سبھی قوموں کا حق ہوتا ہے یہ واقعہ کہ سقراط نے یونان میں جنم لیا اور اپنشدوں کے لکھنے والے ہند کی دھرتی کی پیداوار ہیں سوانحی نقطۂ نظر سے تو کارآمد ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک انسانی دانش کی تاریخ کا سوال ہے یونان اور ہندوستان کی قید نہیں۔ علم و حکمت کا اجالا تو ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔

آخر میں مولانا اپنے مخصوص انداز میں ایک عرب شاعر کی مشہور بیت نقل کرتے ہیں جو قبیلہ بنو عامر سے متعلق ہے مگر اس کا اطلاق انسانی دانش پر بھی ہو سکتا ہے:

لَا تَقُلْ دارُها بشرقِ نجدٍ
كُلُّ نجدٍ للعامريّةِ دارٌ

(ترجمہ) یہ مت کہو کہ اس کا گھر نجد کے مشرق میں واقع ہے۔ بنو عامر کے لیے تو تمام نجد ہی بمنزلہ گھر کے ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابوالکلام کی خطابت

نصراللہ خاں عزیز

قیامت کے روز جب داورِ حشر کے سامنے مسلمانانِ ہند کا مقدمہ پیش ہوگا۔ تو مجھے یقین ہے کہ استغاثے کے گواہوں میں شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید، شیخ احمد سرہندی، اورنگ زیب عالمگیر اور ٹیپو سلطان کے ساتھ مولانا ابوالکلام کو بھی بلایا جائے گا۔ جو اس بات کی شہادت دیں گے۔ کہ مسلمانانِ ہند کو انھوں نے ایک حیات افروز اور پیغمبرانہ انداز کے ساتھ دعوتِ حق دی مگر انھوں نے اس آوازِ صور پر بیدار ہو کر میدانِ عمل کی طرف بڑھنے کی بجائے خود بلانے والے کو اتنا مایوس کر دیا۔ کہ وہ ان سے منہ موڑ کر دوسری جانب روانہ ہو گیا۔

آج سے تیس بتیس برس پیشتر جب ہندوستان کے مسلمان سیاست میں ساحرِ افرنگ سے شکست کھا کر "امنا بالطاغوت" کا نعرہ عجز و خود فراموشی بلند کر چکے تھے۔ اور سرسید مرحوم کی بنائی ہوئی راہ پر چل کر جبر و قوت کے سامنے سربسجود ہو چکے تھے، یکایک کلکتہ سے ایک رعد آسا صدا بلند ہوئی۔ جو یکایک تمام ہندوستان میں گونجی اور مدہوشوں کو ہوشمند اور سوئے ہوؤں کو بیدار کر گئی۔ یہ صدا ایک گمنام نوجوان کے ہونٹوں سے بلند ہوئی تھی جو قلم اور زبان کی حیرت انگیز خداداد طوفان انگیزیوں کے ساتھ ہندوستان کے شہر خموشاں پر چھا گیا تھا پورا ملک حیرت و استعجاب کے ساتھ اپنے دل سے سوال کرنے لگا تھا کہ بیسویں صدی میں یہ قم باذن اللہ کون پکار اٹھا، اور یہ احمد المکنّٰی بابی الکلام الدہلوی مدیر الہلال کون ہے جس کے کلام میں جادو، زبان میں سحر اور تحریر میں اعجاز ہے۔ جو زبان کی کاٹ سے غافل دلوں کی بستیوں کو الٹ دیتا اور بھولے ہوتے حق کی طرف اس قوت اعجاز کے ساتھ بلاتا ہے کہ جو اس کی بات کو سمجھتا ہے۔ وہ بھی دیوانہ وار اس کی طرف دوڑتا ہے۔ اور جو نہیں سمجھتا وہ بھی مبہوت ہو کر ادھر ہی کی راہ لیتا ہے۔

مولانا نصراللہ خاں عزیز نے یہ مضمون ۱۹۴۴ء میں لکھا تھا اور "خطباتِ ابوالکلام آزاد" شائع کردہ ایم ثناء اللہ خان اینڈ سنز، لاہور میں بہ طور مقدمہ شامل کیا گیا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا ابو الکلام آزاد جن کو آج حکومت نے کسی نامعلوم مقام میں محبوس رکھا ہے اور جن کو نظر انداز کر دینے کی دعوت لے کر پرانے حریف تمام ملک میں بھر گئے ہیں، قید میں ہیں۔ مگر ان کی تقریریں، ان کی تحریریں اور ان کے ارشادات پرانے اوراق میں سے نکل نکل کر گلستانِ علم و ادب کی رونق بن رہے ہیں۔

ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

وقت کی سیاست نے مسلمانوں کو ابو الکلام کی سیادت سے محروم کر دیا۔ مگر ان کے قلم اور زبان سے نکلے ہوئے جملے اور فقرے آج بھی دلوں کے محبوب اور دماغوں کو مرغوب ہیں۔ مولانا ابو الکلام آج بھی کانگرس کے شو بوائے نہیں بلکہ دل اور دماغ کی مملکت کے تاجدار ہیں۔ اور زمانہ بادل ناخواستہ بھولے ہوئے افکار کے انبار میں سے ان موتیوں کو نکال نکال کر محفل زیست کی رونق بنا رہا ہے۔ جو ابو الکلام کے جواہر نگار قلم اور گوہر بار زبان سے ٹپکے تھے۔

ابو الکلام کی خطابت کا اندازہ صرف وہ خوش قسمت لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے اس جادو بیان مقرر کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا ہے بعض لوگ ان کو ہندوستان کا ڈماستھینز کہتے ہیں۔ کچھ بد ذوق انہیں گلیڈ اسٹون اور سسرو سے تشبیہ دیتے ہیں حالانکہ ابو الکلام آزاد کی خطابت کو ڈماستھینز اور سسرو اور گلیڈ اسٹون کی خطابت کے ساتھ مماثلت دینا ابو الکلام کی خطابت کی توہین ہے۔ اور بلا شائبہ ریب یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ کہ اس پایہ کا مقرر صدیوں سے پیدا نہیں ہوا۔ ذرا ابو الکلام کے خطبے کو پڑھو۔ اس میں بجلی کی کڑک رعد کی گرج' دریا کی روانی، سبزہ زاروں کی طراوت، پہاڑوں کا شکوہ، گلستانوں کا جمال' ناہید کا نغمہ کچھ اس طرح حسین تناسب کے ساتھ گھلا ملا ہوا ملے گا۔ کہ انسان محسوس کرے گا۔ میں وادی کشمیر کی سیر کر رہا ہوں۔

میں نے مولانا ابو الکلام کی سب سے پہلی تقریر اسلامیہ کالج' لاہور کے حبیبیہ ہال میں سُنی ایک اکہرے بدن کا سفید رنگ کا نوجوان۔ گویا کسی نے ہاتھی دانت کا انسانی قالب بنا کر اس میں روح پھونک دی ہے سبز ادنی رومال عمامے کی صورت میں سر پہ بندھا ہوا۔ گویا عرب کے کسی اجتماع سے کوئی آتش بیاں خطیب مجمع کو مبہوت کر کے ہندوستان میں آگیا ہے۔ یا پھر حسن بیاں مجسم ہو کر جلوہ آفریں ہے۔ اسی روز دوسری تقریر رات کو موچی دروازے کے باہر ہوئی۔ میں نے اُسے بھی سُنا۔ تیسری تقریر گجرات میں، اور چوتھی امرتسر میں سنی۔ ہر موقع کا تاثر آج تک یہ ہے کہ گیس کے ہنڈوں کی روشنی کی کرنوں پر رقص کرتا ہوا مضامین تازہ کا ایک سیلاب ہے جو اسٹیج پر سے ایک غیر معلوم چشمے سے ابل رہا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور وسیع مجمع پر ابر بہاری کی طرح محیط ہے سننے والے دم بخود دل ہی دل میں وجد کر رہے ہیں۔ فرمودات کی حقانیت، استدلال کی پختگی۔ زبان کی لطافت، الفاظ کی شوکت اور انداز بیاں کی پاکیزگی دل و دماغ۔ عقل اور جذبات دونوں کی صفوں کو یکساں مسخر کرتی جارہی ہے۔

امرتسر کے جلیاں والا باغ میں عشاء کے وقت مولانا تقریر کر رہے تھے مجھے وجدان ہی سے نہیں آنکھوں سے اس طرح محسوس ہو رہا تھا۔ گویا تقریر ایک نور کی چادر کی طرح تمام مجمع پر چھائی ہوئی ہے۔ یکایک قریب کی ایک مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی خطیب تھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ میں نے اس طرح محسوس کیا۔ گویا کسی نے چادر کو چاک کر کے مجمع کے سروں پر سے کھینچ لیا ہے۔ میں نے ہندوستان کے تمام مشہور و معروف مقرروں کی تقریریں سنی ہیں مگر یہ عجیب و غریب کیفیت کبھی محسوس نہیں کی۔

خطبات ابوالکلام میں مولانا ابوالکلام آزاد کی متعدد تقریریں آپ کو ملیں گی، میرا گمان ہے۔ کہ مطالعے کے دوران میں آپ بھی اس کیفیت کو محسوس کریں گے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام الہند کا طرزِ خطابت و تقریر

مولانا عبدالشاہد خاں شروانی

"حضرت مولانا آزادؒ کا طرزِ خطابت و تقریر ایک مستقل موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ پیشِ نظر مقالہ میں مولانا عبدالشاہد شروانی صاحب (علی گڑھ) نے ایک مشاہد و مُبصر کے انداز میں اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔" ادارہ"

یُوں تو مولانا ابوالکلام آزاد اپنے تدبر و تفکر، علم و فضل، ادب و انشاء سیاست و فراست اور ہدایت و ارشاد میں ہندو بیرونِ ہند کے علماء اکابر میں وہ ممتاز و بلند مقام رکھتے تھے کہ اس تک ان کے زمانہ و عہد میں کوئی دوسرا انہیں پہنچ سکا مگر ہندوستان کے عوام میں انہیں مقبولیت عظیم اُن کی بے مثال خطابت ہی کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔

تحریر و صحافت کا جہاں تک تعلق ہے وہ روش خاص جس پر مولانا چلے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم رہے۔ مقلدین و معاندین دونوں نے اس کی تقلید کرنی چاہی لیکن۔

این گلے را رنگ و بوئے دیگراست

کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھنے والوں نے اسے مُنہ چڑانا سمجھا اور لکھنے والوں نے اپنی کوتاہ قلمی اور مولانا کی اعجاز رقمی کا اقرار کیا۔ آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہؐ کے برمحل حوالے، جابجا اقوال و اشعار کا برجستہ صدور عبارت کا تسلسل اور عمدگی مطالب کے ساتھ زورِ بیان مولانا کی کی وہ خصوصیت رہی جسے کوشش و سعی کے باوجود دوسرے حاصل نہ کر سکے۔

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی مرحوم جیسے پختہ کار و کہنہ مشق شاعر کو کہنا پڑا ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

اردو کے مشہور ادیب سجاد علی انصاری مرحوم چیخ اُٹھے:

"میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو یا تو مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر منتخب ہوتی یا اقبال کی نظم۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے مسلّم ادیب و مشہور انشاء پرداز تو یہاں تک کہہ بیٹھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"الفاظ نبوت والوہیت کا جامہ پہنے ہوتے ہیں۔"

مولانا موصوف عنفوانِ شباب ہی سے تحریر و تقریر کے میدان میں اشہب زبان و قلم کو سرپٹ دوڑانے لگے تھے۔ جن لاکھوں کروڑوں انسانوں کو مذہبی، علمی اور سیاسی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ ان کی اعجاز بیانی اور سحر آفرینی کے قائل ہیں۔

نصف صدی قبل کے ایک عینی مشاہد کا بیان ملاحظہ کیجیے۔

مجلس ندوۃ العلماء اپنی امتیازی صفات کی بنا پر روشن خیال علمائے ہند کی قیادت کر رہی ہے علماء کی واحد نمایندگی کا حق صرف اس جماعت کو حاصل ہے، اپنے بہترین نصب العین کی وجہ سے اس کے سالانہ جلسے اپنی نظیر آپ ہوا کرتے تھے۔ اس کا ایک سالانہ اجتماع ہے.... صدارت کے لیے موجودہ دنیائے اسلام کی ایک عظیم الشان ہستی علامہ رشید رضا مرحوم ایڈیٹر المنار (مصر) کے نام کا غلغلہ مچ چکا ہے اور تشریف آوری کی دھوم مچی ہوئی ہے، دارالعلوم کے طلبہ چشم براہ ہیں جوشِ مسرت و وفورِ جذبات سے لکھنؤ کا ذرہ ذرہ استقبالِ مجسم ہے..... اہلاً و سہلاً کے نعروں سے لکھنؤ کی فضا گونج اٹھی، جوشِ اشتیاق سے فٹن کے گھوڑے کھول دیئے جاتے ہیں اور "وحدتِ ملیہ" کے اس علم بردار کو سر اور آنکھوں پر قیام گاہ پہنچایا جاتا ہے۔ ندوۃ العلماء کا اجلاس ہو رہا ہے، اس عالمِ بے بدل کو اس بات کا احساس ہے کہ علمائے ہند کے بہترین دل و دماغ یہاں موجود ہیں، اس لیے جب وہ تقریر کرتا ہے تو "بازارِ عکاظ" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جواہرات ہیں جن کو بڑی بے دردی سے بکھیرا جا رہا ہے، جوشِ بیان کا یہ عالم ہے کہ جیسے ایک بادل برس رہا ہو، اور کچھ بجلیاں ہوں جو خرمنِ ہوش و عقل پر گر رہی ہوں،

گو سامعین کا اکثر حصہ تقریر سمجھنے سے قاصر ہے لیکن طرز بیان سے سبھی مسحور ہیں۔ کامل ۲½ گھنٹے کے بعد جب خطیبِ مصر بیٹھتا ہے جنھوں نے سمجھا وہ خطاب کی سحر طرازیوں سے مسحور ہیں اور جنھوں نے نہیں سمجھا وہ اپنے قصورِ علم و فہم پر شرمسار اور ترجمہ کے متمنی ہیں۔ ...... کہ ایک نوجوان، علامہ شبلی صاحب (جو اس مجلس کے روحِ رواں تھے) کے پاس آکر عرض کرتا ہے کہ اگر تقریر کا ترجمہ ہو جاتا تو افادیت عام ہو جاتی، علامہ اس جرأت پر متحیر، رشید رضا کی تقریر کا بلا توقف ترجمہ!

اس تصور سے اس بے باکی پر کچھ حیرت دبرہمی ہوئی مگر نوجوان کے اصرار پر اجازت مل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتی ہے۔ نوجوان اسٹیج پر آتا ہے تقریر کا ترجمہ اور مفہوم بیان کرتا ہے مگر!
اپنے اعجازِ بیان اور جوشِ روانی سے سارے مجمع کو مسخر کر لیتا ہے، خطابت کی عشوہ طرازی دورِ جام و مینا ہے جس نے رندوں کو ایک مستقل کیف میں مبتلا کر دیا ہے الفاظ برقِ خرمن سوز کی طرح سامعین کے عقل و خرد پر گر گر کر انہیں بے خود کر رہے ہیں، کئی گھنٹے تقریر کرنے کے بعد اترتا ہے تو آگے بڑھ کر علامہ شبلی اس کو چمٹا لیتے ہیں۔

اس نوجوان کا نام احمد ہے اور کنیت ابوالکلام"

مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم اپنے ایک مکتوب میں خود مولانا ابوالکلام کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بات میں بات؟ جلسۂ ندوہ میں آپ کی تقریر کا عالم یادِ شوق میں اب تک تازہ ہے آپ کے کھڑے ہونے کا انداز، تقریر کا جوش، آواز کا لہجہ گویا دیکھ رہا ہوں، سن رہا ہوں حالانکہ تیس برس گزر گئے، سید رشید رضا کی عربی تقریر کا ترجمہ آپ سنا رہے ہیں، کان سن رہے ہیں۔ اسی مثال سے متاثر ہو کر میں نے اسٹریچی ہال (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں (ان کی) عربی کی اردو کر دی تھی"

خطابت کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ مقرر حاضرینِ مجلس پر اس طرح چھا جائے کہ انھیں "طاعت کردن و گردن نہادن" کے سوا چارۂ کار نہ رہے۔ مخالفین و معاندین بلکہ آمادگانِ شر و فساد کو بھی نہ صرف مجالِ انکار و دم زدن نہ رہے بلکہ وہ مسحور و مبہوت ہو کر رہ جائیں اور ان پر بھی معتقدوں اور غیر جانبداروں کی طرح وجد طاری ہو جائے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا مختلف مواقع پر بارہا تجربہ ہوا ہے کہ بڑے سے بڑے مخالف کو بھی ان کے لگائے ہوئے نعرے کو لگاتے اور چار چار پانچ پانچ گھنٹے خاموشی و سکون سے مسلسل تقریریں بیٹھے وجد کرتے روتے اور سر دھنتے دیکھا ہے۔

شاہ صاحب کی شانِ خطابت کا مظاہرہ ۱۳ر اپریل ۱۹۴۶ء کے جلسہ اردو پارک دہلی میں پورے طور پر ہوا جب کہ وزارتی مشن لندن سے ہندوستان آیا ہوا تھا، اور دورانِ جنگ کا وعدۂ آزادیٔ ہندوستان دنیا کو دکھانے کے لیے پورا کرنا چاہتا تھا، تمام جماعتوں کے لیڈروں سے سلسلہ ملاقات و گفتگو جاری تھی، مجلسِ احرارِ اسلام اور جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے مشترکہ جلسہ عام منعقد کیا گیا تھا تاکہ وزارتی مشن کے سامنے غیر لیگی مسلمان اپنا نقطۂ خیال پیش کر سکیں، اس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جلسے میں ملکی نمایندوں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی نمایندگانِ پریس بھی آئے تھے، پنڈت جواہر لال نہرو بھی شاہ صاحب کی تقریر سُننے کے شوق میں اپنے دیگر رفقاء کے ساتھ پہنچے تھے، سر اسٹیفورڈ کرپس بھی غیر لیگی مسلمانوں کی نمائندگی دیکھنے کے لیے جلسہ گاہ کا چکر لگا رہے تھے۔ دہلی میں اتنا شاندار اجتماع کسی کانفرنس میں بھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا، اردو پارک میں جہاں تک نظر جاتی تھی انسانوں کا سمندر موجیں مارتا ہوا نظر آتا تھا۔ لوگوں کا بیان تھا کہ جنوری ۱۹۴۶ء کے پہلے ہفتے میں میجر شاہ نواز، کرنل ڈھلن اور سہگل، آزاد ہند فوج کے سالاروں کی رہائی پر جو عظیم الشان جلسہ گاندھی گراونڈ میں ہوا تھا اس کے بعد دہلی کی سیاسی تاریخ میں اتنا بڑا جلسہ آج تک نہیں ہو سکا۔ تقریباً دو ڈیڑھ لاکھ کا اجتماع تھا، مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن اور پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریروں کے بعد شاہ صاحب نے چار گھنٹے تقریر کی جس میں مولانا ابوالکلام آزاد پر اظہارِ اعتماد اور مسٹر محمد علی جناح پر عدم اعتماد، متحدہ ہندوستان کی حمایت اور نظریۂ پاکستان کی مذہبی و سیاسی طور پر مخالفت کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے عام رجحان کی بنا پر کتنا خطرناک موضوع تھا، لیکن شاہ صاحب کی سحر آفریں تقریر نے "مولانا آزاد زندہ باد" اور "متحدہ ہندوستان زندہ باد" کے متفقہ نعرے لگوائے، مسلم لیگی سورما جلسہ کو درہم برہم کرنے کی سازش بنا کر آتے تھے اور اپنے تمام حربوں کے ساتھ موجود تھے مگر مخالفت میں ایک آواز بلند نہ کر سکے۔

مولانا آزاد کا کمالِ خطابت یہ تھا کہ وہ عوام و خواص دونوں کو متحیر بنا دیتا تھا اور نہ صرف وقتی وجذباتی طور پر بلکہ مستقل طور پر دلائل و براہین کی روشنی میں ساکت و صامت کر دیتا تھا۔

مولوی نصر اللہ خاں عزیز بی۔اے ادبی و صحافتی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، مدینہ اور کوثر کے مدیر کی حیثیت سے ہر ادب دوست کے جانے پہچانے آدمی ہیں "وہ خطباتِ آزاد" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"ابوالکلام کی خطابت کا اندازہ صرف وہ خوش قسمت لوگ لگا سکتے ہیں جنھوں نے اس جادو بیاں مفکر کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا ہے، بعض لوگ ان کو ہندوستان کا ڈماستھینز کہتے ہیں، کچھ بدمذاق انھیں گلیڈاسٹون اور سسرو سے تشبیہ دیتے ہیں حالانکہ ابوالکلام کی خطابت کو ڈماستھینز اور سسرو اور گلیڈاسٹون کی خطابت کے ساتھ مماثلت دینا ابوالکلام کی خطابت کی توہین ہے اور بلا شائبہ ریب یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس پایہ کا مفکر صدیوں سے پیدا نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوا۔ ذرا ابوالکلام کے خطبے کو پڑھو، اس میں بجلی کی کڑک، رعد کی گرج، دریا کی روانی، سبزہ زاروں کی طراوت، پہاڑوں کا شکوہ، گلستانوں کا جمال، ناہید کا نغمہ کچھ اس طرح حسین تناسب کے ساتھ گھلا ملا ہوا ملے گا کہ انسان محسوس کرے گا میں وادیٔ کشمیر کی سیر کر رہا ہوں۔

میں نے مولانا ابوالکلام کی سب سے پہلی تقریر اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں سُنی۔ ایک اکھرے بدن کا سفید رنگ کا نوجوان گویا کسی نے ہاتھی دانت کا انسانی قالب بنا کر اس میں روح پھونک دی ہے، سبز اونی رومال عمامے کی صورت میں سر پہ بندھا ہوا، گویا عرب کے کسی اجتماع سے کوئی آتش بیاں خطیب مجمع کو مبہوت کرنے ہندوستان میں آگیا ہے یا پھر حسن بیان مجسّم ہو کر جلوہ آفریں ہے۔ اُسی روز رات کو دُوسری تقریر موچی دروازے کے باہر ہوئی میں نے اُسے بھی سُنا، تیسری تقریر گجرات میں، چوتھی امرتسر میں سُنی، ہر موقع کا تاثر آج تک یہ ہے کہ گیس کے ہنڈوں کی روشنی پر رقص کرتا ہوا مضامین تازہ کا ایک سیلاب ہے جو اسٹیج سے ایک غیر معلوم چشمے سے اُبل رہا ہے۔ اور وسیع مجمع پر ابر بہاری کی طرح محیط ہے، سننے والے دم بخود دل ہی دل میں وجد کر رہے ہیں۔ "فرمودات" کی حقانیت، استدلال کی پختگی، زبان کی لطافت، الفاظ کی شوکت اور اندازِ بیان کی پاکیزگی دل اور دماغ، عقل اور جذبات دونوں کی صفوں کو یکساں مسخر کرتی جارہی ہے۔

امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں عشاء کے وقت مولانا تقریر کر رہے تھے، مجھے وجدان ہی سے نہیں آنکھوں سے اس طرح محسوس ہو رہا تھا گویا تقریر ایک نور کی چادر کی طرح تمام مجمع پر چھائی ہوتی ہے، یکا یک قریب کی ایک مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی، خطیب تھوڑی دیر کے لیے رُک گیا، میں نے اس طرح محسوس کیا گویا کسی نے چادر کو چاک کر کے مجمع کے سروں پر سے کھینچ لیا ہے میں نے ہندوستان کے تمام مشہور و معروف مقرروں کی تقریریں سُنی ہیں مگر یہ عجیب و غریب کیفیت کبھی محسوس نہیں کی۔"

امام الہند کے زمانۂ شباب میں تقریر کا ایک واقعہ جناب عبدالمجید خواجہ صاحب نے بیان فرمایا کہ ۱۹۲۳ء میں دھوراجی (کاٹھیاواڑ) میں خلافت کمیٹی کا جلسہ تھا، مولانا شوکت علی مرحوم مولانا نثار احمد کانپوری مرحوم وغیرہ شریک سفر تھے مولانا آزاد کی تشریف آوری کا اعلان ہو چکا تھا، اتفاق سے مولانا نہ پہنچ سکے، دھوراجی سے دو تین میل دُور اسٹیشن پر مولانا آزاد کے اشتیاق میں ہزار ہا انسان استقبال کے لیے پہنچ چکے تھے، مولانا شوکت علی کو جب خاص کارکنوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے یہ معلوم ہوا کہ یہ بے پناہ ہجوم مولانا آزاد کے استقبال کے لیے آیا ہوا ہے اور مولانا کے نہ آنے پر نہ تو جلسہ کی کامیابی کی امید ہے نہ خلافت کمیٹی کے لیے چندہ ہوسکے گا تو مولانا شوکت علی نے یہ داؤ کھیلا کہ مولانا آزاد سے خواجہ صاحب کی مشابہت (شکل) سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موصوف کو مولانا کے لقب سے خطاب کرتے ہوئے گاڑی میں اپنے برابر بٹھالیا اور شان دار جلوس کے ساتھ قصبے کو روانہ ہوئے۔ قصبے میں جو استقبالیہ دروازے بنائے گئے تھے مولانا کے نام کے دروازے تعداد اور سجاوٹ دونوں میں بڑھے ہوئے تھے، ہاتھ چومنے والوں اور نعرے لگانے والوں نے راستے بھر فرضی مولانا آزاد کو پریشان کر دیا تھا لوگ ایک دوسرے سے تعارف کراتے ہوئے موصوف کو مولانا آزاد ہی بتاتے تھے خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ میں نے تنگ آکر اس کی تردید کرنی چاہی تو شوکت صاحب نے اس زور سے نوچا کہ میں بلبلا گیا۔

شب کو جلسے میں مولانا کی تقریر سننے کے لیے لوگ ہمہ تن گوش اور سراپا اشتیاق بنے ہوئے تھے، شوکت صاحب نے خواجہ صاحب سے اصرار کیا کہ آج کی تقریر مذہبی تقریر ہو اور اس میں آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کا کثرت سے حوالہ دیا جائے۔ خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ جب میں تقریر کے لیے کھڑا ہوا تو انسانوں کے سمندر کا جوش و خروش دیدنی تھا، فلک شگاف نعروں نے زمین و آسمان ہلا دیے تھے مولانا کے نام کی تاثیر دیکھیے کہ تقریر ایسی شاندار ہوئی کہ ہزاروں روپے کی بارش ہوگئی اور مجمع بے حال اور بے قابو ہو ہو کر نعرے لگاتا رہا۔ اسی واقعہ سے اندازہ لگائیے کہ جہاں مولانا کے نام کی جگہ اُن کا ذہن و کام استعمال ہوتا ہوگا وہاں کیا گزرتی ہوگی۔

سب اُن پہ ہیں تصدق وہ سامنے تو آئیں
اشکوں کی آرزوئیں، آنکھوں کی التجائیں

خوش قسمتی سے مجھے بھی اس راہ میں کچھ مواقع ملے ہندوستان کے بہت سے خطیبوں کو بارہا سنا ان سب میں نواب بہادر خاں حیدر آبادی مرحوم اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ممتاز نظر آئے، آخر الذکر کو پانچ پانچ گھنٹے مسلسل بولتے دیکھا ہے، بچے بوڑھے، جوان عورت، مرد سبھی کو مسحور پایا ہے، ۲۳ اپریل ۱۹۴۷ء کو ایشیائی کانفرنس کے کھلے اجلاس میں افتتاحی اور صدارتی تقریر کرتے ہوئے بلبل ہند مسز روجنی نائیڈو مشہور خطیبۂ سندکی پہلی بار تقریر سنی ۶۸ سال کی عمر، ہفتہ بھر کی بیمار اور کانفرنس کے اہتمام میں مصروفیت اور تھکن کے باوجود جوشِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ لاکھوں کا مجمع آہ اور واہ کر رہا تھا، تمام مجلس پر بلا کا سکوت طاری تھا۔ تقریر

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انگریزی میں تھی لیکن نہ سمجھنے والے بھی مبہوت تھے، آواز کی گرج محفل پر بجلی بن کر گرتی تھی، کبھی سننے والوں کے لب پر آہ و بکا تھی تو کبھی کلماتِ تحسین و آفرین، اس سے پہلے انڈونیشیا کے وزیر اعظم ڈاکٹر شہریار، پنڈت جواہر لال نہرو، اور مہاتما گاندھی بھی تقریر کر چکے تھے لیکن یہ کیفیت مجمع پر کسی وقت بھی طاری نہیں ہوئی تھی۔

ان سب خطیبوں سے جب امام الہند کا مقابلہ کرتا ہوں تو یہی کہتے بنتا ہے ؎

ترا اے نو بہارِ باغِ عالم واہ کیا کہنا،
نہ ایسا رنگ پھولوں میں، نہ ایسے پھول گلشن میں

ہندوستان کی تقسیم کے بعد فسادات کا طوفان اور بھونچال دار السلطنت دہلی اور پنجاب پر خصوصاً اور اکثر اطراف ملک پر عموماً جس طرح آیا وہ ابھی کل کی بات ہے، یہ طوفان اتنا زبردست تھا کہ امام الہند جیسے کوہ وقار شخصیت کو بھی گوشہ عافیت سے نکال کر میدانِ خطابت میں بہا لایا۔ ۱۹۴۷ء کے آخر میں "جب دہلی میں محشرستان کا سماں تھا اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان جامع مسجد میں پناہ گزیں تھے" اس وقت امام الہند نے اپنا عہد توڑ کر قوم کو خطاب کیا، جمعہ کی نماز کے بعد شری راج گوپال آچاری گورنر جنرل ہندوستان کو ساتھ لے کر آئے پہلے راجہ جی نے پھر موصوف نے خطاب فرمایا، تقریر کے بعد بندھے ہوئے بستر کھل گئے اور بھاگتے ہوئے قدم جم گئے، آج دلی میں جو مسلمان نظر آرہے ہیں ان میں بڑی تعداد انہیں لوگوں کی ہے جنہوں نے امام الہند کی تقریر سننے کے بعد راہِ فرار سے منہ موڑا،

مشتے نمونہ از خروارے :-

"یہ دیکھو! مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو، جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش و خروش بیجا تھا اسی طرح آج تمہارا یہ خوف و ہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی، یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے، چند انسانی چہروں کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں، انھوں نے تمہیں جانے ہی کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمہارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں، یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ رخصت نہیں ہو گئے، اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو سال قبل عرب کے ایک اُمّی کی معرفت فرمایا تھا۔

"جو خدا پر ایمان لاتے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم"

ہوائیں آتی اور گزر جاتی ہیں، یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہاں ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلاء کا یہ موسم گزرنے والا ہے، یوں بدل جاؤ جیسے پہلے تم کبھی اس حالت میں نہ تھے۔ آج زلزلوں سے ڈرتے ہو کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے، آج اندھیرے سے کانپتے ہو کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اُجالا تھا۔ یہ بادلوں کے پانی کا سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لیے ہیں وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اُتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو اُن پر مسکرا دیئے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اٹھی تو رُخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے، یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے چودہ سو برس پہلے کا پُرانا نسخہ ہے وہ نسخہ جس کو کائناتِ انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا اور وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان!

لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین آج کی صحبت ختم ہو گئی مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں اختصار کے ساتھ کہہ چکا۔ پھر کہتا ہوں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور بار بار کہتا ہوں اپنے حواس قابو میں رکھو، اپنے گردوپیش، اپنی زندگی خود فراہم کرو، یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لا دوں، یہ تو دل کی دوکان ہی سے اعمالِ صالحہ کی نقدی پر دستیاب ہو سکتی ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

زبان ز نطق فرو ماند راز من باقی است
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقی است

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اردو ادب اور ابوالکلام آزاد

ماہرالقادری

مادرگیتی وسیع و فراخ آغوش سے صدیوں اور قرنوں کے بعد ایک ایسے فرزند کا ظہور ہوتا ہے۔ جو دنیا میں ادب وسیاست کا جدید باب کھولتا ہے۔ زمین اپنے محور پر لاتعداد گردشیں کرچکتی ہے، تو کہیں جاکر ایک ایسی ہستی پیدا ہوتی ہے۔ جس کے نام کو بقائے دوام اور جس کی شہرت کو خلود وثبات کی نعمتوں سے نوازا جاتا ہے، ایسے برگزیدہ نفوس کو افکار و آلام کے پہاڑوں سے ٹکرانا پڑتا ہے۔ مصائب اور پریشانیوں کے متلاطم سمندر سے گزرنا ہوتا ہے، مگر یہ تمام موانع و مشکلات اُن کے عزم کو مضمحل نہیں کرسکتے۔ ان قابل احترام ہستیوں پر آنے والی نسلیں فخر کرتی ہیں؛ اور ان کی زندگی کے سرد ھندلے سے دُھندلے نقش کی اپنے دِل و دماغ کی روحانی فوجوں سے حفاظت کرتی ہیں۔ یہ لوگ عام انسانوں سے بلند نظر رکھتے ہیں اور اشیاء کی حقیقت و ماہیت کا عام اشخاص کے مقابلہ میں ان کو زیادہ درک ہوتا ہے۔

مستقبل میں ان ہستیوں کا جواب شاذونادر ہی پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ جس کام کے لیے قدرت ان کو بھیجتی ہے اس کو وہ پورا کرجاتے ہیں، اور ان کی ذات "معیار کمال" بن جاتی ہے۔ یہی سبب تو تھا، کہ ایران کا مردم خیز خطہ فردوسی کے بعد دوسرا فردوسی پیدا نہ کرسکا، یونان میں ہومر کے بعد، دوسرا "ہومر" نظر نہ آسکا۔ اور بھارت ورش کی خاک "کالیداس" جیسا تابناک لعل پھر کبھی نہ اگل سکی۔

ایسے باکمال افراد کی زندگی پریشاں خاطری کا مرقع ہوتی ہے۔ ان کو کبھی اطمیناں نصیب نہیں ہوتا۔ مگر اُن کی محنتوں اور مساعی کا قدرت کی طرف سے یہ صلہ دیا جاتا ہے کہ وہ مرجاتے ہیں، لیکن ان کا نام کبھی نہیں مرتا، اُن کی شہرت کو دوام وہمیشگی عطا کی جاتی ہے۔ ان کے اصول اور نظریوں پر تمدن وتہذیب کی عمارتیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ تو تھی کہ صدہا حکومتیں بن بن کر بگڑگئیں، بیشمار تخت الٹ گئے، لاتعداد تاج خاک میں مل گئے، مگر ہیروڈوٹس کی تاریخ، سولن کے قانون، بیکن کی استقرائی منطق، ارسطو کے فلسفیانہ نکات، اور سعدی شیرازی کے درس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اخلاق کا ایک لفظ بھی تباہ نہ ہوسکا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ بات یہ ہے کہ بادشاہوں کی سطوت و جبروت کی بنیاد خود غرضی اور جلب منفعت پہ ہوتی ہے وہ دوسروں کے لیے کچھ نہیں کرتے، اور جو کچھ کرتے ہیں، اس میں بھی سیاسی مصالح اور ذاتی اغراض شامل ہوتے ہیں۔ پس دنیا کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ایسے خود غرض افراد کے مرنے کے بعد ان کے نام کو زندہ رکھے، البتہ وہ تاجدار، جن کے ایثار کے نقوش دنیا میں باقی ہیں، ان کا نام بھی دنیا میں باقی ہے،

جس طرح اردو شاعری کی غالب کے کلام سے عزت ہے، اور اگر غالب کے کلام کو اردو تغزل سے خارج کردیا جائے۔ تو اردو شاعری جسد بے روح اور یکسر بے جان ہو جاتی ہے، اسی طرح اردو ادب میں "مولانا ابوالکلام آزاد" کی نثر کا درجہ ہے۔ کہ اس شمع کے بغیر بزم اردو میں اجالا نہیں ہوسکتا۔ مولانا ابوالکلام کا شمار اُن نفوس قدسیہ میں ہے۔ جن کو قدرت کسی اہم مقصد کی تکمیل کے لیے دنیا میں بھیجتی ہے، اور جن کا ہر لمحۂ حیات قرنوں اور صدیوں سے زیادہ گرانمایہ اور بیش قیمت ہوتا ہے۔

ناقدر شناسی ہوگی۔ اگر اس سلسلہ میں ادب اردو کے محسنین کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے، بلاشبہ مولوی محمد حسین آزاد نے اردو ادب کو چار چاند لگا دیے۔ میرامن دہلوی نے زبان کو بہت کچھ سدھارا۔ حالی نے اردو ادب کی سطح کو بلند کردیا، رتن ناتھ سرشار نے بڑی شوخیاں پیدا کیں۔ نذیر احمد کے اسلوب نگارش نے اس آئینہ پر خاطر خواہ صیقل کی۔ مہدی افادی کے حسین و جمیل طرز انشا نے زبان کو صاف ستھرا بنایا، اور شبلی نے اردو ادب کو مغربی لٹریچر کے برابر کھڑا کردیا۔ مگر ابوالکلام نے ادب اردو کے جسم کو نہیں روح کو نوازا انھوں نے اردو لٹریچر میں غیر فانی زندگی پیدا کی اور اس کی بنیادوں کو مستحکم بنا دیا۔

مولانا ابوالکلام کو قدرت نے ایسا دماغ عطا فرمایا ہے کہ جس منزل میں آپ نے قدم رکھا۔ کامیاب ہوتے جس خاک کے ذرّہ کو آپ نے ہاتھ لگایا، رشک ماہتاب بنادیا، جس سوسائٹی میں شرکت کی، اس کو شرف و مجد کا گہوارہ بنا کر چھوڑا، سیاسیات میں وہ آج اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اُن کی حریت رائے کو کوئی قوت مغلوب نہیں کرسکتی۔ قوم و ملک کے وہ سب سے زیادہ صحیح نبض شناس ہیں۔ آزادی وطن کی خاطر ان کو مصائب و آلام کے تلخ ترین جام پینا پڑے۔ مگر اُن کی پیشانی پر بل بھی نہ پڑا۔ میں مولانائے موصوف کی سیاسی زندگی پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتا، کہ میرے موضوع سے یہ بحث خارج ہے، اور پھر اس دریا کو کوزے میں بھرا بھی نہیں جاسکتا۔ کسی رسالہ کے چند صفحے اس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے کب کافی ہو سکتے ہیں، کیونکہ اگر آپ کی "سیاسی خطابت" کو ہی لیا جائے، تو اس پر دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں، وہ خطابت نہیں فرماتے، جادو کرتے ہیں، وہ روح القدس کی زبان سے بولتے ہیں، اور ان کا لفظ لفظ ادبِ لطیف کے عطر میں ڈوبا ہوتا ہے، ان ضروری باتوں کی طرف اشارہ کر کے اصل موضوع پر آتا ہوں۔

"ابوالکلام" کی نثر میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انتہائی مربوط ہوتی ہے۔ ایک لفظ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں کیا جا سکتا۔ فعل، متعلقات، مبتدا، خبر سب میں ایک خاص معنوی ترتیب ہوتی ہے۔ اور ہر ٹکڑا اپنی جگہ پہ پہاڑ کی حیثیت رکھتا ہے جس کو کس طرح بھی ہٹایا نہیں جا سکتا۔ دوسرے انشاپردازوں کی نثر میں، آپ رد و بدل کر کے بہت کچھ زور اور خوبی پیدا کر سکتے ہیں، مگر ابوالکلام کو الفاظ اور جملوں کے ربط و ترتیب میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ ان کے ایک جملہ کی ترکیب کو بھی آپ نے الٹ پلٹ کر دیا تو حسن کے بجائے قباحت اور وزن کے بجائے ہلکا پن پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ اس درجہ بلند ہو کر لکھتے ہیں کہ اس میں مزید ارتفاع کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ابوالکلام نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ اُن کے جملوں کے امتزاج و تالیف سے ترنم کی ایک شان پیدا ہوتی ہے۔ ان کی تحریر پڑھتے وقت زبان لطافت محسوس کرتی ہے اور سامع پر کیف کی بارش ہونے لگتی ہے، وہ اپنی نثر کے ذریعہ انسانی خیال کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔ جہاں سرور کے آبشاروں کا شور سنائی دیتا ہے اور کیف و نشاط کے چشمے اُبلتے ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ اس کو پڑھ کر دماغ ذرا سا بار بھی محسوس نہیں کرتا۔ اور وجدان ایک لحہ کے لیے بھی مشوش نہیں ہوتا۔ وہ دوسرے انشاپردازوں کے برخلاف بڑے بڑے جملے لکھتے ہیں۔ لیکن ایک ایک لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوتا ہے۔ جملہ کے پہلے لفظ سے آخر لفظ تک، ایسا دلفریب تسلسل ہوتا ہے کہ طوالت قطعاً ناگوار نہیں گزرتی، اس کے ماسوا جملہ کی ہیئت ترکیبی اس قدر لطیف ہوتی ہے کہ ہر ٹکڑا مصری کی ڈلی معلوم ہوتا ہے۔ شیرینی، سلاست، گھلاوٹ، نزاکت، لطافت، تمام کی تمام خوبیوں سے ایک ایک جملہ لبریز ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام کی اسی چیز سے متاثر ہو کر "رئیس المتغزلین" سید الاحرار مولانا حسرت موہانی بے اختیار کہہ اٹھے کہ:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں بھی مزہ نہ رہا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علامہ "ابوالکلام" کے دماغ میں نہ معلوم الفاظ کے کتنے خزانے محفوظ ہیں کہ ختم ہی نہیں ہوتے۔ جس مضمون کو پڑھیے، اس میں موضوع کی اہمیت اور نفسیاتی عظمت کے اعتبار سے آپ کو خاص الفاظ ملیں گے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ الفاظ میں جادو ہوتا ہے۔ مگر یقین جانیے کہ جب تک الفاظ کا استعمال صحیح طور پر نہ ہو۔ ان کی سحر انگیزی قائم نہیں رہ سکتی، الفاظ کا جادو اسی وقت چل سکتا ہے، جب ان کو موقع و محل پر کام میں لایا جائے۔ دنیا کا کوئی لفظ بھی فی نفسہٖ غیر فصیح اور ثقیل نہیں ہے جب اس کو موقع پر استعمال کیا جائے گا، اس کی فصاحت باقی رہے گی۔ اور جب اس کا استعمال مرکز سے ہٹا ہوا ہوگا۔ اس کا حسن خاک میں مل جائے گا، اس کے مطالعہ سے نگاہ کو تکلیف ہوگی۔ اس کے سننے سے سامع مجروح ہوگا۔ اور اس کے دہرانے سے زبان گرانباری محسوس کرے گی، ایک جاہل اور عالم دونوں قریب قریب ایک ہی طرح کے الفاظ بولتے ہیں۔ لیکن جاہل، الفاظ کا صحیح موقع پر استعمال نہیں کرتا۔ جس کے سبب سے اس کی باتوں سے جی الجھتا ہے، لیکن عالم الفاظ کی نشست کو بے موقع نہیں ہونے دیتا۔ یہی سبب ہے کہ اس کی باتیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور دل چاہتا ہے کہ یہ گھنٹوں اسی طرح گل افشانی کرتا رہے۔ مثال کے طور پر "ہاتھی۔ فیل اور چنگھاڑ، کو لیجیے یہ تینوں الفاظ اپنی جگہ پر فصیح ہیں۔ ایک شخص ان الفاظ کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ "ہاتھی چنگھاڑ رہا ہے"، دوسرا کہتا ہے کہ "فیل چنگھاڑ رہا ہے" وہ لوگ جن کو ادب سے ادنیٰ سا بھی لگاؤ ہے بلا تامل اس امر کا فیصلہ کر سکتے ہیں، کہ پہلا جملہ فصیح اور دوسرا جملہ غیر فصیح ہے، حالانکہ جملہ کی ترکیب و ساخت، اور الفاظ کی نشست میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی گئی۔ معنیٰ کے لحاظ سے بھی کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ پہلے جملہ سے جو مطلب نکلتا ہے دوسرا بھی اسی کا مظہر ہے۔ مگر دوسرا جملہ ہاتھی کی چنگھاڑ سے زائد سمع خراش ہے اور اس کے ادا کرنے میں زبان کو لڑکھڑانا پڑتا ہے۔ پس وہی انشاء پرداز کامیاب بن سکتا ہے جس کو الفاظ کے استعمال کا نانئد سے زائد سلیقہ ہو۔ "ابوالکلام" اس صنف میں اپنا جواب نہیں رکھتے ..... وہ الفاظ کی روح سے واقف ہیں۔ اور حروف کے مخارج پر ان کی نظر ہے۔ الفاظ کے امتزاج کا سامعہ اور ناطقہ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس راز سے ان کا ادبی وجدان بخوبی باخبر ہے، وہ الفاظ نہیں لکھتے، موتی پروتے ہیں۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے اگر انسان کی قلبی کیفیات کی تقسیم کی جائے تو وہ دو اجزا پر تقسیم ہو جائیں گی۔ اور یہ اجزا "قنوطیت" اور رجائیت ہیں۔ تمام دنیا کے مختلف النوع اور متباین الجنس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسانوں کے حالات پر غور کرو۔ تو اُن کو یاس ورجا کی کشمکش میں مبتلا پاؤ گے، اسی اعتبار سے بعض انشاء پردازوں نے "قنوطیت" کو اور بعض نے "رجائیت" کو اپنا موضوع قرار دیا۔ لیکن یاس انگیز مضامین سے عبرت حاصل کی جا سکتی ہے، مگر خیالات کی بلندی، عزم کے استحکام اور بلند حوصلگی میں ان سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ بلکہ اس کے برخلاف دل، اضمحلال کی طرف مائل ہوتا ہے اور خیالات میں پستی پیدا ہو جاتی ہے۔ "ابوالکلام" ایک سپاہی مسلمان ہیں، جن کے دامن امید ورجا کو یاس نے کبھی نہیں چھوا، یاس انگیز مضامین کو وہ ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ وہ رجائی ہیں اور دوسروں کو بھی "رجائیت" کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ غم انگیز موضوع کو وہ کبھی نہیں چھیڑتے۔ اُن کے قلم نے ترکی شہیدوں کی لاشوں پر ماتم بھی کیا ہے، ان کی آنکھوں سے کانپور کے خونیں ہنگامہ پرخون کے آنسو بھی ٹپکے ہیں، طرابلس الغرب کے مسلم یتیموں اور بیواؤں کی چیخوں پر بھی انھوں نے لبیک کہی ہے۔ مگر اس خونیں ماحول اور غم انگیز فضا میں ان کی ایک سانس کو بھی قنوط کا کوئی جھونکا جنبش میں نہیں لا سکا، وہ تو ہر خونچکاں کفن، اور ہر مجروح سینہ کی زبان سے نصرت و کامرانی کی بشارت سناتے ہیں۔ تاکہ قوم میں حرکت پیدا ہو۔ اُردو زبان میں، ابوالکلام، اس طرز کے موجد ہیں، وہ رُلاتے نہیں۔ ہنساتے ہیں، وہ بے پناہ طریقہ سے تڑپاتے ہیں۔ مگر ہر تڑپ کو وہ عملی اضطراب کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں، شاید اسی اسلوب نگارش سے متاثر ہو کر رئیس احرار مولانا محمد علی مرحوم نے فرمایا تھا کہ "ابوالکلام کی نثر" اور اقبال کی شاعری سے میں نے لیڈری سیکھی ہے۔"

انشا پردازی اور خطابت کا بڑا کمال یہ ہے۔ کہ موضوع سے خارج کوئی چیز بیان نہ کی جائے۔ اور اگر ناگزیز طور پر کوئی چیز خارج از موضوع ضمناً آ جائے، تو اس سے بھی موضوع کو مناسبت خاص ہونا لازمی ہے، عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ پرجوش مقررین اور انشاء پرداز، خیالات کی رو میں اِدھر اُدھر بھٹک جاتے ہیں۔ اور خارج از موضوع مباحث کو لے بیٹھتے ہیں، مگر ابوالکلام، ایک لفظ بھی موضوع سے ہٹا ہوا نہیں کہتے، بات یہ ہے کہ جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں اس کے ہر پہلو پر اُن کی نظر ہوتی ہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں تو وہ بیان کرے، جس کے پاس موضوع کے متعلق مواد نہ ہو۔ جو شخص خیالات اور معلومات کے سمندر لیے بیٹھا ہو، اُس کو چھوٹے اور اُتھلے حوضوں سے دو ایک چلو پانی لینے کی کیا ضرورت ہے۔

~~انشاپردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ موضوع کے کسی گوشہ کو تشنہ نہ چھوڑا جائے~~

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑھنے والے کے دِل میں جس ادنیٰ سے ادنیٰ شبہ کے پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔اس کا ازالہ کر دیا جائے، دلائل مضبوط اور براہین مستحکم ہوں۔صرف الفاظ کی رنگینی اور جملوں کی دلآویزی کو ہی آلۂ کار نہ بنایا جائے" ابوالکلام" اس صنف میں تمام انشاء پردازوں سے آگے نظر آتے ہیں۔ابہام اور الجھاؤ کا تو سایہ بھی ان کی تحریر پر نہیں پڑتا۔ہر بات کو خوب کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔الفاظ کی شوکت اور جملوں کی دلفریبی کے ساتھ ساتھ قوی دلائل لاتے ہیں، تشریح واطناب کا یہ پہلو اس درجہ حسین وجمیل ہوتا ہے کہ ایک ایک بات دِل میں اترتی جاتی ہے، مقدمہ کو بہترین طریقہ پر ترتیب دے کر اس سے نتیجہ مستنبط کرنے کی ان میں بے پناہ قابلیت موجود ہے، لطف تو یہ ہے کہ اس سنگلاخ وادی میں ان کے قلم کو کہیں لغزش نہیں ہوتی ان کا اصل رنگ بدستور باقی رہتا ہے اور مضمون پڑھنے والے کی زبان سے ہر بار یہ مصرع نکل جاتا ہے کہ،

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ابوالکلام کی نثر کی بڑی خوبی "جوش واثر" ہے۔چونکہ وہ رجائی ہیں۔لہٰذا اُن کا لفظ لفظ جوش واثر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور ساتھ ہی واقعات کی تصویر بھی نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے جہاد کا ذکر کریں گے تو محسوس ہو گا کہ مجاہدین کی تلواریں واقعی بے نیام ہیں، ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین کی طنابیں لرز رہی ہیں۔تکبیر کے نعروں سے رزمگاہ میں گونج پیدا ہو گئی ہے۔باطل کا پرچم سرنگوں ہو رہا ہے اور حق کی فتح ہو رہی ہے، کسی تحریک کے لیے اُبھاریں گے، تو انداز نگارش، اس درجہ پر جوش اور مؤثر ہو گا کہ پڑھنے والے کو یقین ہو جاتا ہے گا۔کہ کونین کی فلاح وبہبود کا دارومدار، اِس طریق کے شمول واشتراک میں ہی ہے، دعوتِ تحریک کے ضمن میں ایسے پُرجوش الفاظ لائیں گے۔کہ ساکن سے ساکن دماغ اور پتھر سے پتھر دل میں بھی حرکت پیدا ہو جائے۔ان کا انداز تحریر دلوں کو دہلا دینے اور کپکپا دینے والا ہوتا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو جوش سے معمور کر دیں اور دنیا کا ہر تغافل آمیز سکون حرکت سے مبدّل ہو جائے۔بالکل صحیح ہے کہ اُن کے مضامین ہنگامہ خیز ہوتے ہیں، لیکن وہ تخریبی ہنگامہ نہیں۔بلکہ تعمیری ہنگامہ چاہتے ہیں۔غرض ان کے ہر لفظ کے سینہ میں "نپولین"، کا دھڑکتا ہوا دل نظر آتا ہے۔

ابوالکلام کا مطالعہ اس قدر وسیع ہے کہ متوسط قابلیت کا انسان اس کا اندازہ بھی نہیں کر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکتا کہ ابوالکلام نے علوم کی تحصیل کسی ڈگری اور فضیلت کے لیے نہیں کی، بلکہ انھوں نے علم کو علم کے لیے حاصل کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اکثر ایسی گہری اور جامع باتیں بیان کر جاتے ہیں، جس کی طرف عوام تو کیا خواص کا بھی ذہن منتقل نہیں ہو سکتا، اُن کا مطمحِ نظر "چھلکا" نہیں ہوتا بلکہ مغز ہوتا ہے وہ صرف الفاظ کے خوش نما کھلونوں سے ناظرین کو بہلانا نہیں چاہتے اُن کا مقصدِ نگارش نمود و نمایش، حصولِ تحسین، تمنائے شہرت نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر لفظ سے ایک عملی ہنگامہ پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ حرکت و عمل ہی قومیت کی تعبیر کر سکتے ہیں، ژرف بینی، بلند نگاہی، معاملہ فہمی اور دقّت پسندی ان کی ادبی زندگی کے چند نقوش ہیں۔ اسی باعث وہ الفاظ کا کبھی غلط استعمال نہیں کرتے مولانا عبدالماجد دریا بادی مصنف "فلسفہ جذبات" نے Pleasure اور Pain کا ترجمہ حظ و کرب کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام نے حظ و کرب کی جگہ لذت و الم الفاظ پیش کیے مولانا عبدالماجد صاحب نے اپنے الفاظ پر اصرار کیا۔ اس پر علامہ "ابوالکلام" نے الہلال میں جو مضامین ارقام فرماتے ہیں، ان سے آپ کی معلومات اور عمیق نظری کا اندازہ ہو سکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالکلام کے وجدان کی انگلیاں الفاظ کی نبض پر ہمیشہ رہتی ہیں۔

مولانا ابوالکلام کا اصل موضوع "قرآن" ہے قرآنی تعلیمات، ابوالکلام کے دل و دماغ پر کچھ اس طرح چھا گئی ہیں۔ کہ وہ کونین کے اس مکمل ترین ضابطہ کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے۔ قدم قدم پر یہی صحیفۂ قدس ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ پس وہ چاہتے ہیں کہ ایک ایک ذرّہ کا سینہ چیر کر اُن میں قرآنی تعلیمات کے غیر فانی انوار بھر دیں، قرآنی آیات کا ترجمہ کرنے میں ان کو وہبی طور پر ایسا ملکہ حاصل ہے کہ عربی کی اہمیت قریب قریب ترجمہ میں باقی رہتی ہے۔ اور زبان کا لطف بھی زائل نہیں ہوتا، دوسرے مترجمین اس قدر شدت کے ساتھ ترجمہ میں لفظی پابندی کرتے ہیں۔ کہ جملہ کا کہیں سرا ہی نہیں ملتا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ترجمہ کے مطالعہ سے جی کو ایک قسم کی الجھن ہوتی ہے۔ اور عقیدت مند دل کسی اچھے اور بامحاورہ ترجمہ کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ آیات قرآنی کو عبارت میں اس خوبی کے ساتھ کھپاتے ہیں کہ بعض وقت معاذ اللہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ اسی عبارت اور موقع کے لیے یہ آیت اُتری تھی "ابوالکلام" نے جو قرآنی آیات کے تراجم کیے ہیں، وہ فی الحقیقت اردو ادب کے لیے باعث فخر اور وجہ عزت ہیں۔ ترجمہ سے بڑھ کر خوبی آپ کی تفسیر میں موجود ہے۔ ایک ایک نکتہ کو بیان کرتے ہیں۔ ایک ایک خصوصیت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، شان نزول سے لے کر آیت کی افادی حیثیت اور اس کے نتائج و اسرار تک تمام

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باتیں اس خوبی سے ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔ بعض بعض جگہ امام رازی وغیرہ جیسے اکابر مفسرین سے بھی اختلاف کر جاتے ہیں۔ مگر اس اختلاف کی بنیاد خالص نیک نیتی پر ہوتی ہے۔ اور پیرایۂ نگارش انتہائی متین اور سنجیدہ ہوتا ہے، سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہی کو لو۔ جو اپنی جامعیت، زورِ قلم، استدلال اور فصاحت میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ دورِ حاضر میں اردو زبان میں اس سے بہتر کتاب شاید نہیں لکھی گئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد، اگرچہ شاعر نہیں ہیں، لیکن وہ بہترین "سخن شناس" ہیں، فارسی، عربی، اردو شعراء کے وہ اشعار جن کو اگر تیر و نشتر کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا، اُن میں سے اکثر ابوالکلام کے حافظہ میں محفوظ ہیں، اپنی تحریر میں وہ اکثر اشعار کا استعمال کرتے ہیں، اگر شعرائے کرام معاف فرمائیں، تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا، کہ اُن کی "گوہر شب چراغ نثر" شعر کے موتیوں کو اور زیادہ چمکا دیتی ہے، اور شعر کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے، وہ شاعر بڑا خوش قسمت ہے، جس کو ابوالکلام جیسا شارح اور مفسر ملا ہو۔ ابوالکلام شاعر نہ ہونے کے باوجود شعریت کی روح سے باخبر ہیں جو شعر جس موقع پر استعمال کرتے ہیں، اس سے بہتر موقع اس کے استعمال کا ہو ہی نہیں سکتا بعض جگہ غزل کی غزل نقل کر جاتے ہیں جس کا ہر شعر اُن کے موضوع کی تائید کرتا ہے۔ غرض ابوالکلام کو اشعار کے برمحل استعمال کا بہترین سلیقہ ہے، اور یہ وہ کمال ہے جو ہر انشاء پرداز کو حاصل نہیں ہوتا۔

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے۔ ان تمام مقدمات کو ذہن میں رکھ کر مندرجہ ذیل نثر کا مطالعہ کرو جو ابوالکلام کے ایک طویل مضمون کا ٹکڑا ہے۔

"یاد رکھو، وہ خدا جو مکان و زمین سے منزہ ہے جب دنیا میں آتا ہے، تو اپنے بسنے کے لیے گھر چاہتا ہے۔ زمین کی شاندار آبادیاں، پہاڑوں کی سربفلک چوٹیاں، سمندروں کی ناپیدا کنار موجیں، صحراؤں کے وسیع میدان، یہ سب اس کے لیے بیکار ہیں۔ بادشاہوں کے تختِ ہیبت و اجلال، لعل و جواہر سے لبریز خزانے، بڑے بڑے گنبدوں اور ستونوں کے عظیم الہیئت ایوان و محل اس کا گھر نہیں بن سکتے، تم اُس کے لیے گھر پیدا کرو جو اس کے جمالِ قدس کا نشیمن، اور اس حُسنِ ازلی کا کاشانہ بن سکے۔

تم جو اس کی جستجو میں لگنا چاہتے ہو، بہتر ہے کہ پہلے اپنی جستجو میں لگو، تم کہ اس کے نہ ملنے کے شاکی ہو، چاہیے کہ پہلے اپنی گم گشتگی پر ماتم کرو، اس کے حریمِ محبت کا دروازہ ہمیشہ سے بے حجاب ہے، اس کے کاشانۂ وصال کے بابِ عشق نواز پر کوئی پاسبان نہیں، وہ تو ہر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آن وہر لمحہ اپنے تلاش کرنے والوں کا منتظر ہے۔ لیکن ساری محرومی اس میں ہے کہ تمہارے پاس کوئی مکان ہی نہیں، جو اس کے قدوم محبت کا مکین بن سکے۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندامِ ماست
ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس دشوار نیست

اس کے بسنے کے لیے چاندی، سونے کا محل اور صندل و آبنوس کا تخت مطلوب نہیں ہے جس میں لعل و الماس کے ٹکڑے جڑے ہوں، وہ ان دلوں کا طالب ہے جن میں درد محبت کے زخموں سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہوں اس کے لیے فقیروں اور خاک نشینوں کی ایک ایسی جماعت چاہیے۔ جن کے دل ٹوٹے ہوئے، جن کے گھر جلے ہوئے، جن کی آنکھیں خونبار ہوں یہی ٹوٹے ہوئے کھنڈر اس کے رہنے کے لیے ایوان و محل ہیں، اور یہی اُجڑی ہوئی بستیاں ہیں، جن کو اس نے اپنی آبادی کے لیے چن لیا ہے، وہ کہ آبادیوں کی رونق، صحراؤں کی فضا، پہاڑوں کی بلندی، ملکوت والسموات کی بوقلمونی ہے اپنی طرف متوجہ نہ کرسکی، دلوں کی اجڑی ہوئی بستیوں اور ٹوٹی پھوٹی دیواروں کو اپنا کاشانۂ وصال بناتا ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا

(سورۂ احزاب)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کردیا اور اس بار گراں کے متحمل نہ ہوسکے۔ لیکن انسان آگے بڑھا اور اس نے بلا تامل اُٹھا لیا۔ کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے اوپر سخت ظلم کرنے والا اور سرگشتۂ نادانی ہے۔

پس اس قدوس و قدیم کا دنیا میں کوئی گھر ہوسکتا ہے تو صرف ان انسانوں کے دل ہی کا آشیانۂ محبت ہے۔ جنہوں نے اس گھر کو اس کے بسنے کے لیے پہلے ہی سنوار رکھا ہے۔ اور اس کی آرائش و تزئین سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ دُنیا کے گھروں کی طرح اس کے گھر کی آرائش کے لیے نہ تو حریر و اطلس کے پردوں کی ضرورت ہے، نہ دیبا و قاقم کے فرش و قالین کی اس کی آرائش کے لیے صرف ایک چیز مطلوب ہے، یعنی زخم محبت کی خونابہ فشانی، جس کے چھالوں سے اُس کی دیواریں ہمیشہ گلزار رہیں (فارسی کی کہانی اور اشعار میں نے حذف کردیے ہیں —— ماہر)
پس اگر تم اس کے طالب ہو تو ایک جماعت پیدا کرو۔ جو اس کے جلال و قدوسیت کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آشیانہ بنے، اگر تمہارے پاس گھر نہیں ہے تو بسنے والے کی تلاش میں کیوں سرگرداں ہو؟ مکین سے پہلے چاہیے کہ مکان کی فکر کر لو۔

مولانا ابوالکلام اگر یورپ میں پیدا ہوتے تو نہ معلوم کتنی انجمنیں ان کے نام پر قائم ہوتیں۔ کتنے اداروں میں ان کی ادبی اور سیاسی تعلیمات کا درس دیا جاتا، کتنے مطابع کی مشینیں صرف ابوالکلام آزاد کی تصنیفات کے لیے وقف رہتیں۔ لیکن آہ! غلام ہندوستان نے قدر شناسی کے جوہر کو بھی دوسری خوبیوں کی طرح زائل کر دیا، مندرجہ بالا نثر، اس بحر مواج کے چند قطرے اور اس فردوس کی چند کلیاں ہیں۔ اور مجھے غور کر کے بتاؤ کہ اس سحر طراز انشاء پرداز کی ملک وقوم نے کیا قدر کی؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ تو پھر مجھے مشورہ دو کہ ملک کے جمودِ احساس کا آخر کون سے ہاتھوں سے ماتم کیا جائے، ہندوستان کے ادبی رسائل۔ ابوالکلام کے تذکرہ سے یکسر خالی ہیں۔ ہماری ادبی انجمنوں میں اس مایۂ ناز ادیب کا ذکر بہت کم آتا ہے، ہمارے نوجوان انشاء پرداز میکالے گبن، ہربرٹ، اسپنسر، ٹینی سن اور شکسپیئر کی تصانیف پر قلم اٹھاتے ہیں۔ مگر ان کو یہ نصیب نہیں ہوتا کہ وہ اپنے وطن کے اس قابلِ قدر ادیب کے کارناموں پر قلم اٹھائیں۔ جن پر سیکڑوں میکالے اور ہزاروں اسپنسر بیدریغ نچھاور کیے جا سکتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ "علامہ ابوالکلام" اس وقت بڑی خاموش زندگی بسر کر رہے ہیں اور عام طور پر ان کا کوئی ادبی مضمون کسی اخبار یا رسالہ میں نظر نہیں آتا لیکن اس سکوت کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ ان کی گذشتہ ادبی خدمات کو فراموش کر دیا جائے۔ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ ہمارے مدارس کے اردو نصاب میں ابوالکلام کا ایک مضمون بھی شامل نہیں ہے۔ حالانکہ دوسرے انشاپردازوں کے مقابلہ میں ابوالکلام کے مضامین اخلاق کی تعمیر کے سب سے زیادہ ذمہ دار اور ضامن ہیں، الہلال کے فائل دنیا سے مٹ نہیں گئے ان سے بہت انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ شاید نصاب کے مرتب کرنیوالوں کا یہ خیال ہو کہ ابوالکلام کے مضامین میں سیاسیات کا حصّہ بہت کچھ شریک ہوتا ہے۔ اوّل تو طلبہ میں سیاسی بصیرت کا پیدا ہونا ایک بڑی مفید بات ہے۔ لیکن یہ چیز منظور نہ تھی تو آپ کے مضامین سے ایسے بہت ٹکڑے لیے جا سکتے تھے۔ جن کو ہر طریقہ پر خالص ادبی کہا جا سکتا ہے۔ کاش محکمۂ تعلیم کو اس طرف توجہ کرنے کی توفیق ہو۔

میں نے الہلال کے پرچوں کا کئی مرتبہ مطالعہ کیا ہے۔ اس دفعہ مطالعہ کرنے کے ساتھ یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ شراب جس سے میں بارہا مست ہو چکا ہوں۔ اس کے چند ساغر تشنہ کامانِ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادب کو بھی پلادوں - کہ اس شراب میں بخل کرنا عظیم الشان معصیت ہے - علامہ ابوالکلام کے مضامین پر فرداً فرداً تبصرہ کرنا بڑی فرصت کا کام تھا - اور یہ تبصرہ خود ایک مکمل کتاب ہو جاتی - لہذا میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ مولانا نے ممدوح کے مضامین سے ایسے ٹکڑے انتخاب کر لیے جائیں جو ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے ہوں - الحمد للہ کہ میں اس کوشش میں کامیاب ہو گیا - اِن جواہر پاروں کے سمیٹنے میں مجھ کو بڑا وقت صرف کرنا پڑا مگر میرا کوئی لمحہ بیکار نہیں گیا :

"خدا کی آواز اس کے کانوں سے نکلتی ہے - اور اس کی مشیت کی زبان تغیرات و حوادث عالم کی زبان ہے"

"یہ سچ ہے کہ ہوا چراغ کی لو کو بجھا دیتی ہے - مگر کیا یہ بھی سچ نہیں ہے کہ انگیٹھی کے شعلوں کو بھڑکا بھی دیتی ہے"

"مجھے سورج اور چاند کے وجود کا اتنا یقین نہیں جتنا حق کی کامیابی اور باطل کے خسران پر ایمان ہے"

"خدمتِ انسانی کا کوئی کام آزمایش سے خالی نہیں ہوتا اور مجھے یقین ہے کہ جس طرح دنیا میں ہر شے کے لیے خدا کا ایک نظام و قانون ہے بالکل اسی طرح ایک قانون ابتلاء و امتحان بھی ہے"

"میں دیکھتا ہوں تو مجھے اسلام کا حکم "جہاد" عالمِ انسانیت کی تمام نیکیوں اور جذباتِ انسانی کے تمام مقدس اقدامات کا ایسا محور نظر آتا ہے - جس کے دائرے سے کوئی شے باہر نہیں"

"لکڑی کے ٹکڑوں میں گرمی نہیں ہوتی - لیکن جب وہ جل اٹھتی ہیں تو ان کی سوزش سے قریب کی ہر چیز تپنے لگتی ہے"

"عورت کے دل کا فیصلہ ایک ایسی عظیم الشان طاقت ہے جس کو سمندر کی قہار موجیں - پہاڑوں کی عریض و طویل چٹانیں زمین کے غار اشگاف زلزلے اور بادشاہوں اور فوجوں کے حملے بھی نہیں توڑ سکتے - اس کا دل دنیا کا ایک طلسمِ مخفی ہے - جس کا بھید آج تک نامعلوم ہے"

"دینِ الٰہی کی پیدا کی ہوئی قوتیں : افسردہ ہو سکتی ہیں - مگر نابود نہیں ہو سکتیں"

"جو زبان خدا کی حمد و ثنا کے لیے بنی ہے - اُسے عاجز و درماندہ بندوں کے آگے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شکر گزاری اور عجز نمائی سے گندہ کرنا روح کی موت اور دل کی ہلاکت ہے۔"

"اعلانِ حق اور احتیاج و طلب دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔"

"جس طرح آگ کا خاصہ ہے کہ وہ جب تک آگ ہے اس وقت تک ضرور ہی جلائے گی بالکل اسی طرح میں سچائی کے خاصہ کو بھی دیکھتا ہوں کہ وہ جب تک سچائی ہے۔ اس وقت تک ضرور کامیاب ہو گی۔"

"ہماری (مسلمانوں کی) نظر غیروں کی تقلید پر نہیں بلکہ اپنے الہامی اصولوں پر ہونی چاہیے۔"

"میں حق کی خاطر دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں۔ اور ایسی ایسی قوتیں میری دشمن ہیں جن کے ہاتھ میں قانون کا آلہ، جیل خانہ کی کوٹھڑیاں اور سولی کے تختے ہیں۔"

"کتنی شہرتوں کے غلاف ہیں جن کے اندر کچھ نہیں۔ اور کتنے ہی علم و اہلیت کے خزانے ہیں جو خاکِ گمنامی کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔"

"اگر یہ سچ ہے کہ قومی زندگی کی جان اخلاق ہے۔ تو یہ بھی سچ ہے کہ اخلاق کی جان، حریت رائے، استقلالِ فکر اور آزادیِ قول ہے۔"

"غربت سرائے دہر میں حق کا ٹھکانا صرف ایک مسلمان کا ہی سینہ ہونا چاہیے۔"

"دنیا میں محبتِ باطل سے بڑھ کر، پائے حق کوشش کے لیے کوئی زنجیر نہیں۔"

"کس قدر دنی الوجود اور کم ظرف ہے وہ انسان جو صرف حُبِ مال اور الفتِ زر کے لیے خدا کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے۔"

"دولت پرستی کی ملعون نسل۔ آغازِ عالم سے ناصیۂ انسانیت کے لیے سب سے بڑا بے عزتی کا داغ ہے۔"

"راہِ حق پرستی کی سب سے بڑی آزمائش چاندی کی چمک اور سونے کی سرخی میں ہے۔"

"جن لوگوں کو میں حق اور صداقت کا مخالف یقین کر لیتا ہوں۔ ان کے بارے میں جو کچھ میرے خیالات ہوتے ہیں۔ خواہ وہ اندرائن کے پھل سے زیادہ کڑوے اور تلوار کے زخم سے زیادہ تکلیف دہ کیوں نہ ہوں۔ بغیر کسی نفاق اور ظاہر آرائی کے سچ سچ اور صاف صاف کہہ دیتا ہوں۔"

"دوسروں کی اس خوشی پر مجھے کیوں اعتراض ہو، جو میری خوشی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔"

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"ایک حق گو اور راستباز انسان ہیئیتِ اجتماعی اور مجتمعِ انسانی (سوسائٹی) کا محافظ اور نگران کار ہے"

"سچائی کے شعلے، مخالفت کے طوفان سے اور زیادہ بھڑکتے ہیں اور یہ معجزہ صرف صداقت ہی کے درخت میں ہے کہ جس قدر اسے چھانٹا جاتا ہے۔ اتنا ہی اور زیادہ نشوونما پاتا ہے۔"

"جو لوگ کانچ کے گھر میں رہ کر لوہوں کے ستونوں پر پتھر پھینکتے ہیں انہیں اپنی ہستی کی قوت بھی معلوم ہو جانی چاہیے"

"آپ پھولوں کی سیج پر لوٹ کر خوش ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی باغ اجڑا ہے۔ جب کہیں جا کر آپ کا بستر آباد ہوا"

"حقائق و واقعات آج جھٹلائے جا سکتے ہیں۔ مگر کل ان کے نتائج سے بچنا آسان نہ ہوگا۔"

"درخت سب بوتے ہیں۔ لیکن ہر شخص کے نصیب میں یہ نہیں ہوتا کہ پھل بھی کھائے۔"

"شخصی فرماں روائی کا تاج گو لعل و جواہر کا ہوتا ہے۔ مگر اس کے اندر بلاکتوں اور خطروں کے کانٹے بھرے ہوتے ہیں۔"

"میرے عقیدے میں حق کی اِس سے بڑھ کر کوئی توہین نہیں ہو سکتی کہ اس کے اعلان کو نتائج اور کامیابی کے ظہور کا محتاج قرار دیا جائے۔"

"تلوار اگر کند ہو گئی ہے تو شکایت کا موقع نہیں۔ لیکن افسوس اس کے حال پر ہے جو اپنے ہاتھ میں ایک ایسی تیغ تیز رکھے جس کی کاٹ کے خوف سے حریف کانپ رہا ہو۔ مگر خود وہ اُس کے جوہر سے بے خبر ہو"

"ہم نے بڑے بڑے آتشکدوں اور تنوروں کو دیکھا ہے۔ کہ اُن کے اندر سے آگ کے مہیب شعلے اُٹھ رہے تھے حالانکہ چند گھنٹے پیشتر اُن کی تہ میں بجھی ہوئی چنگاریوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔"

"دنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اور اعمال کے لیے پہلی چیز امید ہے۔"

"شکست و زخم کا خوف ہے تو میدانِ جنگ میں قدم ہی نہ رکھو اور تلووں کو بچانا چاہتے ہو تو تمہارے لیے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے، چلو گے تو ٹھوکر کھاؤ گے"

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور لڑو گے تو زخموں سے چارہ نہیں۔ پس اگر ٹھوکر لگی ہے تو آنکھیں کھولو اور بیٹھ کر رونے کی جگہ تیزی سے چلو کیونکہ جتنی دیر بیٹھ کر تم نے اپنا گھٹنا سہلایا۔ اتنی دیر میں قافلہ اور آگے نکل گیا۔"

"اسلام ایک قوتِ الٰہیہ ہے جس کی زندگی انسانوں اور قوموں سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ قوموں کی زندگی اس کی متابعت اور معیت سے وابستہ ہے"

"ہم کو دنیا کے اندر تبدیلی پیدا ہونے کی خواہش کا کیا حق ہے جب ہم خود اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔"

"درحقیقت جبر و قہر ہی کا پانی وہ آبِ حیات ہے جو آزادی کے بیج کو جادوگروں کے تماشے کی طرح منٹوں اور لمحوں میں بارآور کر دیتا ہے"

"قانون رعایا کے ہاتھ میں بے شک وسیلۂ طلب و انصاف ہے مگر جابر حکومتوں کے لیے تو ایک بہانہ ظلم سے زیادہ نہیں۔"

" جو فقر و فلاکت کی زندگی حق و حریت کی معیت میں گرد و خاک پر بسر ہو۔ وہ چاندی سونے کے بنے ہوئے ان ایوانہائے تعیش سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ جن کے اندر حق کے چراغ کی روشنی نہ ہو۔

"تم اپنے اندر قوت پیدا کرو گے تو قوت بھی تمہارا ساتھ دے گی۔"

"ممکن ہے امراء کے جگمگاتے ہوئے محل قانون کی روشنی سے منور ہوتے ہوں۔ مگر روشنی کی ضرورت بر قتاب ایوانوں میں نہیں ہوتی۔ بلکہ تاریک حجروں اور تہ خانوں میں"

"دنیا میں ہمیشہ ناکامیوں نے کامیابی کی بنیادیں محکم کی ہیں۔"

"جو مسافر بستر غفلت سے اٹھ کر راہ میں سو جائے وہ گو بستر سے اٹھ چکا ہے لیکن نیند سے بیدار نہیں ہوا۔"

" باغ لگانے کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ درختوں کی شاخوں پر پچکاری سے پانی دیجیے پہلی بات یہ ہے کہ جڑوں کو تر و تازہ کیجیے"

"تمہارے پاس ایک ایسی مشتعل چنگاری موجود ہے کہ قرینہ سے ہوا دو تو اس سے ہزاروں آتشکدے روشن کر سکتے ہو۔"

"اس مادہ پرستی کے قرن میں خدا کا نام لیتے ہوتے بہت سی روحیں ہیں جو شرماتی ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مگر میں کیا کروں کہ میری روح کی تسکین تو صرف اسی نام میں ہے۔"

"یہ کونسی عقلمندی ہے کہ اگر جیب سے ایک دھیلا گر جائے تو ہاتھ کی اشرفی بھی پھینک دی جائے۔"

"اصل یہ ہے کہ انسان جسم کو پارہ پارہ کر سکتا ہے پر دلوں کو نہیں بدل سکتا۔ زمین کی خشکی وتری کا نقشہ ممکن ہے کہ بدل دے مگر قلب وروح کا ایک گوشہ بھی اس کے پھیرے سے نہیں پھر سکتا۔"

"حکیم وجاہل اور فرزانہ وہشیار میں مرئیات ومشاہدات کا فرق نہیں بلکہ صرف چشمِ نظارہ اور دلِ تفکر فرما کا۔"

"اصل یہ ہے کہ دنیا کا سر انقلاب وتغیر ہمیشہ صدائے عمل کے آگے جھکا ہے نہ کہ صدائے قول کے سامنے۔"

"جو آتشدان خود آگ سے خالی ہوگا۔ وہ کمرے کو گرم نہیں کر سکتا۔"

"دنیا میں اصلاح کے بیج نے ہمیشہ سب سے پہلے "جہادِ لسانی" ہی کی شاخ پیدا کی ہے اور یہی پہلی اینٹ ہے جس پر بڑی بڑی عمارتیں بنی ہیں اور بڑے بڑے شہر بسائے گئے ہیں۔ اصلاح ودعوت ایک درخت ہے جس کا بیج بھی وعظ ہے، جس کے لیے پانی بھی وعظ ہے اور آخر میں جس کا پھل بھی وعظ ہے۔"

غور سے پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ٹکرے نبات کے کوزوں اور مصری کی ڈلی سے زیادہ شیریں اور لعل جواہر سے زیادہ تابناک اور گراں قدر ہیں ان ادبی جواہر پاروں پر ادب وسیاست کے قصر تعمیر کیے جا سکتے ہیں۔ ایک ایک جملہ اخلاقیات کا وسیع صحرا اپنے دامن میں رکھتا ہے ایک ایک جُز اصلاح وعمل کا درس مکمل ہے۔ کس قدر حسین وجمیل انداز میں حقائق ومعارف کو بے نقاب کیا گیا ہے سچی اور بے لاگ باتوں کے اظہار کا پیرایہ کتنا بلیغ اور جامع ہے۔ ایک ایک لفظ دل میں تیر ونشتر بن کر ڈوبا جاتا ہے۔ سچی بات کڑوی ہوتی ہے مگر ابوالکلام کے میٹھے بولوں نے اس تلخی کو قند ونبات بنا دیا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ نصیحت سے اس کا جی الجھتا ہے مگر علامہ ابوالکلام نے کچھ اس سحر انگیز انداز میں نصیحت کی ہے کہ انقباض کے بجائے قلب کو انشراح ہوتا ہے۔

اس دور میں جب کہ زبانِ سیاست اور اخلاقِ اجتماعی کی تعمیر ہو رہی ہے ابوالکلام کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مضامین کی نشر و اشاعت کی بہت کچھ ضرورت ہے۔ کیونکہ ادب کی بلندی اور زبان کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ آپ کے یہاں اخلاق و آزادی کی تعلیم بھی ہوتی ہے ظاہر ہے کہ "قومیتِ مشترکہ" اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی۔ جب تک زبان، سیاست اور اخلاق کو ایک جگہ جمع نہ کر دیا جائے۔ مولانا ابوالکلام کے مضامین پڑھ کر ادبی وجدان بھی حظ حاصل کرتا ہے اور خیالات میں بلندی اور عزم میں استحکام بھی پیدا ہوتا ہے۔ ملک و قوم کا فرض ہے کہ وہ ایسے بے مثل انشا پرداز کے مضامین کی بیش از بیش نشر و اشاعت کرے۔ اور ہندوستان کے ہر شہر میں اس کے مضامین کی ترویج و تشہیر کے لیے انجمنیں قائم کی جائیں۔

(ہمایوں، لاہور۔ نومبر ۱۹۲۴ء)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد بحیثیت صاحبِ طرز

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

اردو میں اس نام کے یوں تو بہت سے ادیب ہوئے ہیں لیکن محمد حسین آزاد، سید محمد نواب آزاد، اور مولانا ابوالکلام آزاد خاص طور پر مشہور رہے۔ اس فہرست میں اگر رتن ناتھ سرشار کا پیدا کردہ کردار آزاد بھی شامل کر لیا جائے جو اپنی گوناگوں خصوصیات سے ادب میں زندہ جاوید کا مرتبہ حاصل کر چکا ہے، تو ان ممتاز آزادوں کی تعداد چار تک پہنچتی ہے۔ بزم ادب کے یہ چار درویش مختلف اوقات میں اپنے کارناموں کے ساتھ تاجدار سخن کے بزم میں آئے، اور ہر ایک کی محبوبہ یعنی اردو نے نگاہ جوہر شناس سے سب کو حیات جاوید سے سرفراز فرمایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد سب کے آخر میں آئے مگر اس انداز سے آئے کہ ادبی راہیں جگمگا اٹھیں اور دیکھنے والوں کو محسوس ہوا کہ شاید اس شان سے کوئی اور آزاد اس محفل میں اب سے پہلے نہیں آیا۔ ان کے طرز خرام نے اہل نظر کو خیر مقدم پر مجبور کر دیا۔ اور طرز خاص کی لطافت و بلندی پر نظر کر کے تاجدار سخن نے بھی جی کھول کر داد دی۔ آیئے ان کے طرز خاص پر ایک نظر ڈال کر ہم بھی غور کریں کہ اس کی دلکشی کے اسباب کیا تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد ادبی دنیا میں سچ مچ ابوالکلام کیوں ہوتے؟

فن کاری نام ہے طرز ادا و تخیل کی ندرت کا جس قدر ہم آہنگی ان دونوں میں ہوگی اتنا ہی فنکار عروج سے قریب ہوتا جائے گا۔ مواد اور بیان اس کے آسمان و زمین ہیں بغیر ان دونوں کے یکجا ہوئے دنیائے فن آباد نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا سہارا لے کر کوئی ادیب میدان ادب میں نمایاں ہو سکے لیکن ثبات دیرپا ناممکن ہے ہر دلعزیزی ممکن ہے لیکن ہمہ گیری و استحکام نصیب ہونا مشکل ہے، فن کے نمایاں ہونے میں طرز تحریر اور مواد کا تناسب کیا ہے اس کا فیصلہ آسان نہیں، لیکن عام طور پر یہ رائے ہے کہ مواد کی اہمیت اس سلسلہ میں زیادہ ہے۔ اس لیے کہ جس پایہ کا خیال ہوتا ہے اس مرتبہ کے الفاظ بھی ساتھ ہی ساتھ دماغ میں ابھر آتے ہیں۔ کوئی خیال بغیر الفاظ کا سہارا لیے ہوئے ذہن میں نہیں آتا۔ مواد کے ذخیرے سے تخیل جب کوئی موضوع چنتا ہے تو الفاظ ہی اس کو حیثیت عطا کرتے ہیں۔ گویا خیال زندگی ہے اور الفاظ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیکر، ظاہر ہے کہ زندگی بغیر پیکر کے آسانی سے نہ دیکھی جا سکتی ہے نہ سمجھی جا سکتی ہے۔ مگر اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ روح بغیر قالب کے ہماری سمجھ میں آتے یا نہ آتے مگر ماننے والوں کے نزدیک اس کا ہونا مسلّم ہے۔ بہرحال روح بغیر جسم کے اور جسم بغیر روح کے بے معنی تو نہیں، مگر ناقابلِ فہم ضرور ہے ان دونوں کا ساتھ ناگزیر ہے۔ دنیا زیادہ تر جسمانی حسن سے متاثر ہوتی ہے روح کی رعنائی کا بھی معیار اسی کو سمجھتی ہے۔ حسن کو دیکھنا آسان کام نہیں۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ ؎

عشق کا حسن کہاں دیکھ سکے اہلِ جہاں
ورنہ یوسف سے زیادہ تھا زلیخا کا جمال

الفاظ و مواد کے تناسب و اہمیت کی بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ادیب کو میدانِ عمل میں امتیاز کب اور کیوں حاصل ہوتا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بغیر دونوں کی ہم آہنگی و ندرت کے انفرادیت نصیب نہیں ہوتی۔ عام و روایتی شاہراہ سے ہٹ کر جب تک ادیب اپنا کوئی راستہ نہیں پیدا کرتا وہ کاروانِ ادب میں ممتاز و مفتخر بھی نہیں ہوتا۔ زمانہ بغیر جوہرِ خاص کے کسی کو یکتا و منفرد ماننے کو تیار نہیں ہوتا اس انفرادیت کے لیے اوگھٹ گھاٹی سے گزرنا پڑتا ہے، بہت سوچ سمجھ کر راستہ چلنا پڑتا ہے، اپنی تخلیقی قوت کو قدم قدم پر سنوارنا اور دیکھنا پڑتا ہے اسے خود اپنا نقاد ہونا پڑتا ہے۔ غالب کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ دنیائے شاعری میں ان کے ابتدائی نقوش باوجود طرزِ تخیل کی ندرت کے کوئی جگہ ادب میں نہ پا سکے لیکن جب انھوں نے زبان و بیان کی رعنائی میں ایک معقول تناسب پیدا کر لیا تو وہی سب سے بلند جگہ پر نظر آتے۔ اگر اپنی اور اپنے طرزِ گفتار میں اصلاح نہ کرتے تو باوجود بلندئ خیال شاید عنقا صفت ادب دنیا سے گم ہو جاتے۔

ان باتوں کے بعد آیئے اب دیکھیں کہ ابوالکلام آزاد دنیائے ادب میں اردو کو کچھ ایسی چیز دے سکے جو ان کا تحفہ سمجھا جائے یا اور دل کی طرح آئے اور کارواں کے ساتھ بغیر اپنے کو نمایاں کیے چلے گئے۔ ایسا نہیں ہے پہلی ہی نظر میں محسوس ہوتا ہے کہ کم از کم ایک ایسی طرزِ نگارش اردو کو وہ دے گئے جس میں زندگی زور اور سیلابی کیفیت رواں دواں ہے جس کو ان کی بلند پایہ شخصیت، تبحرِ علمی، غیر معمولی حافظہ اور حسن و قبح کا امتیاز مل جل کر طرزِ تحریر کو وہ انفرادیت عطا کرتے ہیں جو کسی اور کے یہاں مشکل سے ملتی ہے۔

کسی زبان میں ایسے صاحبِ طرز مشکل ہی سے پیدا ہوتے ہیں جو اپنی طرزِ نگارش کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پرچم اس انداز سے بلند کریں کہ ادب اس کو طرۂ امتیاز سمجھے، اور لوگ اس کے سایہ میں شگفتگی و توانائی کی لہریں محسوس کریں۔ طرزِ بیان کے ساتھ واقعیت و بلندیٔ خیال بھی دل و دماغ کو متاثر کرے۔ مثال کے لیے اُردو ادب کے چند نثر نگار پیش کیے جا سکتے ہیں دورِ جدید سے اب تک جو اہلِ قلم اپنی طرزِ نگارش کے لیے مشہور ہیں ان میں آزاد، شبلی، حالی، مہدی افادی، حسن نظامی، نیاز فتح پوری، سجاد انصاری، مجنوں گورکھپوری اور ایسے ہی دو چار نام اور یاد آئیں گے۔ بظاہر یہ تعداد اچھی خاصی ہو جاتی ہے مگر ذرا سخت گیری سے کام لیا جائے تو یہ فہرست ایک چوتھائی مشکل سے باقی رہ جاتی ہے یعنی اگر اس نظر سے دیکھا جاتے کہ اس میں سے کتنے ادیب ایسے ہیں جو صرف طرزِ نگارش کے بل بوتے پہ میدان ادب میں زیادہ دنوں تک کھڑے رہ سکتے ہیں، تو معلوم ہو گا کہ ان گنے اہلِ قلم باقی رہ جاتے ہیں، ان ہی چند رہنے والوں میں ہم ابوالکلام آزاد کو پاتے ہیں۔

ہم نے جیسا اوپر عرض کیا کہ علاوہ اور خصوصیات کے مخصوص طرز کے لیے ضروری ہے کہ اس میں مواد و الفاظ کی ہم آہنگی ہو اور عام روایتی شاہراہ سے علیحدہ ایک نئی راہ بھی اس کی تحریر میں نمایاں ہو۔ ابوالکلام آزاد کے یہاں سب سے پہلے یہی خصوصیت جاذبِ نظر ہو جاتی ہے، اس عمل میں ان کی شخصیت کارفرما ہے تبحر علمی، عملی سیاست، تجربات و مشاہدات نے ان کی ذہنیت کو ایک خلص بلندی عطا کر دی تھی وہ علم و عمل کے دوراہے پر نہیں بلکہ سنگم پر کھڑے تھے جو نکتہ ان کے ذہن میں خیال کی صورت سے آتا وہ اپنی نشو و نما کے لیے اس مقام سے متاثر ہونے پر مجبور ہوتا۔ اس کے لیے مولانا کی ذہنیت کی تشکیل ان ہی اجزا سے ہوئی تھی۔ ان کے غور و فکر میں وسیع النظری و معلومات کے عناصر خیال کو پختگی و رعنائی دینے کے علاوہ الفاظ کا ذخیرہ بھی اس پیمانے پر ہم پہنچا لیتے ہیں جو خیال سے ملتے جلتے ہیں مفہوم کو واضح کرنے کے لیے نامناسب نہ ہوتا نتیجہ یہ تھا کہ خیالات و الفاظ میں یک رنگی و ہم آہنگی خود بخود پیدا ہو جاتی۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خصوصیت ہر شخص کے لیے قدرت نے عام کر دی ہے، جو جس طرح سوچتا ہے اسی قبیل کے الفاظ بھی ذہن میں آتے ہیں۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے لیکن ہر شخص کی خیال آرائی بہ قدرِ ظرفِ علم ہوتی ہے، اگر علم یا معلومات کا پیمانہ وسیع نہیں ہے تو خیال کی پرواز بھی معمولی ہو گی اور اگر علم و تجربات کا پیمانہ وسیع ہے تو خیالات بھی بلند ہوں گے اور اپنی پیدائش کے ساتھ ہی الفاظ بھی ایسے لائیں گے جو پرواز میں کوتاہی نہ پیدا ہونے دیں بلکہ خیال کی ندرت سے ہم آہنگ ہوں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ الفاظ کی پہلی آمد ہی سے ادیب مطمئن نہیں ہو جاتا پیش کرنے سے پہلے ان کی تراش خراش کرنے کے بعد قلم بند کرتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ تراش خراش حُسن و قبح کی مفرا ض سے ایک خاص صورت میں لائی جاتی ہے۔ اگر مصنف یا فن کار کا جمالیاتی حِس کوئی مخصوص سطح تک نہیں پہنچ سکا ہے، تو الفاظ بھی ناہموار و ترتیب بھی ناخوشگوار ہو جائے گی گویا حُسن و قبح کا انداز ہی بندش کو خوبصورت یا بدصورت بناتا ہے اور یہی بندش خیال کی مقبولیت یا کراہیت کا باعث ہوتی ہے، اس بات کا سوچنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا اس کو پُراثر انداز میں پیش کرنا، اور اسی انداز پر شاعر یا ادیب کی کامیابی و ناکامیابی کا انحصار ہے۔ اس اصول کے لحاظ سے جب ہم ابوالکلام کے طرزِ تحریر پر نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کا جمالیاتی حِس اس بلندی پر پہلے ہی پہنچ چکا تھا جو بہت کم لوگوں کے یہاں نظر آتا ہے۔

مولانا کے حسن و قبح کا اندازہ ان اشعار سے بھی ہوتا ہے جو غبارِ خاطر میں جا بجا ملتے ہیں۔ تمام اشعار کو غور سے دیکھیے تو ان کے اندر لطافت و معنویت کا ایک دریا موجزن نظر آتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ اشعار اتفاقیہ طور پر آ گئے ہیں، یا بغیر سوچے ہوئے چمک دمک یا بحر کی روانی سے مرعوب ہو کر مولانا نے پیش کیا ہے۔ ان کی نظر زیادہ تر معنویت و الفاظ کی رعنائی پر ہے۔ مثال کے لیے ایک شعر دیکھ لیجیے جس کی تشریح سے مولانا کی ژرف نگاہی و جمالیاتی حِس کا اندازہ ہوتا ہے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"حسبِ معمول سو کر اٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر طاری تھا":

کم لذتم و قیمتم افزوں شمار است
گوئی ثمرِ پیشترِ از باغ وجودم

غور فرمائیے کیا عمدہ مثال دی ہے۔ آپ نے اکثر بے فصل کے میوے کھائے ہوں گے مثلاً جاڑوں میں آم چونکہ بے فصل کی چیز ہوتی ہے نایاب تحفہ سمجھی جاتی ہے۔ لوگ بڑی بڑی قیمتیں دے کر خریدتے ہیں اور دوستوں کو بطور تحفہ بھیجتے ہیں۔ لیکن جو علت اس کی تحفگی اور گرانی کی ہوئی، وہی بے لذتی کی بھی ہو گئی۔ کھائیے تو مزہ نہیں ملتا اور مزہ ہو تو کیسے ہو؟ جو موسم ابھی نہیں آیا اس کا میوہ نا وقت پیدا ہو گیا۔ یہ زمین کی غلط اندیشی تھی کہ وقت کی پابندی بھول گئی اور اس غلط اندیشی کی پاداش ضروری ہے کہ میوہ کے حصے میں آئے۔ تاہم چونکہ کمیاب ہوتی ہے، اس لیے بے مزہ ہونے پر بھی بے قدر نہیں ہو جاتی۔ کھانے والوں کو مزہ نہیں ملتا۔ پھر بھی زیادہ سے زیادہ قیمت دیکر خریدیں گے اور کہیں گے یہ جنس نایاب جتنی بھی گراں ہو ارزاں ہے"۔

ایک دوسرے خط مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں ایک دوسرے شعر کی تشریح کرتے ہیں شعر یہ ہے:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چنداں کہ دست و پازدم آشفتہ تر شدم
ساکن شدم میانہ دریا کنار شد

شعر کی معنویت پر نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر جسم میں رُوح بولتی ہے اور لفظ میں معنی اُبھرتا ہے، تو حقائق ہستی کے اجسام بھی اپنے اندر کوئی رُوحِ معنی رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ معمۂ ہستی کے بے جان اور بے معنی جسم میں صرف اسی ایک حل سے رُوحِ معنی پیدا ہوسکتی ہے، ہمیں مجبور کر دیتی ہے کہ اس حل کو حل تسلیم کرلیں۔
اگر کوئی ارادہ اور مقصد پردے کے پیچھے نہیں ہے تو یہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اگر ایک ارادہ اور مقصد کام کر رہا ہے تو پھر جو کچھ بھی ہے روشنی ہی روشنی ہے۔ ہماری فطرت میں روشنی کی طلب ہے۔ ہم اندھیرے میں کھوئے جانے کی جگہ روشنی میں چلنے کی طلب رکھتے ہیں، اور ہمیں یہاں روشنی کی راہ صرف اسی ایک حل سے مل سکتی ہے۔"

ان مثالوں سے بآسانی اندازہ ہوسکتا ہے کہ آزاد کا ذہن کتنا روشن تھا، ان کی پسند معنی و مطالب میں ندرت و بلندی چاہتی تھی، الفاظ کے دار و بست میں رعنائی تلاش کرتی تھی اور یہ طلب و جستجو ان کی طبیعت کا جزو لاینفک ہوگئی تھیں جو ان کے طائر تیز تقریر و تحریر کے لیے پر پرواز بن گئی تھیں۔

آزاد کے شعور کی بالیدگی اور مزاج کی شعریت نے طبیعت پر غلبہ حاصل کرلیا تھا، جو ہر جگہ سیلاب بن کر تقریر و تحریر میں اُبل پڑتی تھی، شعریت کا ایک تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ بات برجستگی کے ساتھ کہی جاوے، الفاظ ایسے لائے جائیں جو مفہوم کو زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد تر ذہن نشین کردیں سننے یا پڑھنے والے مطلب بھی سمجھ لیں اور الفاظ کی ترتیب سے جو حسن بیان پیدا ہوا اس میں مسحور ہوکر دیر تک لطف لیتے رہیں۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ بات بھی کام کی ہو اور انداز بیان میں ادبیت بھی۔ آزاد کے گوناگوں تجربات اور فارسی عربی کے وسیع مطالعے نے ان کی فطرت کو ادب کے سانچے میں ڈھال دیا تھا ان کے غیر معمولی حافظہ نے شعرا کے منتخب اشعار کا لامحدود ذخیرہ ذہن میں مہیا کردیا تھا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ غبار خاطر نثری کارنامہ ہے مگر اس میں بھی اشعار کی تعداد نثر کے تناسب سے زیادہ ہے لیکن ان کا سبب یہ نہ تھا کہ آزاد اپنی شعر پسند طبیعت کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ ان کی یادداشت میں خیالات وواقعات کے لحاظ سے اتنے اشعار جمع ہوگئے تھے کہ نثر کے میدان میں بھی موقع پاتے ہی بے تحاشا سامنے آجاتے تھے اور مولانا کو مفہوم کی جامعیت مجبور کرتی تھی کہ بلا تکلف وہ اشعار سے بات کو ذہن نشین بنا دیں۔ یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ عبارت کو مکمل اور فضا کو حسین تر بنانے کے لیے یہ طریقہ کام میں لاتے تھے۔ گویا ان کی جمالیاتی حِس خوب سے خوب تر بنانے میں ہر ادبی لطافت کا سہارا لینا چاہتی تھی اور آزاد اپنی بے چین طبیعت سے مجبور ہو کر کسی منزل کو منزل نہیں سمجھنا چاہتے تھے۔

آزاد کی طرزِ تحریر میں برجستگی وادبیت کا یکجا دبیک وقت پایا جانا عام ہے۔ مثال کی کوئی خاص ضرورت نہیں معلوم ہوتی لیکن احتیاطاً غبارِ خاطر سے ایک مثال پیش کر دینا بے جا نہ ہوگا۔ ۳/ اگست ۴۲ء کے خط میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :۔

"رات ایسی حالت میں کٹی جسے میں نہ تو اضطراب سے تعبیر کر سکتا ہوں، نہ سکون سے، آنکھ لگ جاتی تھی تو سکون تھا کھل جاتی تھی تو اضطراب تھا گویا ساری رات متضاد خوابوں کے دیکھنے میں بسر ہو گئی ایک تعمیر کی نقش آرائی کرتا تھا دوسرا تخریب کی برہم زنی۔"

آزاد کی طرزِ تحریر میں انفرادیت پیدا ہونے کے متعدد اسباب ہیں، منجملہ ان کی متانت و رنگینی کا امتزاج ہے، جو عبارت کو حسنِ بیان اور خیال کو شگفتگی و رعنائی عطا کرتا ہے۔ نہ تو متانت زاہدانہ ہے، اور نہ رنگینی رندانہ ہے۔ ایک ادیب کی سنجیدگی اور فن کار کی شوخی ہے جو موقع و محل کا لحاظ کرتے ہوئے اعتدلال کے ساتھ دل و دماغ کو متاثر اور روح کو بیدار کرتی ہوئی اپنی راہ چلی جاتی ہے۔ اس حسنِ بیان کے لیے کسی خاص موضوع کی قید نہیں، کوئی بات ہو معمولی سے معمولی اور بڑی سے بڑی چاہے وہ بذاتِ خود دلکش نہ ہو عام فہم نہ ہو، مگر مولانا کے نوکِ قلم سے چھو جانے کے بعد اس کی اہمیت کچھ اور نظر آنے لگتی ہے۔ کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود گنگنا رہے ہیں اور کبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیان کے جوش و زور نے پڑھنے والے کے خیال کو پرِ پرواز عطا کر دیا ہے اور وہ ایک خاص لطافت و بلندی سے ہمکنار ہے۔

اس حسنِ بیان میں مولانا کی شخصیت پوری طرح کارفرما ہے۔ جب وہ بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور غور و فکر کے بعد اپناتے ہیں تو اس کو اپنے کردار کی گرمی اور دل کا سوز بھی عطا کر دیتے ہیں۔ اس کی تشریح کے لیے ان کی علمیت بلا تکلف الفاظ ہر وقت مہیا کر دیتی ہے اور مزاج، حسن و قبح کے لحاظ سے ان کو ترتیب دیتا ہے۔ مولانا کی رومان پسند فطرت عبارت میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شگفتگی اور ہلکی رنگینی پیدا کر دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والوں کے دل و دماغ متاثر ہو جاتے ہیں۔ طرزِ تخیل و حسنِ بیان سے ایک ایسی فضا پیدا ہوتی ہے جو بیک وقت متانت و رنگینی کی علامت بن جاتی ہے۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے مولانا کے ایک خط مورخہ ۲۷ اگست ۱۹۴۲ء کے ٹکڑے جگہ جگہ سے ملاحظہ ہوں:

"قید سے باہر کی زندگی میں اپنی طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا، خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پر چھائی رہتی ہے دماغ اپنی فکروں سے باہر آنا نہیں چاہتا اور دل اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔۔۔ لیکن جوں ہی حالات کی رفتار قید و بند کا پیام لاتی ہے میں کوشش کرنے لگتا ہوں کہ اپنے آپ کو یک قلم بدل دوں۔ میں اپنا پچھلا دماغ سر سے نکال دیتا ہوں اور ایک نئے دماغ سے اس کی خالی جگہ بھرنی چاہتا ہوں حریم دل کے طاقوں کو دیکھتا ہوں کہ خالی ہو گئے تو کوشش کرتا ہوں کہ نئے نئے نقش و نگار بناؤں اور انہیں پھر سے آراستہ کروں۔

دفت ست دگر بُت کدہ سازند حرم را

اس تحوّلِ صورت (Metamarphism) کے عمل میں کہاں تک مجھے کامیابی ہوتی ہے؟ اس کا فیصلہ تو دوسروں ہی کی نگاہیں کر سکیں گی، لیکن خود میرے فریبِ حال کے لیے اتنی کامیابی بس کرتی ہے کہ اکثر اوقات اپنی پچھلی زندگی کو بھولا رہتا ہوں۔۔۔۔ میں نے قید خانہ کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے اس میں ایک جزو رواقیہ (Stoics) کا ہے ایک لذتیہ (Epicureans) کا۔۔۔۔۔ جہاں تک حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے "رواقیت" سے ان کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور ان کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں۔۔۔۔ جہاں تک زندگی کی خوش گواریوں کا تعلق ہے لذتیہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں۔"

۴۔ اگست ۱۹۴۲ء کے مکتوب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"غور کیجیے وہ زندگی ہی کیا ہوئی جس کے دامنِ خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے؟ وہ چال ہی کیا جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہو۔۔۔۔۔ اور اگر پوچھیے کہ پھر کامرانیِ عمل کا معیار کیا ہوا، اگر یہ آلودگیاں مخل نہ سمجھی گئیں؟ تو اس کا جواب وہی ہے جو عرفاءِ طریق نے ہمیشہ دیا ہے:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترک ہمہ گیرو آشنا سے ہمہ باش

یعنی ترک و اختیار، دونوں کا نقش عمل اس طرح ایک ساتھ بٹھائیے کہ آلودگیاں دامن تر کریں، مگر دامن پکڑ نہ سکیں، اس راہ میں کانٹوں کا دامن سے الجھنا مخل نہیں ہوتا، دامن گیر ہونا مخل ہوتا ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ آپ اس ڈر سے ہمیشہ اپنا دامن سمیٹے رہیں کہ کہیں بھیگ نہ جائے۔ بھیگتا ہے تو بھیگنے دیجیے لیکن آپ کے دست و بازو میں یہ طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ جب چاہا اس طرح نچوڑ کے رکھ دیا کہ آلودگی کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی..... یہاں کامرانی سود و زیاں کی کاوش میں نہیں ہے بلکہ سود و زیاں سے آسودہ حال رہنے میں ہے نہ تو تر دامنی کی گرانی محسوس کیجیے نہ خشک دامن کی سبک سری، نہ آلودہ دامنی پہ پریشان حالی ہو نہ پاک دامنی پر سرگرانی۔

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیم عشق
روے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

مولانا کی طرز تحریر بعض لوگوں کے خیال میں دقیق الفاظ، و نامانوس تراکیب سے بوجھل ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک اسی وجہ سے عبارت بھاری بھرکم اور رعب دار ہو کر سامنے آتی ہے۔ مفہوم خواہ وسیع نظر آتا ہے، مگر یہ بات سطحی مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کی زبان و الفاظ موقع و محل کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے موضوع کے تقاضے پر وہ لفظیات پیش کرتے ہیں۔ اگر تاریخی یا جغرافیائی بیان ہے یا روزمرہ کی زندگی کے معمولی حالات، تو وہ نہایت سیدھی سادھی زبان اور عام فہم الفاظ لاتے ہیں لیکن ان ہی معمولی الفاظ کو عبارت میں اسی طرح سجاتے ہیں کہ بین السطور دریا کی روانی اور سیلاب کا جوش محسوس ہونے لگتا ہے۔ زندگی کی طرح ادب کے حرکی ہونے کا یقین آجاتا ہے۔ چنانچہ جب وہ حراست میں سیاسی نظر بندی کے لیے احمد نگر کے قلعہ میں لے جائے جارہے تھے، تو احمد نگر کے عہد ماضی کا خیال آگیا ہے، لکھتے ہیں:

"یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنہیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق اور دفاتر میں محفوظ کر لیا ہے۔ اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خانخاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا تھا جس کی سرگذشت عبدالباقی نہاوندی اور صمصام الدولہ نے ہمیں سنائی ہے۔ جب احمد نگر کی مدد پر بیجا پور اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گول کنڈہ کی فوجیں بھی آگئیں، اور خانخاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقت ور فوج سے ٹکرانا پڑا تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا۔

چین ابرو ہے در پیش است و فتح آسمانی شکست رو دہد جائے نشان دہید کہ ماشمارا دریابیم' خانخانان نے جواب دیا تھا 'زیر لاشہا'

احمد نگر کے نام نے حافظہ کے کتنے ہی نقوش یکایک تازہ کر دیے۔ ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی، میدان کے بعد میدان گزرتے جاتے تھے ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا اور ایسا ہی ماجرا میرے دماغ کے اندر بھی گزر رہا تھا۔ احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستان کہن سیے ورق پر ورق الٹتا جاتا ...... ایک صفحہ پر اپنی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا ... مجھے خیال ہوا اگر ہمارے قید و بند کے لیے یہی جگہ چنی گئی ہے تو انتخاب کی موزونیت میں کلام نہیں، ہم خرابتیوں کے لیے کوئی ایسا ہی خرابہ ہونا تھا۔"

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آزاد ایسے الفاظ و تراکیب نہیں لاتے جو دقیق یا نامانوس ہوں، بلکہ جیسا ہم نے عرض کیا کہ ان کے تخیل کے محور پر لفظیات رواں دواں ہے۔ اگر موضوع بجائے خود ادق ہے، تو فطری مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ہم پلہ الفاظ لائے جائیں۔ لفظیات کے ضمیر پر غور کیجیے تو جاندار افراد کی سوسائٹی کے خواص کی جھلک ملتی ہے جس طرح حیوان اور انسان اپنے جنس کی سوسائٹی میں خوش رہ سکتا ہے، یہی چاہتا ہے کہ مذاق و ذہنی سطح کے اعتبار سے ہم جنس قریب قریب یکساں ہو۔ بعینہٖ یہی مطالبہ الفاظ کا بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنے قبیل و معیار کے ساتھی چاہتے ہیں، نرم گرم ناہمواری سے جیسے ان کا بھی دم گھٹتا ہو۔ اس عیب کو آپ فنی اصطلاح میں تنافر کہیں یا کچھ اور بہر حال اہل نظر ہمیشہ سے الفاظ و موضوع یا طرز گفتار کی غیر ہم آہنگی کو مکروہ یا بدنما سمجھتے آئے ہیں۔ آزاد کی نکتہ رس طبیعت نے ابتدا ہی سے زبان و خیال کی ناہمواری کا راز پالیا تھا۔ وہ موضوع کا سانچا دیکھ کر اظہار بیان کے لیے الفاظ ڈھالتے ہیں، اور اسی لحاظ سے انتخاب و ترتیب کا کام شروع کرتے ہیں۔ اوپر کے اقتباسات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ موضوع کوئی خاص وزن کا نہ تھا اس لیے انھوں نے الفاظ بھی اسی کے اعتبار سے سادہ و عام فہم پیش کیے۔ لیکن جہاں کہیں موضوع بلندی خیال کا پرتو لیے ہوتا ہے۔ وہاں اظہار بیان و نکات کو روشن کرنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے وہ مشکل الفاظ و مخصوص تراکیب و تشبیہات صرف کرنے میں تکلف بھی نہیں کرتے۔ کیونکہ ایسے موقع پر تکلف بخل کے مترادف ہوجاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ فنکار سہل الفاظ و انداز کا اتنا گرویدہ ہوگیا ہے کہ اس کے دائرہ سے باہر قدم رکھنا ہی نہیں چاہتا یا وہ موضوع و الفاظ کی ہم آہنگی کا قائل ہی نہیں، صرف اپنے الفاظ پر قدرت رکھنے اور ان کو قلم بند کردینے ہی میں وہ طرزِ نگارش و تاثیر آفرینی کی ذمہ داری سے سبک دوش ہوجاتا ہے۔ آزاد نے ہر موقع پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ زبان و بیان میں ناہمواری نہ آنے پائے۔ چنانچہ اقتباسات سے آپکو اندازہ ہوگیا ہوگا۔ اب ایک مثال اس نوع کی بھی دیکھ لیجیے جو موضوع کے ادق ہونے کے لحاظ سے کسی قدر مشکل الفاظ نامانوس تراکیب کے ساتھ آزاد کے بیان میں آئی ہے ۱۸۔ اکتوبر ۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"غور و فکر کی یہی منزل ہے جو ہمیں ایک دوسری حقیقت کی طرف بھی متوجہ کر دیتی ہے یہ بات ہے کہ انسان خدا کے ماورائے تعقل اور غیر شخصی تصور پر قانع نہ رہ سکا اور کسی نہ کسی شکل میں اپنے فکر و احساسات کے مطابق ایک شخصی تصور پیدا کرتا رہا......
شخصی تصور کے مختلف مدارج ہیں۔ ابتدائی درجہ تو شخص محض کا ہوتا ہے جو صرف شخصیت کا اثبات کرتا ہے، پھر آگے چل کر یہ شخصیت خاص خاص صفتوں اور فعالیتوں کا جامہ پہن لیتی ہے سوال یہ ہے کہ یہ جامہ ناگزیر کیوں ہوا؟ اس کی علت بھی یہی ہے کہ انسان کی فطرت کو بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے، اور اس ضرورت کی پیاس بغیر ایک متشخص اور علائق نواز تصور کے بجھ نہیں سکتی حقیقت کچھ ہی ہو لیکن یہ تصور جب کبھی اس کے سامنے آئے گا تو تشخص کی ایک نقاب چہرے پر ضرور ڈال لے گا۔ یہ نقاب کبھی بھاری رہی کبھی ہلکی ہوگئی، کبھی ڈرانے والی رہی کبھی لبھانے والی بن گئی، لیکن چہرے سے کبھی اتری نہیں اور یہیں سے ہمارے دیدۂ صورت پرست کی ساری درماندگیاں شروع ہوگئیں......
غیر صفاتی تصور کو انسانی دماغ پکڑ نہیں سکتا، اور طلب اسے ایسے مطلوب کی ہوئی، جو اس کی پکڑ میں آسکے، جس کے حسن گریزاں کے پیچھے والہانہ دوڑ سکے، جس کا دامن کبریائی پکڑنے کے لیے اپنا دست عجز و نیاز بڑھا سکے، جس کے ساتھ راز و نیاز محبت کی راتیں بسر کرسکے، جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو۔"

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہاں آزاد سے عام فہم زبان کا مطالبہ کوئی سمجھ دار آدمی نہیں کر سکتا اس لیے کہ یہ موضوع بذات خود دق ہے اور صرف اہلِ دماغ ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں عوام کے لیے نہیں ہوتیں۔ اس کا تعلق خواص سے ہوتا ہے، جو اہلِ علم ہونے کے علاوہ مسائل کی اہمیت سے بھی دلچسپی لیتے یا لے سکتے ہیں۔ یہ خیالات ہر لحاظ سے کسی قدر مشکل الفاظ کا جامہ پہن کر سامنے آنا چاہتے ہیں۔ ہلکا پھلکا لباس ان کا وزن برداشت نہیں کر سکتا۔ اس مکتوب میں جس شخص سے خطاب ہے، اول تو وہ خود عالم ہے اور دوسرے مسئلہ زیرِ بحث تصوف یا فلسفہ کی زبان چاہتا ہے، جو مصطلحات و مخصوص الفاظ کے بغیر واضح نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے یہی اندازِ بیان موزوں ہے کیونکہ باوجود اس کے کہ مسئلہ کی بنیاد ذہن کی تہہ در تہہ کاوشوں پر ہے۔ آزاد نے الفاظ کو اس طرح سجایا ہے کہ مواد اپنی متانت بھی قائم رکھے اور مفہوم الفاظ و تراکیب کے گورکھ دھندے میں اُلجھ کر نہ رہ جائے۔ یہاں زورِ بیان و ترتیب الفاظ سے فضا جتنی دلکش ہو گئی ہے وہ آزاد کی طرزِ تحریر کو ایک ایسی خصوصیت عطا کرتی ہے جو نہ شبلی کے یہاں ملتی ہے نہ محمد حسین آزاد کے یہاں۔ کاش ابو الکلام آزاد نے ایسے موضوعات پر اُردو میں کوئی مستقل تصنیف چھوڑی ہوتی تو اُردو کی دنیا میں ایک نئے باب کا قابلِ قدر اضافہ ہوتا اور ایک بڑی کمی پوری ہو جاتی۔

ابو الکلام آزاد کی طرزِ تحریر اور اسباب پر غور کرتے وقت دلکشی کی ایک اور خاص وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ ان کی خطابت کے سلسلہ میں ہم کو یہ نہ بھول جانا چاہیے کہ وہ اپنے دور کے بہترین مقررین میں سے تھے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُردو میں اس لحاظ سے ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ وہ اپنی تقریر کے لیے سارے ہندوستان میں مشہور تھے۔ ان کی خطابت ساحری تھی، لب و لہجہ کے علاوہ بیان کی شگفتگی، دل سے نکلتے ہوئے جوش و خروش، اس طرح باتوں بات میں محسوسات کو متحرک کرتے تھے کہ سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو جاتا تھا۔ ان کی تقریریں سننے والوں کو وہی لذّت ملتی۔ جو ایک اچھے مغنّی کے نغمۂ دلنواز یا باکمال شاعر کے رُوح پرور اشعار سے نصیب ہو سکتی ہے۔ تقریر کا جوہر آزاد کی تحریر کو بھی دل کش بنانے میں معاون ہوا الفاظ کے اُتار چڑھاؤ سے دلوں کو متاثر کر لینا یہاں بھی کام آیا جملوں کو مفہوم و معنی کے لحاظ سے یکے بعد دیگرے اس طرح ضبطِ تحریر میں لانا کہ تاثیر کے مدارج ذہن کی تہہ کو کھولتے چلے جائیں۔ اور الفاظ اثر لینے والی طبیعت کے آخری پردے کو جنبش میں لے آئیں غالباً فنِ خطابت کے ہی پرتو کا نتیجہ ہے۔ غور سے آزاد کی تحریر کو دیکھیے تو ایک جملے کے بعد دوسرا جملہ اپنی ساخت و معنویت کے لحاظ سے پہلے جملہ کی وضاحت اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آگے کے جملے کی گہرائی میں اضافہ کرتا جاتا تھا اور یہ سلسلہ کلام مبتدا کو خبر سے اتنا مربوط کر دیتا ہے کہ پوری عبارت فن کاری کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے مثال کے لیے یہ عبارت لے لیجیے:

"جس قید خانے میں صبح مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں۔ جہاں دوپہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح شام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے۔"

غالباً تحریر میں بار بار سوالیہ جملے لکھنے رہنا فن خطابت کا مرہون منت ہے تقریر میں سوالات سامعین کے ذہن کو اپنی طرف جس طرح متوجہ رکھتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ اس انداز بیان سے سماعت و توجہ تقریر میں مرکوز ہو جاتی ہیں۔ سامعین کا ذہن مشکل ہی سے غیر حاضر ہوتا ہے۔ یہ طرز تقریر آزاد کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ اس سے الگ ہونے کی نہ ضرورت تھی، نہ ممکن تھا۔ بغیر کسی کاوش کے یہ انداز تقریر طرز تحریر میں بھی نمایاں ہو گیا جس نے اس معرکہ میں بھی خوبی سے اپنا کام کیا۔ کتاب پڑھنے والے کو کبھی کبھی سوالات سے چونکا دیا جاتا ہے تو وہ خود بخود اپنے ذہن کو اپنے جواب کے لیے تیار کرتا ہے، اور غور و فکر کی فضا سے الگ نہیں ہوتا، مفہوم کے دریا میں ذہن کو غوطے دیتے ہوئے پڑھنے والا اپنے سے بھی مفہوم تک الفاظ کے ذریعے سے پہنچ کر جو لذت محسوس کرتا ہے اس میں اپنے غور و فکر کی بھی بلندی پاتا ہے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے، اور آزاد کی تحریر سے زیادہ سے زیادہ وابستگی محسوس کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہی شخص جو تقریروں کا بادشاہ ہو، وہ تحریر کے میدان میں آتا ہے تو اپنا رویہ بالکل بدل دیتا ہے۔ نہ خطابت ہوتی ہے، نہ غیر ضروری باتیں۔ وہ اپنی زبان کی طاقت قلم کو سپرد کر دیتا ہے۔ تصنیف کے وقت وہ خود نہیں بولتا۔ اس کا قلم باتیں کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تحریر میں ناصح مشفق بننا اور جا بجا "میرے بھائی"، کہنا ہنر نہیں عیب ہے۔ تحریر مجروح ہو جاتی ہے۔ اہل نظر سمجھتے ہیں کہ مصنف اپنے خیالات نہیں پیش کر رہا ہے، بلکہ دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھ کر اظہار علمیت کر رہا ہے، جو نخوت و تبختر کی سرحد سے جا ملتا ہے۔ آزاد نے اس نکتہ کو ذہن میں رکھ کر اپنی عبارت کو عموماً اس طرح پیش کیا ہے جیسے کوئی دانا تے راز یا عالم باعمل لوگوں سے باتیں کر رہا ہو۔ یہی باتیں ادب پسند طبیعت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو ہمیشہ کے لیے اپنا لیتی ہیں اور ان کا طرزِ تحریر دل و دماغ ہی کو نہیں بلکہ رگ رگ کو پھڑکا دیتا ہے۔

خطیب عموماً جذبات مشتعل کرتا ہے، ادیب جذبات سے زیادہ اپنی تحریر میں دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ مولانا جس پائے کے خطیب تھے، اس کا ایک تقاضا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیان کو پُر اثر اور تحریر کو زوردار بنانے کے لیے وہی انداز اختیار کرتے جو عبارت سے دلوں میں ہیجانی کیفیت پیدا کرتا۔ لیکن انھوں نے خطیب اور ادیب کے فرق و امتیاز کو ہر جگہ قائم رکھا۔ اوپر کی مثالوں میں بھی آپ نے دیکھا ہو گا کہ ادب کے میدان میں لفظی اشتعال انگیزی سے زیادہ وہ منطق و دلائل سے کام لیتے ہیں مفکروں اور شاعروں کے اقوال سے اپنی بات کو مضبوط کرتے ہیں۔ عبارت کی رعنائی و بیان کی معقولیت سے پڑھنے والوں کے دلوں کو گرماتے ہیں۔ محض الفاظ کی بازی گری سے دلوں میں ہیجان پیدا کرنے کی جگہ وہ شعور کو متاثر کرتے ہیں فہم و ادراک کو مشتعل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ گرمیٔ گفتار ادب کا سرمایۂ حیات بن جاتی ہے، اور طرزِ تحریر وہ خصوصیت و انفرادیت حاصل کر لیتا ہے جس کی مثال اُردو میں نظر نہیں آتی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد کا ادبی مقام

ڈاکٹر سید عابد حسین

اس حقیقت کو تو سبھی جانتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد اُردو کے نثر نگاروں میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں مگر وجہِ امتیاز کیا ہے؟ اس پر ابھی تک کسی نے پوری طرح روشنی نہیں ڈالی۔ میں نے مولانا کی تحریروں کا ہمہ گیر اور گہرا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے ان کے طرزِ خیال اور اسلوب بیان کی خصوصیات پر تفصیلی نظر ڈالنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اربابِ نظر کو مسئلے کے ایک پہلو کی طرف جو مجھے اہم اور قابل غور معلوم ہوتا ہے توجہ دلاؤں۔

لکھنے والے، چاہے اُردو کے ہوں یا کسی اور زبان کے۔ جب تصنیف و تالیف کی راہ میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی فکر اور ان کے فن کو بلوغ کی منزل تک پہنچنے سے پہلے نشو و نما کے کئی مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے، وہ عام طور پر مختلف استادوں کی تقلید میں خیال اور اظہار خیال کے مختلف طرزوں کو آزماتے ہیں بہت سے تو ان ہی میں سے کسی تقلیدی مرحلے میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ مگر بعض جن کی طبیعت میں ایک خاص اُمنگ اور اپج ہوتی ہے، ترقی کی اس منزل تک پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کا اپنا سوچنے اور لکھنے کا ایک مخصوص اور مستقل انداز بن جاتا ہے اور وہ صاحبِ طرز انشا پرداز کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں، مولانا آزاد کے فکر و فن کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نشو و نما کے جو مرحلے انھوں نے طے کیے ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک منزل تھا۔ یعنی ادبی زندگی کے ہر دور میں جس سے وہ گزرے، اور سوچنے اور لکھنے کے ہر طرز میں جو انھوں نے اختیار کیا ان کی تحریر میں ایک خاص اپج، انفرادیت اور پختگی پائی جاتی تھی اور وہ ہر طرز میں ایک صاحبِ طرز انشا پرداز کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا کی ادبی زندگی کے تین دور قرار دیے جا سکتے ہیں۔ پہلا بارہ برس کی عمر سے جب انھوں نے اخباروں اور رسالوں میں لکھنا شروع کیا، ۲۸ برس کی عمر یعنی ۱۹۱۶ء تک جب انھوں نے تذکرہ تصنیف کیا۔ دوسرا اس کے بعد سے ۱۹۳۶ء تک جس میں وہ زیادہ تر قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کے کام میں مصروف رہے۔ تیسرا ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک جب انھوں نے "غبار خاطر"

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو مکمل کیا۔ اس کے بعد مولانا کی ادبی زندگی ایک طرح سے ختم ہوگئی ان خطبوں کے سوا جو انھیں بحیثیت کانگریس کے صدر یا آزاد ہندوستان کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے دینے پڑے، غالباً انھوں نے کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں لکھی۔

پہلے دور کی تحریروں میں جن کا بہترین نمونہ "تذکرہ" ہے کچھ تو لکھنے والے کے سن شباب کے تقاضے سے اور کچھ اس زمانے کے عام مذاق کے اثر سے شدتِ احساس و شدت اظہار، بے قید تخیل اور بے ضبط مبالغہ، غرض وہ سب چیزیں موجود ہیں جنھیں ہمارے نقاد رومانی اسلوب کی خصوصیتیں قرار دیتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ان تحریروں خصوصاً الہلال کے مضامین اور تذکرے میں دو کیفیتیں جو لکھنے والے کی طبیعت پر چھائی ہوئی تھیں صاف جھلکتی ہیں۔ ایک اخلاقی شدت پسندی اور دوسرے انتہائی خود اعتمادی جو خود پسندی کی حد تک پہنچ گئی ہے اور یہ دونوں رومانی رنگ میں کسی طرح نہیں کھپتیں۔ اس لیے کہ رومانی مزاج کو اخلاقی قید و ضبط سے وحشت ہوتی ہے اور وہ خود نگری اور خود شکنی کے دونوں سروں کے درمیان اس طرح جھولتا رہتا ہے کہ اس میں خود اعتمادی کا توازن پیدا ہونا مشکل ہے۔ دراصل الہلال میں مولانا آزاد کے مضامین اور تذکرے کے آہنگ و اسلوب کو ہم رومانی یا خطیبانہ کے بجائے زعیمانہ کہیں تو زیادہ موزوں ہوگا۔ تذکرے کی ان عبارتوں کو پڑھیے، اور دیکھیے کہ خوابِ جوانی کی غفلت و سرمستی سے چونکنے کے بعد سب حجابوں کا اٹھ جانا اور شاہد حقیقت کا بے نقاب نظر آنا کس شد و مد سے بیان کیا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے زمین و آسمان "صاحب نظرے پیدا شد" کے نعرے سے گونج رہے ہیں اسے آپ زعیمانہ انداز بیان کے سوا اور کیا کہیں گے۔

"وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے، اپنے ہر جلوے سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمے سے کانوں کو سرمستی و ہشیاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں، اب اس کا کونہ کونہ، چپہ چپہ، ہشیاری و بینش کا مرقع تھا، بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرم گفتار پایا، پتے پتے کو مکتوب و مسطور دیکھا، پھولوں نے زبان کھولی، پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کیے، خاک پامال نے اڑ اڑ کر گہر افشانیاں کیں۔ آسمانوں کو بار بار اترنا پڑا تاکہ سوالوں کا جواب دیں، زمین کو کتنی ہی مرتبہ اچھلنا پڑا تاکہ فضائے آسمانی کے تارے توڑ لائیں۔ سب نے نقاب اتار دیے۔ سارے پردے چھلنی ہوگئے، سب کی ابروؤں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں حکایتیں بھری تھیں۔"

دوسرے دور میں مولانا آزاد کا ذہن سیاست کے جھمیلوں کے باوجود قرآن اور قرآنیات کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطالعے میں ڈوبا رہا اور ان کا قلم زیادہ تر کلام مجید کے ترجمہ و تفسیر میں مصروف رہا، اس کا اثر ان کے ادبی طرز پر یہ پڑا کہ شدتِ احساس کا رخ خود بینی سے خدا بینی کی طرف مڑ گیا، اور زورِ بیان خود نمائی کی جگہ حق نمائی میں صرف ہونے لگا۔ اب لکھنے والے کا خطاب پڑھنے والوں کے جذبات سے نہیں بلکہ ان کے ضمیر سے تھا اور اس کا مقصد اپنی ذہنی اور روحانی فضیلت کو جتانا نہیں بلکہ ان کی مذہبی اور اخلاقی روح کو جگانا تھا۔ مقدمۂ ترجمان القرآن کا ایک ٹکڑا سنیے۔ جس میں مکافات یعنی جزا اور سزا کے مسئلے کو سمجھایا ہے اور انصاف سے کہیے کہ مولانا آزاد کے زعیمانہ اسلوب میں ایک نیا کلیمانہ آہنگ پیدا ہو گیا ہے یا نہیں؟

"تم دیکھتے ہو کہ فطرت ہر گوشۂ وجود میں اپنا قانون مکافات رکھتی ہے۔ ممکن نہیں کہ اس میں تغیر یا تساہل ہو فطرت نے آگ میں خاصہ رکھا ہے کہ جلائے، اب سوزش و تپش فطرت کی وہ مکافات ہو گئی جو ہر اس انسان کے لیے ہے جو آگ کے شعلوں میں ہاتھ ڈال دے گا۔ ممکن نہیں کہ تم آگ میں کود و اور اس فعل کے مکافات سے بچ جاؤ۔ پانی کا خاصہ ٹھنڈک اور رطوبت ہے۔ یعنی ٹھنڈک اور رطوبت وہ مکافات ہے جو فطرت نے پانی میں ودیعت کر دی ہے۔ اب ممکن نہیں کہ تم دریا میں اتر و اور اس مکافات سے بچ جاؤ۔ پھر جو فطرت کائناتِ ہستی کی ہر چیز اور ہر حالت میں مکافات رکھتی ہے۔ کیوں کر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال کے لیے مکافات نہ رکھے، یہی مکافات جزا و سزا ہے۔

آگ جلاتی ہے، پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے۔ سنکھیا کھانے سے موت، دودھ سے طاقت آتی ہے کونین سے بخار رک جاتا ہے جب اشیاء کی ان تمام مکافات پر تمہیں تعجب نہیں ہوتا کیوں کہ یہ تمہاری زندگی کی یقینیات ہیں، تو پھر اعمال کے مکافات پر کیوں تعجب ہوتا ہے؟ افسوس تم پر تم اپنے فیصلوں میں کتنے ناہموار ہو۔"

تیسرے دور میں مختلف عوامل نے مولانا کی طبیعت پر اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی اسلوب پر گہرا اثر ڈالا۔ عمر، تجربے اور قومی ذمہ داریوں کے بوجھ نے ان کے مزاج کی لے کو دھیما کر دیا تھا۔ پھر ۲۰ سال تک قرآن مجید کے فہم و تفہیم میں مصروف رہنے سے ان کے مذہبی احساس میں جذب پر سلوک کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ مغربی ادب کے مطالعے نے جس کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرف غالباً مولانا نے اس زمانے میں زیادہ توجہ کی، ان کی فکر اور تحریر میں ضبط و اعتدال پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ "غبار خاطر" کے اسلوب میں جو ان کے اس زمانے کی طرز بیان کی پوری نمایندگی کرتا ہے، دریا ئے فصاحت کی روانی تو بدستور قائم ہے لیکن رد سے دریا کی تیزی اور تندی کی جگہ قعودِ یا کے جزم و سکون نے لے لی ہے۔ اب صحتِ فکر، ہمواری اور توازن نے مولانا کی تحریر میں اس ادیبانہ اسلوب کی شان پیدا کر دی ہے جو جدید مغربی ادب میں بہترین انشاپردازوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس عبارت پر غور کیجیے:

"انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک، اس کے تقلیدی عقائد میں اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر دے سکتی، جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا اس لیے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں۔ وہ انھیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ، ہر عمل، ہر نقطۂ نگاہ جو اسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے۔ اس کے لیے ایک مقدس ورثہ ہے۔ وہ اس ورثے کی حفاظت کرے گا مگر اسے چھونے کی جرأت نہیں کرے گا۔ بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گردوپیش کا اثر بھی اسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔"

یہ تو جدید ادبیانہ اسلوب کا سنجیدہ رخ تھا۔ اب اس کے ہلکے رنگ اور خوش طبعی کے انداز کو ملاحظہ کیجیے۔ قلعہ احمد نگر کی اس عمارت میں مولانا، پنڈت نہرو اور دوسرے قومی لیڈر نظر بند تھے، اپنے کمرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"گذشتہ سال جب ہم یہاں آئے تھے تو ان چڑیوں کی آشیاں سازیوں نے بہت پریشان کر دیا تھا۔ چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں، یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آگئی ہے۔ میں نے اٹھائی اور اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں۔ اس لیے دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی۔ برآمدے میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا گیا اور اسے اٹھا لایا۔ اب کچھ نہ پوچھیے کہ میدانِ کار زار میں کس زور کا رن پڑا۔ کمرے میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بانس اٹھائے دیوانہ وار اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا! اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف و محراب سے بالکل صاف تھا۔ اب دشمن کی فوج تتر بتر ہو گئی تھی۔ مگر یہ اندیشہ باقی تھا کہ کہیں پھر اکٹھی ہو کر میدان کا رخ نہ کرے۔ تجربے سے معلوم ہوا تھا کہ بانس کے نیزے کی ہیبت دشمنوں پر خوب چھا گئی ہے۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ ابھی کچھ عرصے تک اسے کمرے ہی میں رہنے دیا جائے۔

اب گیارہ بج رہے تھے۔ میں کھانے کے لیے چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو کمرے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹھک کر رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں سارا کمرہ پھر حریف کے قبضے میں ہے۔ جس ہتھیار کی ہیبت پر اس درجہ بھروسہ کیا گیا تھا وہی حریفوں کی کام جوئیوں کا ایک نیا آلہ ثابت ہوا۔ بانس کا سرا جو گھونسلے سے بالکل لگا ہوا تھا گھونسلے تک پہنچ جانے کے لیے اب دہلیز کا کام دے رہا تھا۔ تنکے چن چن کر لاتے ہیں اور اس نو تعمیر دہلیز پر بیٹھ کر بہ اطمینان گھونسلے میں بچھا جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چوں چوں بھی کرتے جاتے ہیں۔ عجب نہیں یہ مصرع گنگنا رہے ہوں:

ع عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

اس ادیبانہ اسلوب میں چونکہ علمی طرز بیان کی بنیادی صفات یعنی فکر کی صحت اور ہمواری اور لفظ و معنی کا توازن موجود ہے اس لیے جب مولانا اسے کسی علمی مسئلے پر بحث کرنے کے لیے کام میں لاتے ہیں تو یہ آسانی سے حکیمانہ اسلوب کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں یہ مثالیں اس صفت کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہیں جس کی بنا پر مولانا آزاد کو اردو نثر نگاری میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ یہ صفت ان کی ہمہ گیر قدرتِ کلام ہے، اسی کی بدولت انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی مختلف منزلوں میں خیال اور اظہار خیال کے مختلف طرزوں کو یکساں حسن و خوبی سے برتا۔ اس لیے ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ ابوالکلام کا لقب جو انھوں نے اختیار کیا ان پر اس طرح سجتا ہے جیسے ان ہی کے لیے وضع ہوا ہو۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد کی نثر

علی جواد زیدی

طرز نگارش اگر ایک طرف ادیب کی شخصیت کو ظاہر کرتی ہے تو دوسری طرف ملک اور سماج کے عام سیاسی اور ثقافتی رجحانات کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ اس لیے اسلوب کا جائزہ لیتے وقت یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ان محرکات پر نظر رکھی جائے جو کسی ادبی تخلیق کو وجود میں لانے کا باعث ہوئے ہیں۔ اس کلیہ کا اطلاق عام ادیبوں پر تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن ان ادیبوں کے بارے میں تو حرف بحرف صحیح ہے جن کے اسلوب میں کوئی انوکھا پن، کوئی نئی شان، کوئی نیا رجحان ہو مولانا آزاد کے اسلوب نگارش کا تعلق اسی آخر الذکر طبقے سے ہے۔

یوں تو مولانا نے کم سنی میں شاعری بھی کی تھی لیکن اس رہ گزر کی دل فریبیوں میں وہ الجھے نہیں اور بہت جلد انھوں نے نثر کو اس طرح اپنایا کہ آج بہت کم لوگوں کو یہ معلوم بھی ہے کہ انھوں نے کبھی شاعری کی تھی۔ لیکن لطیف شعریت ان کے مزاج میں اس طرح رچی بسی ہوئی تھی کہ انھوں نے اپنے ذوق شعری کو اوزان و بحور سے آزاد کر کے اپنی دل کش نثر میں سمو لیا تھا۔ وہ الہلال کی خطیبانہ حدی خوانی ہو یا "غبار خاطر" کی ساحرانہ "سادگی و پرکاری" دونوں ہی لب ہزار شورش "پر صدا سے دلنواز" بن جاتی تھیں۔ وہ درحقیقت ایک باذوق اور حساس فن کار تھے جن کی صلاحیتوں پر سیاسی اور معاشرتی ہنگامہ آرائیوں نے گہرے پردے ڈال دیے تھے انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ایسی اضطراب انگیز اور طوفان خیز فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے لکھا ہے، جہاں کم صلاحیتوں والے یا تو ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں یا گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیتے ہیں۔ مولانا کے دل و دماغ میں علوم و فنون کا ایک دریا موجیں مار رہا تھا، جسے وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ زمانہ مہلت دیتا تو وہ صرف خدمت قلم کرتے، لیکن قومی تقاضوں نے ان پر ایسی سیاسی ذمہ داریاں ڈال دی تھیں کہ وہ بے اختیاری کے عالم میں میدان کارزار کی طرف دوڑ پڑے اور پھر وہاں سے ایک فرض شناس کی طرح واپسی کی تمام راہیں خود ہی مسدود کر لیں۔ اس کا احساس انھیں بار بار ستا رہا تھا۔ اپنے رفیق غلام رسول مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت والم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم وفنون ادب، انشاء، شاعری کوئی ایسی وادی نہیں جس کی بے شمار نئی راہیں مبدء فیاض نے مجھ نامراد کے دل ودماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن، ہر لحظہ بخششوں سے دامن مالا مال نہ ہوا ہو۔ بحدیکہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیوں کو ماند کردیتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر ونظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا اس نے شاید سروسامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا، مگر اس کے حوالے کردیا گیا۔"

میں اس سے متفق نہیں ہوں کہ مولانا اس عہد اور ماحول کے آدمی نہیں تھے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ مولانا کے کردار کے روشن پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے اسی تاریکی کی شدید ضرورت تھی جو انھیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ وہ مجمع میں ہوکر بھی مجمع سے الگ تھلگ ضرور نظر آتے تھے، لیکن غور کیجیے تو اسی مجمع کو ایسے ہی مشعل خاموش کی ضرورت بھی تھی۔ انھیں جو مجمع ملا تھا اس پر سرسید، حالی اور نذیر احمد کی اصلاح پسندی کا جادو چل چکا تھا، اور وہ سیاسی جدوجہد اور ثقافتی نشاۃ الثانیہ کے انقلابی امکانات سے جان بوجھ کر چشم پوشی کررہا تھا یا دور انحطاط کی سنگین غفلتوں میں مبتلا تھا۔ اصلاح کی اس طلسمی فضا سے نکالنے کے لیے یقیناً ایک شبلی اور ایک ابوالکلام آزاد کی ضرورت تھی۔ دونوں کے ذوق وشعور میں ایک شرار معنوی پنہاں تھا اور اسے بہرحال اظہار کی راہ نکالنا تھی۔ ممکن ہے کہ دوسرے اس عالم میں راہ گریز اختیار کرلیتے۔ لیکن مولانا کا عالم کچھ اور ہی تھا۔

تو بگریزی از پیش یک شعلہ خام
من استادہ ام تا بسوزم تمام

اسی شرار معنوی نے اظہار کی دو راہیں نکالیں۔ ایک تو دور "الہلال والبلاغ"، سے متعلق ہے۔ جب ایک سوئی ہوئی قوم کو جگانا اور جھنجوڑنا تھا۔ یہاں جوش، ولولہ، امنگ، للکار، رجز خوانی، مبارزت کا انداز ہے ان کے پیش نظر ایک حال ہے جو بے جان ہے اور ایک مستقبل ہے جو ہاتھوں کی رسائی سے دور نہیں۔ لیکن جس کی طرف لوگ اس لیے ہاتھ نہیں بڑھاتے کہ ان کو ڈرایا للچایا جارہا ہے۔ مولانا کی بے چین فطرت اور ان کا حساس دماغ پورے احساس ذمہ داری سے ایک ایسا رزمیہ تخلیق کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے جو مردہ رگوں میں بھی خون دوڑادے۔ ان کی آنکھوں سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خون کے آنسو ٹپکتے ہیں، لیکن اس طرح کہ ان سے عمل کے شرارے بھی نکل رہے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ طرزِ خطابت اور یہ رزمیہ انداز بے کار نہیں گیا بلکہ اس نے صورِ اسرافیل کا کام کیا۔

اس دور کی نثر کو عبارت آرائی، خطابت یا صحافت کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ اس میں بے جا آورد نہیں ہے۔ تصنع نہیں ہے۔ ایک پہاڑی چشمے کی روانی ہے جو بڑے بڑے پتھروں کو بھی بہا کر لے جا سکتی ہے۔ اس میں کوری منطق یا بے جان سادگی کی تلاش بے سود ہے۔ کیونکہ جب دل و دماغ پر حصولِ مقصد کی تمنا چھا گئی ہو اور اس میں سارا وجود، ساری علمیت، ساری فن کاری پیوست ہو گئی ہو، تو والہانہ نغمے اور روح پرور نعرے ہی زبان پر آتے ہیں۔ پھر مولانا نے علم و ادب اور شاعری و موسیقی کے خنک سائے میں زندگی کی ابتدائی بہاریں گزاری تھیں۔ ذوقِ سلیم نے ہزاروں منتخب اشعار و امثال و اقتباسات کو ان کے بے پناہ حافظے میں محفوظ کرا دیا تھا۔ اس اتھاہ سمندر سے جو موج اٹھتی تھی اس میں اگر شعر و نغمہ کی دل کشی بھی ہوتی تو اس میں تعجب کیا تھا۔ مولانا نے بیشتر مضامین جس رداروی میں لکھے ہیں ان سے واقف ہونے کے بعد کوئی ان پر آورد کا الزام نہیں لگا سکتا اور جنھوں نے ان کے بے پناہ خطبے سنے ہیں وہ جانتے ہیں تمام شاعرانہ فضا اور فنی لطافتیں ان کے قلم اور ان کی زبان پر بے تکلف آجاتی تھیں۔ یہ طرز اس دور میں کچھ ایسا مقبول ہوا کہ بیسیوں ادیب نقالی پر اتر آئے، لیکن لفظوں کے طمطراق کی چمک دمک میں وہ خلوص کسی کو نہ نصیب ہوا جس کی بدولت مولانا نے ایک پوری نسل کو متاثر کر دیا تھا۔

مولانا کی نثر نگاری کا دوسرا پہلو وہ ہے جو "ترجمان القرآن" یا "تذکرہ" میں ظاہر ہوتا ہے، یہاں بے پایاں صلاحیت اخذ و کسب اور ایک بے کنار دریائے علم کے بہاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں نسبتاً زیادہ ٹھہراؤ ہے، تاریک گوشوں اور اَن دیکھے زاویوں تک روشنی کی شعاعیں پہنچانے کی خواہش ہے، خطابت کم ہے، ذہانت، متانت اور علمیت کا وقار زیادہ ہے۔ یہاں جذبات کو عام کرنے اور ہر دل میں ایک چنگاری جگا دینے کی خواہش کم ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دماغوں میں نئی فکر کے چراغ جلانے کا حوصلہ زیادہ ہے۔

لیکن ان دونوں سے قدرے مختلف وہ اسلوب ہے جو "غبارِ خاطر" اور دوسرے مکاتیب میں نمایاں ہوتا ہے۔ چونکہ مولانا کے مکتوب الیہ زیادہ تر ہم مشرب اور ادا شناس ہیں۔ اسی لیے مولانا اپنی پُر وقار انا کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی زندگی کے بند دریچوں کو کھول دیتے ہیں۔ نہ اس لیے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ باہر کی ہوا اندر آ سکے بلکہ اس لیے کہ اندر کی روشنی صاحبانِ نظر دیکھ سکیں۔ اس خلوت میں جلوت کا عالم قابلِ دید ہے۔ کم آمیزی کا انداز یہاں بھی ہے۔ لیکن یہ انداز رازدارانہ اور حجیبانہ ہے۔ اس لیے وہ اُن خطوں میں دل کی گرہیں کھولتے ہیں یا اپنی ہستی کے مختلف پہلوؤں سے ان حجابات کو اٹھاتے ہیں جن پر ان کی گوشہ نشینی نے پردے ڈال دیے تھے، یہاں عجیب روانی اور مبصرانہ حسن آفرینی آگئی ہے۔ اس عالم میں کبھی وہ یہ کہتے ہیں کہ "حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حسن ہے اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اس محروم ازلی پر جس کے بے حس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا" اور کبھی یہ کہ:

"نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اُٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے۔"

اس دور کے آزاد نہ پہلے کے صحافی اور خطیب ہیں۔ نہ رجز خواں اور نہ سیاسی انقلاب کے رہبر۔ بلکہ ایک فن کار مبصر اور حسن دوست اور حسن آفریں ہیں اور بس۔ اسی لیے سجاد انصاری نے مولانا کی نثر کو الہامی نثر کا درجہ دیا ــــــ اور مہدی افادی کو اس میں مہ جبینوں کا حسن نظر آیا، اور ایک پوری قوم کو اس میں پیغمبرانہ شان نظر آئی۔ جس کے ہر اتار چڑھاؤ سے صدائے "قم باذنی" بلند ہوتی تھی اور یہ سب ایک ہی مقصد کے تابع تھا جس کے حصول کے لیے مولانا کی نثر خود مولانا کے علی الرغم ایک آلۂ کار بن گئی تھی۔

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اردو نثر میں مولانا آزاد کا اجتہاد

پروفیسر آل احمد سرور

اردو نثر میں مولانا آزاد کے اجتہاد کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے غالب کی مثال ذہن میں رکھنی ہوگی۔ غالب کو اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے کئی راستوں سے گزرنا پڑا۔ بیدل کی آمریت سے غالب آخر میں آزاد ہوگئے۔ مگر بیدل کو جذب کرکے، دوسرے الفاظ میں غالب کو سمجھنے کے لیے بیدل کے اثر کی انقلابی اہمیت کو بھی ذہن میں رکھنا پڑے گا۔ اس طرح غالب کے اردو خطوط کی سادہ پرکاری کے پیچھے فارسی انشاء پردازی کا ایک عمر کا ریاض الفاظ پر فتح پانے کی ایک طویل داستان ہے۔ غالب گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج تھے اور اپنے آپ کو "عندلیب گلشن ناآفریدہ" کہتے تھے۔ ابوالکلام آزاد کے ہاں بھی یہی خصوصیت ملتی ہے۔ دونوں کی انفرادیت شاہراہ عام سے بچ کر چلتی ہے، دونوں کے ہاں انانیت ہے دونوں کی منزل کو سمجھنے کے لیے ان کے آغاز سفر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے، اس کے ساتھ یہ بھی کہنا ہے کہ غالب نے جہاں اقبال کو متاثر کیا وہاں ابوالکلام آزاد کو بھی۔ یہ اثر صرف غالب کے اشعار کا حوالہ دینے تک محدود نہیں ہے مولانا کی پوری ادبی شخصیت میں بھی اس کا پرتو نظر آجاتا ہے۔

سرسید کی تحریک نے اردو ادب کو مغرب کی عقلیت سے آگاہ کیا، مولانا سرسید کی سیاست سے الگ رہے۔ مگر ان کی حریت فکر کی نشوونما میں سرسید کا بڑا ہاتھ ہے سرسید جدید اردو نثر کے معمار اعظم ہیں۔ لیکن سرسید کا اثر صرف ان کے اسلوب کی تقلید تک محدود نہیں ہے۔ مولانا کی ابتدائی تربیت قدیم ماحول میں ہوئی مگر قدیم فکر کے دائرے سے انھیں سرسید کی تصانیف نے نکالا۔ سرسید کے اثر سے اردو ادب کے چمن میں بہت سے پھول کھلے، حالی نے مرغن غذاؤں کے شیدائی کو "ابالی کھچڑی اور بے نمک سالن" کی غذائیت کی طرف متوجہ کیا، نذیر احمد نے ان سے اصلاح معاشرت کے رموز سیکھے۔ مولوی شبلی کو انھوں نے علامہ شبلی بنایا یعنی مغرب کا اثر ایک نئی مشرقیت میں جلوہ گر ہوا جس کے نقوش مذہبی، سیاسی اور صحافتی میدان میں، الہلال اور البلاغ کے اوراق میں، ادب لطیف کے میدان میں سجاد حیدر کے خیالستان اور نیاز فتح پوری اور ان کے نگارستان میں، شاعری میں ایک طرف اقبال کی بانگ درا میں اور دوسری طرف عظمت اللہ خاں کے سریلے بول میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُردو نثر سرسید سے پہلے شاعری اور مرصع کاری کے زیور کے بغیر اپنے حسن کی نمائش نہیں کرسکتی تھی سرسید نے اس پر زور دیا کہ "حسن ذاتی" تکلف سے بری ہے اور نثر کو مانگے کے زیور کی ضرورت نہیں، مگر نئی مشرقیت جو تقدیر امم کا مطالعہ کر رہی تھی اور ایک طرف علوم جدیدہ سے اثر قبول کر رہی تھی اور دوسری طرف اپنے ماضی کا نئے سرے سے جائزہ لے رہی تھی صرف ایک سادہ اسلوب میں اپنے آپ کو مقید نہیں کرسکتی تھی۔ اس میں ایک رومانی جوش اور ولولہ تھا اور یہ رومانی ولولہ اپنے موضوع کے مطابق اپنے کام میں لانے پر مجبور تھا۔ مولانا آزاد کی بنیادی حیثیت ایک مفکر کی ہے۔ مفکر خلوت پسند ہوتا ہے۔ فکر اپنے اظہار کے لیے علمی اصطلاحات لانے پر مجبور ہے۔ مولانا کے یہاں عربی کی اصطلاحات اسی وجہ سے ہیں۔ پھر مولانا ایک بہت بڑے خطیب بھی ہیں، خطابت کے لیے رجزیہ لہجہ ضروری ہے اور سید عبداللہ نے الہلال کے مضامین کو رجز غلط نہیں کہا ہے۔ پھر مولانا ایک عظیم صحافی ہیں اور صحافت ہنگامی واقعات کو بھی آفاقی رنگ دینے پر مجبور ہے۔ ان اشاروں کی مدد سے الہلال اور البلاغ کے مصنف کا کارنامہ سمجھ میں آجائے گا۔ صحیح ہے کہ نثر سرسید اور حالی کی سادہ نثر سے مختلف ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ نثر کا بہترین نمونہ نہیں ہے۔ مگر اس میں علمی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی موضوعات کو خطیبانہ بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایک جلال ہے جس میں دلبری و قاہری ملے ہوئے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک پیمبرانہ انداز ہے جو حق اور باطل، سود و زیاں، نور و ظلمت، صراط مستقیم اور ضلالت کی نشاندہی کرتا جاتا ہے۔ الہلال مولانا کے تربیتی دور (Apprentice ship) کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ترجمان القرآن کی پرواز کے لیے پر تولنے کے مترادف ہے۔ صحافت خطابت سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی مگر سنجیدہ تصنیف میں خطابت بے جوڑ ہوتی ہے۔ ترجمان القرآن میں مولانا کی نثر کی دوسری منزل ملتی ہے جس میں علمی نثر نے ایک پرسوز تخیل کے سہارے شگفتگی پیدا کر لی ہے اور غزل کے شوخ اشعار کی مدد سے اپنی بات واضح کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمان القرآن کی پہلی جلد جو سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ حکیمانہ نکتہ سنجی کے ساتھ کہیں کہیں شاعرانہ شوخی سے بھی کام لیتی ہے تاکہ حکمت بوجھ نہ معلوم ہو بلکہ باعث کشش نظر آئے۔ ترجمان کی نثر کو ہم غالب کے درمیانی دور کی شاعری کی مثال سمجھ سکتے ہیں غالب کی انفرادیت اس دور میں رنگ بہار ایجادی بیدل کی مرہون منت نہیں رہی، اس نے اپنی راہ پالی ہے۔ مولانا کی حکمت اب خطابت کے طوفان نہیں اٹھاتی، ہاں شعریت کی ہلکی سی موجیں ضرور پیدا کرتی ہے موضوع کی رعایت سے انداز

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیان علمی ہے مگر اس میں علم کی خشکی نہیں ایک جمالیاتی حسن ہے جس کی وجہ سے ایک رعنائی پیدا ہو گئی ہے۔ مفکر کو اظہار خیال کے لیے وسیع میدان ملا ہے، مگر مفکر ذوق جمال رکھتا ہے اس لیے فکر کے پہاڑ نہیں لڑھکاتا ہاں اس کی آب و تاب دکھاتا ہے۔ یہاں صحافت نہیں ہے کہ طوفانی کیفیت پیدا کرے، یہاں ازلی اور ابدی صداقتوں کی تشریح ہے جن کے لیے حکیمانہ اسلوب کی ضرورت ہے۔ مولانا آزاد نے اس طرح اردو نثر کو برگزیدگی عطا کی ہے۔ سجاد انصاری نے جب کہا تھا کہ اگر قرآن اُردو میں اُترتا تو اس کے لیے ابوالکلام کی نثر منتخب کی جاتی تو ان کا اشارہ اسی برگزیدگی کی طرف تھا۔

لیکن مولانا صرف مفکر یا خطیب یا صحافی ہی نہیں تھے۔ سیاست بھی ان کی زندگی میں بڑا اہم درجہ رکھتی تھی بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شریک غالب تھی۔ سیاست نے انہیں سرسید کی سیاست کے خلاف جدوجہد میں مصروف رکھا، مگر سرسید کے اسلوب کے امکانات ان پر واضح کر دیے۔ چنانچہ رام گڑھ کے خطبے میں ہی ہمیں ان کے اسلوب میں ایک اور ارتقائی مقام ملتا ہے جس سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ الہلال صرف اپنی خطابت کی وجہ سے مقبول نہیں ہوا تھا۔ نہ ترجمان القرآن اپنی حکیمانہ نکتہ سنجی اور شگفتگی کی وجہ سے، بلکہ دونوں کے پیچھے ایک بیدار ذہن کی روشنی، ایک پرسوز شخصیت کا گداز، ایک ہمہ گیر مزاج کا شعلہ طور اور ایک مقدس آتش کدے کی چنگاری تھی جسے خلوت کی تنہائیوں نے ہوا دی تھی اور جو ہجوم میں ان کی رفیق رہتی تھی۔ غبار خاطر کا ذوق خامہ فرسائی اس وجہ سے ان کے اسلوب کی ارتقائی شکل کو ظاہر کرتا ہے اس کو خطوط کے محدود پیمانے سے ناپنے کی ضرورت نہیں، اس میں دراصل اپنے گردوپیش کے تذکرے کی داستان ہے انانیتی ادب کی بحث ہو یا داستان بے ستون و کوہ کن، چڑے چڑیا کی کہانی ہو یا پھولوں کی بہار کا تذکرہ، موسیقی کے اثرات کی تفصیل ہو یا صلیبی معرکوں کی حکایتیں۔ ان میں مولانا آزاد کا اسلوب ایک جوے نغمہ خواں کی طرح ہے، مگر اس کی دل کشی اور دلآویزی کو سمجھنا ہے تو الہلال کے اسلوب کو ذہن میں رکھنا پڑے گا۔

جدید اردو نثر عربی اور فارسی سے جو کچھ لے سکتی تھی، وہ ابوالکلام نے لے لیا۔ عرب کے سوزِ دروں اور عجم کے حسنِ طبیعت دونوں کو اردو میں سمو لینا۔ اور اردو کو عربی اور فارسی کا غلام نہ ہونے دینا معمولی کام نہیں ہے۔ مولانا آزاد کی نثر سے یہ کام ختم ہو گیا اور اقبال کی نظم سے۔ اب اردو نثر کی ترقی کے لیے جو امکانات ہیں وہ عالمی ادب خصوصاً انگریزی سے لیے جا سکتے ہیں، مگر اچھی اردو نثر میں عربی اور فارسی کے اثرات جس طرح حل ہو گئے ان کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا پڑے گا۔ اس وجہ سے ابوالکلام آزاد کے جوشِ قدح سے بزم ادب میں ہمیشہ چراغاں رہے گا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد کی خطوط نگاری

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

غبارِ خاطر :

"غبارِ خاطر" نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانیؒ کے نام مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ اس کا شمار اگرچہ مولانا آزاد کی اوّل درجے کی تصنیفات میں نہیں ہوتا اور علمی اعتبار سے ترجمان القرآن اور تذکرہ کا ہم پلہ نہیں۔ لیکن ادبی اعتبار سے غبارِ خاطر اردو کی عظیم تصنیف ہے۔ غبارِ خاطر کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ مولانا کی کسی تصنیف کو حاصل نہ ہو سکی، بلکہ اردو کی پوری تاریخ تصنیف و تالیف میں کوئی کتاب ایسی پیش نہیں کی جا سکتی جسے غبارِ خاطر جیسی مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔

اس کا پہلا ایڈیشن "حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی" نے مئی ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔ پورا ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ایڈیشن ختم ہو گیا دوسرے ہفتہ میں کتاب کمیاب ہو گئی لیکن ملک کے اندر مانگ بدستور باقی تھی۔ اگست میں اس کا دوسرا ایڈیشن بازار میں آگیا۔ انھی ایام میں اس کا ایک ایڈیشن غیر قانونی طور پر حیدر آباد دکن میں شائع کر دیا گیا۔ لیکن یہ ایڈیشن بھی چند ماہ کے اندر ختم ہو گیا۔ غبارِ خاطر کا تیسرا ایڈیشن ایک خط کے اضافہ کے ساتھ "مکتبہ احرار" لاہور نے ۱۹۴۷ء میں شائع کیا۔ تقسیم ملک کے بعد پاک و ہند سے اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس کا آخری ایڈیشن ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ ایڈیشن جناب مالک رام نے مرتب کیا ہے۔

غبارِ خاطر طویل و مختصر چوبیس خطوط کا مجموعہ ہے۔

ایک خط گرفتاری سے قبل کا ہے جو کلکتہ سے بمبئی جاتے ہوئے دوران سفر میں تحریر کیا تھا۔

بیئس خط ۱۰ر اگست ۱۹۴۲ء اور ۱۶ر ستمبر ۱۹۴۳ء کی درمیانی مدت کے قلعۂ احمد نگر کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسارت کے زمانے کے ہیں۔
دو مختصر اور ایک کسی قدر مفصل، یعنی تین خط رہائی کے بعد کے ہیں۔
موضوع اور مطالب کے لحاظ سے ان مکاتیب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ وہ مکاتیب جو کسی علمی، ادبی مسئلہ یا فلسفیانہ موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔
۲۔ وہ مکاتیب جو مولانا آزاد کی ذات اور ان کے گرد وپیش حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ کس قسم کے مکاتیب زیادہ اہم ہیں۔ پہلی قسم کے مکاتیب اگرچہ علمی موضوعات اور فلسفیانہ مباحث سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان میں بھی مولانا کی انفرادیت اور انانیت جھلکتی ہے اور ذوق ورجحان طبع، عقائد ونظریات، اخلاق وعادات اور ان کی نفسیات کے بارے میں بیش قیمت معلومات ملتی ہیں۔ دوسری قسم کے مکاتیب میں مولانا مرحوم نے اپنی گرفتاری، قلعہ احمد نگر کی زندگی، وہاں کے حالات، اپنی ابتدائی زندگی، خاندان، تربیت، تعلیم، احوال، افکار وعقائد اور ذوق ومعمولات روزمرہ پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ پہلی قسم کے مکاتیب بھی مولانا آزادؒ کی زندگی سے اتنا قریبی اور گہرا تعلق رکھتے ہیں کہ ان کی زندگی کے کسی پہلو پر قلم اٹھایا جائے تو ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

غبارِ خاطر کے مکاتیب میں مستقل یا ضمنی طور پر علمی وادبی، مذہبی وسیاسی، تاریخی ونظریاتی مباحث اس قدر آ گئے ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا بھی مشکل ہے۔ لیکن حقیقتاً یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں اصل ابوالکلام کو تلاش کرنا چاہیے۔ ان علمی وادبی، تاریخی ونظریاتی اور فلسفیانہ مباحث میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے خود اپنے ذوق وافکار کی داستاں سرائی کی ہے۔

دیباچہ میں مکاتیب کی حیثیت اور ان کی اشاعت کے پس منظر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ تمام مکاتیب نجی کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کیے جائیں گے۔ لیکن رہائی کے بعد جب مولوی محمد اجمل خان صاحب کو ان کا علم ہوا تو مصر ہوئے کہ انھیں ایک مجموعے کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ چونکہ ان کی طرح ان کی خاطر بھی مجھے عزیز ہے۔ اس لیے ان مکاتیب کی اشاعت کا سروسامان کر رہا ہوں۔ جس حالت میں یہ قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے اسی حالت میں طباعت کے لیے دے دیے گئے۔ نظر ثانی کا موقع نہیں ملا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نسخۂ شوق بہ شیرازہ نہ گنجد زنہار
بگزارید کے ایں نسخۂ مجزا ماند"

مقدمۂ اجمل خان میں "غبار خاطر" کے مکاتیب کی ایک اہم خصوصیت، جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ...... "مولانا کے دماغی پس منظر کی تلاش" بتائی گئی ہے، اس سلسلے میں فرماتے ہیں،

"ان مکاتیب پر نظر ڈالتے ہوئے سب سے زیادہ اہم چیز جو سامنے آتی ہے وہ مولانا کا دماغی پس منظر (بیک گراؤنڈ) ہے۔ اس پس منظر پر افکار و احساسات کی تمام جلوہ طرازیوں نے اپنی جگہ بنائی ہے .... یہی دماغی پس منظر ہے جس کی نوعیت سے ہر عظیم شخصیت کی عظمت کا اصل مقام دنیا کے آگے نمایاں ہوتا ہے یہی کسوٹی ہے جس پر ہر انسانی عظمت کسی جا سکتی ہے اور یہی معیار ہے جو ہر انسان کی عظمت و پستی کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ ان مکاتیب میں مولانا نے خود کوشش کی ہے کہ اپنا دماغی پس منظر دنیا کے آگے رکھ دیں اور اسی لیے یہ غیر ضروری ہو گیا ہے کہ اس بارے میں بحث و نظر سے کام لیا جائے۔ میں صرف معاملے کے اس پہلو پر اہل نظر کو توجہ دلانا چاہتا ہوں خود کچھ کہنا نہیں چاہتا۔"

"غبار خاطر" میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک خاص اسلوب نگارش اختیار کیا ہے یہ ایسا اسلوب ہے جس کی مثال اردو ادب میں نہیں ملتی اور اگر ملتی ہے تو انھیں کے بعض مضامین میں جو "الہلال" میں شائع ہوئے تھے اجمل خان نے اس طرز نگارش کا بڑی تفصیل کے ساتھ تعارف کرایا ہے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ طرز تحریر ہر قسم کے مضامین کے لیے مفید اور دلچسپ نہیں ہو سکتا اسی لیے مولانا نے مختلف قسم کے مضامین میں مختلف طرز اختیار کیے ہیں قلعۂ احمد نگر کے مکاتیب کے طرز تحریر اور دیگر خصوصیات کی نسبت تحریر فرماتے ہیں؛

"انھوں نے نثر میں شاعری کی ہے اور جس مطلب کو ادا کیا ہے اس طرح کیا ہے کہ جدتِ فکر نقش آرائی کر رہی ہے اور وسعتِ تخیل رنگ و روغن بھر رہی ہے۔

اجتہاد فکر اور تجدید اسلوب مولانا کی عام اور ہمہ گیر خصوصیت ہے۔ قلم اور زبان کے ہر گوشے میں وہ طرز عام سے اپنی روش الگ رکھیں گے اور الفاظ و تراکیب سے لے کر مطالب اور ادائے مطالب کے طرز تک ہر بات میں تقلیدِ عام سے گریزاں اور اپنے مجتہدانہ انداز میں بے میل اور بے لچک نظر آئیں گے۔ انھوں نے جس وقت سے قلم ہاتھ میں سنبھالا ہے ہمیشہ پیشرو اور صاحبِ اسلوب رہے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ کسی دوسرے پیش رو کے نقشِ قدم پر چلیں۔ چنانچہ ان مکاتیب میں ان کا مجتہدانہ انداز ہر جگہ نمایاں ہے۔ بغیر کسی اہتمام اور کاوش کے قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں، لیکن قدرتِ بیان ہے جو بے ساختگی میں بھی ابھری چلی آتی ہے اور کاوشِ فکر ہے جو آمد میں بھی آورد سے زیادہ بنتی اور سنورتی رہتی ہے۔

ظرافت ہے تو وہ اپنی بے داغ لطافت رکھتی ہے، واقعہ نگاری ہے تو اس کی نقش آرائی کا جواب نہیں۔ فکر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہے"۔

اس طرزِ تحریر کی ایک خصوصیت اور بھی ہے وہ یہ کہ کسی تحریر کے ترجمہ میں یہ طرز اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ ترجمہ میں مترجم مصنف کے خیالات کا پابند ہوتا ہے اور جہاں اظہارِ فکر و خیال کی آزادی نہ ہو یہ اسلوب اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اس مخصوص طرز میں لکھی ہوئی چیز کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ یہاں بھی فکر و خیال کی پابندی کے ساتھ اسلوب اور صحتِ ذوق و معیار کی پابندی لازم ہوتی ہے۔ اس قسم کی تحریر کا ترجمہ کیا جائے تو اس کا حُسن غارت اور دل کشی ختم ہو جاتی ہے۔ چونکہ "غبارِ خاطر" کے اکثر مکاتیب اسی اسلوب میں لکھے گئے تھے اس لیے مولانا نے اس کے ترجمہ کی اجازت نہیں دی۔ مولانا فرماتے ہیں:

"چند مکاتیب کے سوا یہ تمام مکاتیب ایک ایسے اسلوب میں لکھے گئے ہیں کہ ان کا کسی دوسری زبان میں صحتِ ذوق و معیار کے ساتھ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کیا جائے گا تو اصل کی ساری خصوصیات مِٹ جائیں گی"۔

جناب مالک رام نے غبارِ خاطر کی اہمیت کے بعض پہلوؤں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے:

"غبارِ خاطر کئی لحاظ سے بہت اہم کتاب ہے۔

مولانا مرحوم کے حالات، بالخصوص ابتدائی زمانے کے، اتنی شرح و بسط سے کسی اور جگہ نہیں ملتے، جتنے اس کتاب میں۔ ان کے خاندان، ان کی تعلیم اور اس کی تفصیلات، عادات، نفسیات کردار، میلان و عواطف، ان کے کردار کی تشکیل کے محرکات ـــــ ان سب باتوں پر جتنی تفصیل سے انھوں نے ان خطوں میں لکھا ہے، اور کہیں نہیں لکھا؛ اور ان کے سوانح نگار کے لیے اس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے بہتر اور موثق تر اور کوئی ماخذ نہیں۔

اس کتاب کی دوسری اہمیت اس کا اسلوبِ تحریر ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے، وہ بارہ تیرہ برس کی عمر ہی میں نظم و نثر لکھنے لگے تھے اور اسی زمانے میں ان کی تحریریں رسائل و جرائد میں چھپنے لگی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی تحریروں میں وہ پختگی نہیں تھی، ہو بھی نہیں سکتی تھی، جو مشق اور مرورِ زمانہ ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ اگر ہم اس پورے مجموعے پر تنقیدی نظر ڈالیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ زبان و بیان کے لحاظ سے اُن کے اُسلوبِ نگارش کا نقطۂ معراج غبارِ خاطر ہے۔ اس کی نثر ایسی نپی تلی ہے، اور یہاں الفاظ کا استعمال اس حد تک افراط و تفریط سے بَری ہے کہ اس سے زیادہ خیال میں نہیں آسکتا۔ اُن کی ابتدائی تحریروں میں ناہمواری تھی۔ مثلاً الہلال اور البلاغ کے دور میں اُن کے ہاں عربی اور فارسی کے ثقیل اور عسیر الفہم جملوں اور ترکیبوں کی بھرمار ہے بے شک، ان پرچوں کا خاص مقصد تھا اور ان کے مخاطب بھی تعلیم یافتہ لوگ بلکہ بہت حد تک طبقۂ علماء کے افراد تھے۔ ان اصحاب سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ نہ صرف ان تحریروں کو سمجھ سکیں گے، بلکہ ان سے لطف اندوز بھی ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مطالب اس سے آسان تر زبان میں بیان نہیں ہوسکتے تھے۔ پس ظاہر ہے کہ عوام تو درکنار، متوسط طبقہ بھی ان سے پورے طور پر مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس غبارِ خاطر کو دیکھیے، تو یہاں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ اس میں عربی فارسی کی مشکل ترکیبیں آٹے میں نمک کے برابر ہیں اس کی نثر ایسی شگفتہ اور دل نشین ہے کہ یہ نہ صرف ہر کسی کے لیے قریب الفہم ہے، بلکہ اس سے لطف لیا جاسکتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں موضوع سہل ہے بے شک، یہ توجیہ ایک حد تک درست ہے، لیکن بس ایک حد ہی تک۔ اسی مجموعے میں انھوں نے دو خطوں میں خدا کی ہستی سے تفصیلی گفتگو کی ہے (خط ۱۲ و ۱۳)۔ یہ موضوع آسان نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کا سب سے اہم اور مشکل اور پیچیدہ موضوع ہے ہی یہ۔ ابتدا سے دنیا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھر کے فلسفی اور عالم اور عاقل اس سے متعلق لکھتے آئے ہیں، اور تمام مذاہب کی علتِ غائی اور بنیاد بھی یہ مسئلہ ہے اگر اسی مسئلے پر انھوں نے اس سے تیس برس پہلے لکھا ہوتا تو اس زمانے میں ان کی جو افتاد تھی، اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا انداز اور اسلوب کیا ہوتا۔ لیکن یہاں انھوں نے جس طرح سے اس سے متعلق بحث کی ہے، اس سے جہاں ان کے طرزِ استدلال کی دل نشینی نمایاں ہے، وہیں اسلوبِ تحریر کی دلکشی بھی لفظ لفظ سے پھوٹی پڑتی ہے۔ ایک ایک لفظ احتیاط سے، کانٹے کی تول لکھا ہے —— کہیں تکرار نہیں ہے کہیں الجھاؤ نہیں ہے، نگاہ اور زبان کسی جگہ نہیں اٹکتے ہیں۔

اسی طرح ایک دوسرے خط (نمبر ۱۷) میں انانیت کا مسئلہ زیرِ بحث آگیا ہے یہ موضوع بھی آسان نہیں؛ اور ذرا سی بے احتیاطی سے یہ نفسیات کی بھول بھلیاں اور علمی اصطلاحات کا مجموعہ بن سکتا ہے۔ لیکن یہاں بھی انھوں نے نہایت احتیاط سے کام لیا ہے؛ بحث کو عام سطح پر رکھا ہے تاکہ پڑھنے والا اسے سمجھے اور لطف اندوز ہو۔ اس سے معلوم ہوگا کہ واقعی اب نہایت مشکل مسئلوں اور موضوعوں سے متعلق بھی وہ ایسے انداز میں گفتگو کر سکتے تھے کہ یہ نہ صرف علمی پہلو سے وقیع ہو، بلکہ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ ایسی دلکشی کا حامل ہو کہ ہماری تاریخِ ادب کا حصہ بن سکے۔

اس مجموعے کے بعض خطوط بادی النظر میں بہت معمولی باتوں سے متعلق ہیں۔ مثلاً حکایتِ زاغ و بلبل (خط ۱۸) یا چڑیا چڑے کی کہانی (خط ۱۹، ۲۰)۔ بظاہر یہ ایسے عنوان ہیں، جن سے متعلق خیال نہیں ہوتا کہ کچھ زیادہ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد کی جولانیِ قلم کا یہ کرشمہ ہے کہ ان پر ۲۸ صفحے قلم بند کر دیے ہیں۔ اُن کی دقتِ نگاہ، جزئیات کا احاطہ، غیر عادی اور غیر معمولی چیزوں سے دلچسپی اور ان کی تفصیلات کا علم —— غرض کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ اور پھر یہ سب کچھ ایسی سہلِ ممتنع زبان میں بیان ہوا ہے کہ اس کا جواب نہیں۔ یا مثلاً خط (۱۵) لیجیے جس میں اپنے چائے کے شوق کا ذکر کیا ہے۔ یہاں پھر ان کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باریک بینی اور مسئلے کے مالہ' وما علیہ کا تفصیلی ذکر نمایاں ہے، چائے کی پتی، اس کی کاشت کی تاریخ، اس کے دوسرے لوازمات ـــــ ان سب باتوں کا ذکر ایسے چٹخارے لے لے کر کیا ہے کہ خیال ہوتا ہے، یہ چائے نہیں بلکہ شراب طہور یا آبِ کوثر و تسنیم کا ذکر ہو رہا ہے۔ پینے کو چائے سب ہی پیتے ہیں، لیکن مولانا آزاد کا یہ خط پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ہم نے آج تک چائے کبھی پی ہی نہیں، بلکہ کوئی نقلی چیز ہمیں دے دی گئی تھی، جسے ہم لاعلمی میں اصلی سمجھتے رہے۔ یہ ان کے حسنِ انشا اور قوتِ بیان کا معجزہ ہے۔

پھر ان خطوں کا ایک اور مابہ الامتیاز ان کا ہلکا سا مزاحی رنگ ہے جو جا بجا الفاظ کا پردہ چاک کر کے جھانکنے لگتا ہے۔ انھوں نے الہلال میں بھی بعض مقالے ایسے لکھے تھے، جن میں مزاح کا رنگ چوکھا تھا، وہاں موضوع سیاسی تھا، یہاں موضوعِ سخن سیاسی چھوڑ، ادبی بھی نہیں؛ لیکن اس میں بھی وہ وہ گل افشانیاں کی ہیں کہ صفحۂ کاغذ کو کشتِ زعفران بنا کے رکھ دیا ہے۔ مثلاً احمد نگر کے قلعے میں باورچی رکھنے کا قصہ پڑھیے (خط ۸) یا ڈاڑھی سید محمود کا گوریاؤں کی ضیافت کا سامان کرنا (خط ۱۸) یا چڑیا چڑے کی کہانی (خط ۲۰) میں قلندر اور مُلّا کا حال ـــــ ان سب مقامات پر بین السطور مزاح کی کارفرمائیوں نے پوری تحریر کو اتنا شگفتہ اور دلکش بنا دیا ہے کہ یہی جی چاہتا ہے: وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

اسی سے ایک اور بات کا خیال کیجیے۔ یہ ان کی مختلف جانوروں کی شکل و صورت اور عادات و اطوار کی جزئیات کی تصویر کشی ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے حلقۂ احباب میں سے کم و بیش روز کے ملنے والوں سے متعلق بھی اتنی تفصیل سے جانتے اور اپنی معلومات اور تاثرات کو قلم بند کر سکتے ہیں! یہ مولانا آزاد کا کمال ہے کہ انھوں نے ان پرندوں کو حیاتِ جاوداں بخش دی ہے۔ موتی اور قلندر، صوفی اور مُلّا جیتے جاگتے کردار ہیں، اور ان کی شخصیت عام گوریاؤں اور چڑیوں کی بھیڑ سے کئی گنا نمایاں ہو گئی ہے۔

اور یہ بات صرف پرندوں ہی سے متعلق نہیں ہے۔ یہ تصویر کشی اور مواقع

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر بھی ملتی ہے ، مثلاً باغ میں پھول لگاتے ہیں ۔ ان زندانیوں نے دن رات کی محنت سے چمن تیار کیا ، کچھ دن بعد اس میں رنگا رنگ کے پھول اپنی بہار دکھانے لگے ۔ یہ ہم میں سے ہر ایک کا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے ۔ لیکن مولانا مرحوم کے لیے یہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ چیز ہے وہ ان پھولوں کی ابتدا اور نشوو نما ، ان کی خاصیتوں ، ان کی شکل و صورت ، حسن و جمال ، دل فریبی اور دلکشی وغیرہ سے متعلق ایسی تفصیل سے لکھتے ہیں کہ چشم تصور کے سامنے ایک ہرا بھرا باغ لہلہانے لگتا ہے ۔

اور پھر ان سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ معمولی سفر کا بیان ہو کہ پرندوں کا ، کسی جنگ کا ذکر ہو کہ علمِ موسیقی کا ، وہ اسے پندو موعظت اور دائمی صداقتوں اور ابدی اقدار سے الگ کر کے دیکھ نہیں سکتے ، وہ اسے فوراً کسی کلیے کی شکل دے دیتے اور فطرت کے عالمگیر قوانین کے بالمقابل دیکھنے لگتے ہیں ۔ مثلاً جب ان لوگوں کو بمبئی سے گرفتار کر کے احمد نگر لے گئے ہیں ، تو یہ وہاں کے ریلوے اسٹیشن سے قلعے تک موٹر کاروں میں گئے تھے ۔ لکھتے ہیں :" اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے ، راہ میں کوئی موڑ نہیں میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے ؛ جب قدم اٹھا دیا ، تو پھر کوئی موڑ نہیں " (ص ۲۷ - ۲۸) اسی سفر کا بیان ہو رہا ہے سڑک پر موٹر کار پوری تیزی کے ساتھ مسافت طے کر رہی ہے ۔ قلعہ جو پہلے فاصلے پر دکھائی دے رہا تھا ۔ اب قریب نظر آنے لگا ، چشم زدن میں یہ چند قدم کا فاصلہ بھی پورا ہو گیا اور موٹر کاریں صدر پھاٹک کے اندر داخل ہو گئیں فرماتے ہیں :" غور کیجیے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے ۔ خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا " (ص ۲۸) ۔ بالآخر زندانیوں کا یہ قافلہ قلعے کے اندر داخل ہو گیا اور پھاٹک بند کر دیا گیا ۔ یہ روزمرّہ کا معمولی وقوعہ ہے ، اور کوئی اس پر دھیان بھی نہیں دیتا ۔ لیکن پھاٹک کے بند ہونے کی آواز سنتے ہی ان کا ذہن کہیں اور پہنچ گیا اور یہ سوچنے لگے :" اس کارخانہ ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں تاکہ بند ہوں ؛ اور کتنے ہی بند

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیے جاتے ہیں، تاکہ کھلیں۔" (ص ۱۹)

جب پچھلی صدی کے شروع میں روسیوں نے بخارا پر حملہ کیا، تو امیر بخارا نے حکم دیا تھا کہ مدرسوں اور مسجدوں میں ختمِ خواجگان کا ورد کیا جائے۔ اُدھر روسیوں نے قلعہ شکن توپوں سے گولے برسانا شروع کر دیے اور آخر کار بخارا فتح ہو گیا۔ لکھتے ہیں" بالآخر وہی نتیجہ نکلا، جو ایک ایسے مقابلے کا نکلنا تھا، جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو، دوسری طرف ختمِ خواجگان۔ دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں، مگر انہی کو پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترکِ عمل کا حیلہ بن جاتی ہیں۔" (ص ۱۴۹)

چڑیا کا بچہ جو ابھی گھونسلے سے نکلا ہے، ہنوز اُڑنا نہیں جانتا اور ڈرتا ہے۔ ماں کی متواتر اُکساہٹ کے باوجود اُسے اُڑنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک دن اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اُڑتا اور فضائے ناپیدا کنار میں غائب ہو جاتا ہے۔ پہلی ہچکچاہٹ اور بے بسی کے مقابلے میں اُس کی یہ چستی اور آسمان پیمائی حیرت ناک ہے۔ اسی طرح کا ایک منظر دیکھ کر لکھتے ہیں "جونہی اس کی سوئی ہوئی خود شناسی جاگ اٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ میں اُڑنے والا پرندہ ہوں، اچانک قالب بے جان کی ہر چیز از سرِ نو جاندار بن گئی۔" پھر اسی سے یہ حکیمانہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں "بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پروبالی سے بلند پروازی، اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن کے اندر ہو گیا۔ غور کیجیے تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانے کا خلاصہ ہے۔" (ص ۲۳۲)

غرض پوری کتاب میں اس طرح کے جواہر ریزے منتشر ہیں، اور یہ اُن کی عام روش ہے بات دراصل یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر مفکر ہیں، جیسا کہ انھوں نے خود کسی جگہ لکھا ہے، جو کچھ اسلاف چھوڑ گئے تھے، وہ انھوں نے ورثے میں پایا اور اُس کے حصول اور محفوظ رکھنے میں انھوں نے کوتاہی نہیں کی، اور جدید کی تلاش اور جستجو کے لیے انھوں نے اپنی راہ خود بنالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کی ذات علومِ قدیمہ و جدیدہ کا سنگم بن گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ اُن پر غور و فکر کے دروازے کھل جاتے اور وہ ان راہوں سے ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتے؛ اور یہی ہوا۔ یہ اقوال جو گویا ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے اور انسانی تاریخ اور تجربے کا نچوڑ ہیں، اسی قرانِ السّعدین کا نتیجہ ہیں۔[1]

کاروانِ خیال:

"کاروانِ خیال" کی عام شہرت مولانا آزادؒ کے مکاتیب کے مجموعے کی حیثیت سے ہے لیکن واقعتاً یہ مختصر رسالہ مولانا آزادؒ اور مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم دونوں کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ پہلی بار ۱۹۴۶ء کے آخر میں شائع ہوا اور اس وقت سے اب تک ہندوستان و پاکستان سے اِس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے مرتب اور مقدمہ نگار مولوی محمد عبدالشاہد خان شروانی ہیں۔

"کاروانِ خیال" میں سترہ[۱۷] مکاتیب حضرت مولانا آزادؒ کے اور دس مکاتیب حضرت مولانا شروانیؒ کے ہیں۔ یہ مجموعہ اگرچہ "غبارِ خاطر" کے بعد شائع ہوا لیکن اس کے بعض مکاتیب "غبارِ خاطر" سے پہلے کے ہیں۔ "کاروانِ خیال" میں مولانا آزادؒ کے نو مکاتیب از ستمبر ۱۹۴۰ء تا جون ۱۹۴۲ء کے ہیں اور نو مکاتیب قلعۂ احمد نگر کی رہائی کے بعد (از جون ۱۹۴۵ء تا نومبر ۱۹۴۶ء) کے ہیں۔

کاروانِ خیال کے مکاتیب، غبارِ خاطر کے مکاتیب سے کسی اعتبار سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ان خطوط سے بھی نہ صرف مولانا آزادؒ اور مولانا شروانی کے مخلصانہ تعلقات کا پتا چلتا ہے بلکہ بہت سے تاریخی واقعات و تذکار سے پردہ اُٹھ جاتا ہے۔ ان خطوط کی ایک یہ بڑی خصوصیت ہے اور اس وجہ سے غبارِ خاطر کے مکاتیب پر فوقیت حاصل ہے کہ ان مکاتیب میں مکتوب الیہ کی شخصیت نہ آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے نہ ذہن سے غائب۔ "کاروانِ خیال" کے ایک خط مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۰ء میں مولاناؒ نے اپنے سفرِ عراق کی روئیداد اور وہاں کی علمی و ادبی شخصیتوں اور صحبتوں کا پُر لطف انداز میں تذکرہ چھیڑا ہے۔ اسی خط

---

[1] غبارِ خاطر ساہتیہ اکادمی ایڈیشن، ص ۱۷-۱۱

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں دجلہ کی لہروں پر ایک مجلس طرب کا ذکر بھی آگیا ہے۔ دنوں تک یہ بات موضوع بنی رہی کہ آیا یہ واقعہ ہے یا محض افسانہ سرائی یہ غلط فہمی حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نوراللہ مرقدہٗ کے بعض جملوں سے پیدا ہوئی تھی۔ آزاد کی کہانی بروایتِ ملیح آبادی میں سنہ کی غلطی نے اس واقعے کو اور بھی مشتبہ بنا دیا اگرچہ مولاناؒ کی آخری کتاب "انڈیا ونس فریڈم" سے بھی اس شبہ کا ازالہ ہو گیا بالکلیہ یہ غلط فہمی فرانسیسی مستشرق لوئی مسینو[1] کے ایک مضمون سے جو حضرت مولانا آزادؒ کی پہلی برسی کے موقع پر ایک کتاب میں شائع ہوا تھا دُور ہوئی جس زمانہ میں مولانا آزادؒ نے عراق کا سفر کیا تھا لوئی مسینو بغداد میں حاجی علی آلوسی کے مدرسہ میں زیر تعلیم تھے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا:

"آج سے ٹھیک پچاس برس پہلے کی بات ہے کہ ۱۹۰۷ء میں پہلے پہل میری ملاقات بغداد میں ہوئی تھی۔ رفیق شفیق اُستاد حاجی علی آلوسی کے حضور دونوں نے زانوئے تلمذتہ کیا تھا۔ اور مسجد مرجان میں ہم پہلو بہ پہلو تعلیم پاتے تھے"[2]

فرانسیسی مستشرق کی اس شہادت نے تمام شبہات کو دُور کر دیا اور اس مسئلہ میں اب کوئی اختلاف باقی نہیں رہا۔

"کاروانِ خیال" کے پہلے مکتوب یعنی ۱۹۴۰ء میں مولانا آزادؒ نے مکتوب الیہ یعنی حضرت نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی سے از ۱۹۰۵ء تا ۱۹۲۰ء کی مختلف ملاقاتوں اور صحبتوں کی یاد تازہ کی ہے یہ مقصود صرف یہ تھا کہ کسی ہم نفس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا، ملاقات میسر نہ تھی دل کی آرزومندیاں صفحوں پر بکھیر دیں۔ مولاناؒ ہی کے الفاظ سے محظوظ ہو لیں تو آگے چلیں۔ غور فرمایئے ایک ایک لفظ میں کیسا خلوص اور کتنا پیار بھرا ہے۔

"یہ ساری درازنفسی اس لیے ہے کہ کسی ہم نفس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔ آپ یاد آ گئے، ملاقات میسّر نہیں ہے تو دل کی آرزمندیوں کو صفحوں پر بکھیر رہا ہوں ؎

در ہیچ نسخہ معنیِ لفظِ اُمید نیست — فرہنگ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم

---

[1] فروری ۱۹۶۲ء میں انتقال ہوا۔ [2] مولانا ابوالکلام آزادؒ مرتبہ پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"اس وقت سوچ رہا تھا کہ آپ سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟ غالباً ۱۹۲۰ء میں حکیم صاحب[1] مرحوم کے یہاں دہلی ہیں۔ میں نظر بندی سے چھوٹا تھا، آپ حیدر آباد سے آئے تھے، دونوں جہتوں میں بعد المشرقین تھا۔ مگر طبیعت کی ہم ذوقی ایک صحبت میں جمع کر دیتی تھی ؎

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود

ز زُہد، ہمچو توئی، یا بہ فسق ہمچو منی"

یہ خطوط ادبی، تاریخی اور صدیقین کی محبت اور اخلاص کی ایک ایسی بے مثال کہانی ہے، جو شاید اب کبھی دنیا میں نہ دہرائی جائے گی۔

اسی طرح "کاروانِ خیال" کے دوسرے مکاتیب صرف علمی و ادبی حیثیت سے اور مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی ہم ذوقی، قلبی تعلق اور اخلاص و محبت ہی کی وجہ سے اہمیت نہیں رکھتے بلکہ ان مکاتیب سے بھی مولانا آزادؒ کے اخلاق، عادات، افکار، عقائد، اذواق رجحانات وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز تاریخ و تذکار اور ادب و سیاست پر جو ضمنی ...... اشارات ملتے ہیں وہ مولانا آزادؒ اور ان کے افکار کا مطالعہ کرنے والے طالب علموں کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

ابتدا میں مولوی محمد عبد الشاہد خان صاحب شروانی کے قلم سے ایک مفید اور پُر زور مقدمہ ہے جو اپنی ایک تاریخی اور ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ مقدمے کو انھوں نے آزادؒ شروانی تعلقات اور صرف کاروانِ خیال کے خطوط کی علمی، ادبی اور تاریخی حیثیت و اہمیت کے اظہار و بیان تک محدود نہیں رکھا، بلکہ انھوں نے مقدمے میں پورے ایک دَور کے علم و ادب، اخلاق و مروّت اور قدیم و یادگار وضع داریوں کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ اس مقدمے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا جس طرح اپنے "صدیق مکرم" کے لیے سراپا اخلاص و محبت تھے اسی طرح اپنے "عزیزی" (مقدمہ نگار) کے لیے بھی سراپا لطف و کرم اور مجسمہ رحمت و شفقت تھے۔ اس طرح مولانا آزادؒ کے اخلاق و کردار کا ایک خاص گوشہ علم کی روشنی میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ مقدمہ نگار کے اپنے بارے میں بھی بعض تاریخی واقعات

---

[1] حکیم محمد اجمل خان مرحوم مراد ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بلا قصد وارادہ قلم سے نکل کر تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو جاتے ہیں۔

چند سطریں مقدمہ نگار کے قلم کی ملاحظہ ہوں :

"ستمبر ۱۹۴۰ء کے دوسرے ہفتے کا ذکر ہے، میں حسب معمول، نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی، دامت معالیہ کی خدمت میں حبیب گنج حاضر ہوا تو موصوف نے قدیم شفقت بزرگانہ کے تحت کلکتہ سے آیا ہوا ایک خط دکھایا ...... خط دیکھا تو کیا عرض کروں، دل پر کیا گزری ایک بار نہیں بار بار پڑھا، ہر بار نیا کیف و سرور حاصل ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اس محبت نامہ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء میں الفاظ نہ تھے بلکہ موتی تھے جو سلک سطور میں پرو دیئے گئے تھے دل کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو صفحہ کاغذ پر تصویر صحبت گزشتہ سے متاثر ہو کر اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی تھی

شاید ان ذروں میں تصویریں کھنچی ہوں آپ کی

یہ سمجھ کر منتشر اجزائے دل یکجا کیے !!"

اسی مقدمہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

"مولاناؒ کے سیکڑوں مضامین و خطوط نظر سے گزرے میری علمی تہی مایگی اور ادبی بے بضاعتی آج تک یہ فیصلہ نہ کرسکی کہ کون سا مضمون یا خط فصاحت و بلاغت، روانی و سلاست میں دوسروں پر فوقیت رکھتا ہے شادی و مسرت کا موقع ہو یا حزن و الم کا، عیش و عشرت کے سامان مہیا ہوں یا رنج و غم کے، تبریک و تہنیت کا محل ہو یا تعزیت و عیادت کا، ہر جگہ اسپ قلم یکساں دوڑتا نظر آئے گا۔ گویا نظروں کے سامنے وسیع میدانِ ادب ہے مرکبِ خامہ کو جدھر مہمیز لگا دی ہوا ہو گیا۔"

نقش آزاد :

مولانا آزادؒ کے مکاتیب کا تیسرا مجموعہ "نقش آزاد" کے عنوان سے مولانا غلام رسول مہر نے مرتب کیا ہے اور کتاب منزل، لاہور نے اواخر ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں شائع ہو چکا ہے کتاب کے تین حصے ۱۹۵ خطوط، ایک پیام، ایک اپیل اور مولانا مہر کی تصنیف "غالب" پر مولانا کی بعض نادر تحریرات پر مشتمل ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلے حصے میں ۱۸۱ مکاتیب ہیں (مکتوب نمبر ۱۸۱ کتاب کے آخر میں ہے) ان میں سے ایک مکتوب (نمبر ۱۰۵) مولانا عبدالمجید سالک مرحوم اور بقیہ تمام مکاتیب مولانا مہر صاحب مرحوم کے نام ہیں۔ ان میں سے ۱۲۳ مکاتیب حضرت مولانا کے قلم سے ہیں دو تاروں کا ترجمہ ہے، ۵۳ خطوط مولانا کے ڈپٹی پرائیویٹ سکریٹری محمد اجمل خان کے قلم سے اور تین خط مولانا کے سکریٹری این۔ ایم مسعود صاحب کی جانب سے مولانا کی ہدایت کے مطابق لکھے ہوئے ہیں اس حصہ کا پہلا مکتوب ۱۹۱۴ء اور آخری خط مئی ۱۹۵۷ء کا ہے۔

یہ مجموعہ نہ صرف علمی، ادبی اور تاریخی حیثیت ہی سے اہمیت رکھتا ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ یہ مولانا مہر مرحوم کے تینتالیس سالہ عزیزانہ و مخلصانہ تعلقات کی ایک تاریخی دستاویز ہے۔ ان خطوط سے صرف مکتوب نگار کے علم و فضل اور اخلاق و کردار ہی پر روشنی نہیں پڑتی بلکہ مکتوب الیہ کے مزاج و طبیعت کے بعض پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں۔ ابتدا میں مرتب نے چند صفحات میں مجموعہ کا تعارف کرایا ہے، حصہ اول یعنی اپنے نام مکاتیب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

"میں بی، اے کے آخری سال میں تھا، جب علم و ادب کے یہ نادر جواہر پارے میرے دامنِ عقیدت میں فراہم ہونے لگے تھے اور لطف و نوازش کا ابرِ گوہر بار اس وقت تک برابر موتی برساتا رہا جب تک اس میں اور مجھ میں موت کی دیوار حائل نہ ہو گئی چوالیس سال کی مدت ایک عمر ہے، جو نوادر کے حفظ و نگہبانی میں بسر ہوئی۔ حق یہ ہے کہ حاصلاتِ حیات میں ان سے گراں بہا تر متاع اور کوئی نظر نہیں آتی ......

اگرچہ یہ تعداد میں زیادہ نہیں اور اس غرض سے نہ لکھے گئے تھے کہ کبھی اشاعت پذیر ہوں گے تاہم ان میں مولانا رحمہ اللہ کے کمالِ علم و فضل اور یگانگیِ اسلوبِ تحریر کے بیسیوں نادر مرقعے دیکھے جا سکتے ہیں، نیز مرحوم کے سوانحِ حیات اور فضائلِ اخلاق و عادات کا بھی خاصا قیمتی سرمایہ ان میں موجود ہے ۔

تحدیثِ نعمت کے طور پر یہ عرض کرنا غالباً غیر مناسب نہ سمجھا جائے گا کہ اتنے مکاتیب بھی بہت کم اصحاب کے پاس ہوں گے، نیز ۱۹۱۴ء سے مولانا کی حیاتِ مستعار کے آخری دور تک اس سلسلۃ الذہب کے امتداد کی مثال بھی شاید

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہی مل سکے۔"

"نقشِ آزاد" کا دوسرا حصہ ان تحریرات پر مشتمل ہے جو مولانا آزادؒ نے مہر صاحب کی کتاب "غالب" پر تحریر فرمائی تھیں۔ مجموعہ کا یہ حصہ بھی علمی، ادبی اور تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس حصہ کی تمام تحریرات غالبؒ ہی سے متعلق ہوں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حصہ میں نہ صرف غالبؒ کے بارے میں بعض نئی اور دلچسپ معلومات ہیں بلکہ اس دور کے علمی، ادبی اور مجلسی ماحول اور اس زمانے کی کئی شخصیتوں پر کچھ نیا مواد سامنے آجاتا ہے۔ بعض واقعات کی اصلیت اور روایات کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا مرحوم کے والد مولانا خیر الدین اور ان کے (خیر الدین کے) نانا مولانا منور الدین کے بارے میں بعض تاریخی واقعات اور حالات کی کچھ تفصیل ملتی ہے۔ تاریخی تذکار و وقائع کے علاوہ تحریر و کتابت اور زبان و بیان و املا اور الفاظ و تراکیب وغیرہ کے بارے میں بہت سے مفید نکتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس حصے کے مطالعے سے مولانا مرحوم کے علم و فضل اور ان کی ژرف نگاہی کا نقش دل پر اور گہرا ہو جاتا ہے۔

اس حصے کی تحریرات کے بارے میں مولانا مہر صاحب فرماتے ہیں:

"میری کتاب "غالب" ان کے مطالعے سے گزری تو فرمایا کہ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مفصل سوانح عمری لکھی جا رہی ہے تو بہت سی ضروری باتیں لکھ بھیجتا" پھر میں نے ان کے ارشاد کے مطابق کتاب کا ایک نسخہ بیچ میں سادہ اوراق لگوا کر بھیج دیا جو کم و بیش تین سال تک ان کے پاس رہا، جب کبھی فرصت ملتی، وہ سادہ اوراق پر کچھ نہ کچھ تحریر فرما دیتے۔ اس طرح تین سال میں بہت کچھ لکھا گیا۔ جو سب کا سب غالبؒ کے متعلق نہ تھا۔ عادتِ شریف یہ تھی کہ کوئی مبحث شروع فرماتے تو ضمنی گفتگوؤں کے سلسلے میں مختلف وادیوں کے اندر پھر نکلتے اور ہر نئی تحریر نئی معلومات کا ایک دل آویز مرقع ہوتی۔ میں نے ان تحریرات کو مناسب ترتیب کے ساتھ پیشِ نظر مجموعے کا حصہ دوم بنا دیا ہے۔"

"نقشِ آزاد" کا حصہ سوم ۱۴ خطوط، ایک پیام اور ایک اپیل پر مشتمل ...... ہے اس میں سے آٹھ خطوط خواجہ حسن نظامی مرحوم کے نام ہیں۔ ایک خط ملا واحدی صاحب کے نام، ایک خط شفاعت اللہ مرحوم کے نام اور چار خط علامہ نیاز فتح پوری مرحوم کے نام ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خواجہ حسن نظامی کے نام مکاتیب از دسمبر ۱۹۰۶ء تا مئی ۱۹۱۳ء کے ہیں اور اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ الہلال سے قبل کے مکاتیب ابھی تک بہت تھوڑی تعداد میں دستیاب ہوتے ہیں۔ یہ مکاتیب خواجہ حسن نظامیؒ کی کتاب "اتالیق خطوط نویسی" کے حوالہ سے نقل کیے گئے ہیں۔ چونکہ اتالیق خطوط نویسی نہ صرف کم یاب بلکہ نایاب ہے اس لیے ان خطوط کا اِس مجموعہ میں شامل کر لینا کسی طرح بھی اہمیت و افادیت سے خالی نہیں۔ مُلا واحدی اور نیاز فتح پوری کے نام مکاتیب بھی اسی مجموعہ سے ماخوذ ہیں۔ نیاز صاحب کے نام مکاتیب ۱۹۱۴ء اور اس کے بعد لیکن ۱۹۱۶ء سے قبل کے ہیں۔ شفاعت اللہ صاحب کے نام مکتوب جولائی ۱۹۲۴ء کا ہے۔ "مولانا ابوالکلام آزاد کا پیام تمام عزیزانِ پنجاب کے نام" ۱۹۲۱ء کا ہے اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے ایک تحریر اخبار "زمیندار" کے لیے زرِ ضمانت کی فراہمی میں حصہ لینے کی "اپیل" ہے۔ لیکن یہ اپیل صرف مولانا کی جانب ہی سے نہیں بلکہ ڈاکٹر سید محمود اور مولانا محمد علی جوہرؔ کے بھی اس پر دستخط ہیں۔

سولہ ۱۶ صفحات پر مشتمل کتاب کا یہ آخری حصہ ہے۔ اگرچہ ضخامت کے اعتبار سے یہ چند اوراق ہیں لیکن قیمت کے لحاظ سے یہ حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس حصے کی ترتیب کے بارے میں مولانا مہرؔ فرماتے ہیں۔

> "حصہ سوم" ان تحریرات پر مشتمل ہے جو میرے نام نہ تھیں تاہم کسی نہ کسی وجہ سے میرے پاس پہنچ گئیں اور محفوظ رہیں۔ انھیں میں وہ چند مکاتیب بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ۱۹۱۶ء میں ایک مجموعے کے ساتھ چھاپے تھے۔ ان میں سے بعض مکاتیب "الہلال" سے پیشتر کے ہیں۔ اور اس دور کے مکاتیب بہت کم یاب ہیں اندیشہ تھا کہ وہ کہیں ضائع نہ ہو جائیں۔"

"نقشِ آزاد" کو ایک اعتبار سے میرے نزدیک "غبارِ خاطر" اور "کاروانِ خیال" پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ ناظرین جانتے ہیں کہ غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال میں مولانا نے علم و ادب، فلسفہ و مذہب، فنونِ لطیفہ، اپنے اشغال و اعمال، ذوق و مزاج، تعلیم و تربیت اور قید و بند کی زندگی اور اس کے معمولات کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا اور اس کے لیے جو اسلوبِ تحریر اختیار کیا اس نے غبارِ خاطر کو ادبِ عالیہ میں جگہ دی ہے۔ لیکن چونکہ وہ تمام خطوط

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک ایسے "صدیق" کو لکھے گئے تھے جسے سیاست اور جد وجہد آزادی کی تحریکات سے نہ حرف کوئی سروکار نہ تھا بلکہ اس کی راہیں مخالف سمت میں جا رہی تھیں دونوں کے سیاسی عقائد اور سیاسی اعمال و اشغال میں بعد المشرقین تھا صرف علمی و ادبی ہم ذوقی دونوں کو ایک صحبت میں جمع کر دیتی تھی۔ اس لیے جب ان کے لیے مولانا اپنی دکانِ سخن سے کچھ نکالتے تھے تو پہلے احتیاط کی چھلنی میں چھان کر یہ اطمینان کر لیتے تھے کہ اس میں سیاست کی ملاوٹ تو نہیں۔ اس لیے غبار خاطر اور کاروانِ خیال میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی زندگی اور ان کی ہمہ جہت شخصیت کا صرف ایک پہلو ہی نمایاں ہو سکا۔ اگرچہ غبار خاطر مولاناؒ کے ابتدائی حالات، تعلیم و تربیت، خاندان و ماحول نیز ان کے علمی و ادبی رجحان اور مذہبی افکار کے بارے میں ایک بنیادی کتاب اور بہترین ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن مولاناؒ کے حالات و سوانح حیات کے بارے میں دوسرے مجموعوں کے خطوط اور دیگر کتب و رسائل میں بھی بہت مواد مل جاتا ہے۔ اس لیے صرف اس اعتبار سے غبار خاطر کو بہت بڑی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

اس کے برعکس "نقشِ آزاد" کے مکاتیب ایک ایسے عزیز کو لکھے گئے جو خود مختلف حیثیتیں رکھتا تھا، اس کے لیے ضروری نہ تھا کہ احتیاط کی چھلنی میں چھان کر کچھ نکالا جائے، بایں وجہ "نقشِ آزاد" کے مکاتیب میں مولانا مرحوم کی ایک بالکل مختلف شکل نظر آتی ہے۔ "غبارِ خاطر" اور کاروانِ خیال، ان کے فکری رجحان اور ذہنی پس منظر کا پتا دیتے ہیں۔ لیکن "نقشِ آزاد" میں مولانا آزادؒ عالمِ دین، مفسرِ قرآن، سیاست دان اور ایک عملی انسان نظر آتے ہیں۔ غبار خاطر میں وہ ایک فارغ البال اور تنہائی پسند انسان کے روپ میں نظر آتے ہیں لیکن "نقشِ آزاد" میں مولانا کی تصویر ہنگاموں میں گھری ہوئی اور مصروفِ کار نظر آتی ہے۔ پھر اس میں وہ کہیں ایک مربی اور بزرگ کی شان میں جلوہ گر ہوتے ہیں تو کہیں عزیز و شفیق دوست کی حیثیت سے۔ کہیں وہ ہدایات اور مشورے دیتے ہیں۔ کہیں بگڑتے اور خفا ہوتے ہیں۔ تو کہیں مسائل کا تجزیہ کرتے اور اس کے نتائج سے خبردار کرتے ہیں۔ "نقشِ آزاد" کے مطالعے سے ہم صحافت، سیاست، ادب، تاریخ، فلسفہ، تعلیم، مذہب کے بارے میں ان کے افکارِ عالیہ کا پتا پاتے ہیں تو ساتھ ہی ان کے اشغال و اعمال، اخلاق و کردار، دیانت و امانت اور ان کے گرد و پیش کے متعلق ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو "غبار خاطر" میں نہیں ملتیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر یہ نہیں کہ اس میں ان کے ذہنی پس منظر، افتادِ طبع، ذوق و رجحان کا پتا نہ چلتا ہو۔ یہ فرق صرف مخاطب اور مکتوب الیہ کی تبدیلی ہی کا نتیجہ نہیں بلکہ اِس وجہ سے بھی ہے کہ غبارِ خاطر، کے مکاتیب قلعہ احمد نگر کے زندان کی تنہائیوں میں لکھے گئے تھے جب کہ "نقشِ آزاد" کے مکاتیب سیاست کے ہنگامۂ کارزار میں لکھے گئے۔ ناممکن تھا کہ ان پر گرد و پیش کی پرچھائیاں نہ پڑتیں۔

"نقشِ آزاد" میں کچھ خطوط ترجمان القرآن اور "غبار خاطر" کی اشاعت اور فروخت کے معاملات کی نسبت ہیں۔ اس قسم کے خطوط کو اگرچہ علمی و ادبی خطوط میں شمار نہیں کیا جاتا۔ لیکن کسی شخصیت کے مطالعے کے سلسلے میں اس قسم کے خطوط بہت اہمیت رکھتے ہیں معاملات اور لین دین انسانی زندگی کا ایک ایسا پہلو ہے جہاں اس کی شخصیت کا تمام ملمع اُتر جاتا ہے۔ اس میدان میں جب کوئی آتا ہے تو وہ اپنے حقیقی اخلاق و کردار ہی میں نظر آتا ہے۔ یہاں ممکن ہی نہیں کہ چہرے پر کوئی نقاب پڑا رہ جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولاناؒ کے کردار کا یہ پہلو پوری طرح روشنی میں آجاتا ہے اور ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ کاروبار و تجارت سے مولانا کے ذہن و دماغ کو ادنیٰ مناسبت بھی نہیں وہ کاروباری داؤ پیچ سے قطعی ناواقف ہیں۔ وہ کسی سے معاملہ کرتے ہوتے اور کاروباری گفتگو میں اپنے دل کو پوری طرح کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کا دل بچّے کی طرح معصوم اور ذہن ہر قسم کے تحفظات سے خالی ہوتا ہے۔ معاملہ کرتے ہوتے اگر وہ اپنے مفاد میں کسی بات کو چُھپانا بھی چاہیں تو چُھپا نہیں سکتے۔ وہ معاملات میں انتہائی فراخ دل واقع ہوتے ہیں۔ وہ فریق ثانی پر بہت جلد اعتماد کرلیتے ہیں اور اِس وجہ سے بعض اوقات انھوں نے نقصان بھی اُٹھایا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو اس قسم کے خطوط ہیں ان میں اور کوئی بات اس کے علاوہ نہیں کہی گئی ہے واقعہ یہ ہے کہ ان میں بھی دیگر مکاتیب کی طرح بہت سے علمی، ادبی سیاسی اور تاریخی واقعات و تذکار آگئے ہیں۔ نیز ان خطوط میں ابوالکلامؒ کی انانیت ان کے ادب کی شانِ دلربائی، اسلوبِ نگارش کی ندرت کاری اور شخصیت کی چھاپ کا حُسن پوری طرح جلوہ گر ہے۔

تبرکاتِ آزاد:

"تبرکاتِ آزاد" مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اٹھانوے[۹۸] مکاتیب اور سات مقالات کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب بھی مولانا غلام رسول مہر ہیں۔ اور کتاب منزل، لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ مکاتیب و مقالات ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے شامل مکاتیب اور مقالات کو ان کی علمی، ادبی تعلیمی اہمیت کے لحاظ سے واقعی نوادر تبرکات کی حیثیت حاصل ہے۔

کتاب کے شروع میں تقریباً چھ صفحے کا ایک دیباچہ ہے جس میں مکاتیب و مقالات کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان کی اہمیت و افادیت واضح کی گئی ہے۔ کتاب کے بارے میں مولانا مہر فرماتے ہیں:

" یہ کتاب جو " تبرکاتِ آزاد " کے نام سے خوانندگانِ کرام کی خدمت میں پیش ہو رہی ہے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کے ان رشحات قلم پر مشتمل ہے جنہیں تبرکات تسلیم کرنے میں شاید کسی کو بھی تامل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ مباحث کی اہمیت اور مطالب کی گراں مائگی کے باوجود علم و ادب اور دین و سیاست کے یہ نادر جواہر ریزے مختلف گوشوں میں بکھرے پڑے تھے۔ اور ان پر گردِ فراموشی کی اتنی تہیں جم چکی تھیں کہ غالباً کسی کو ان کے وجود کا احساس تک نہ رہا تھا۔"

مکاتیب کی حیثیت و اہمیت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

" کتاب کے آغاز میں مکاتیب کے چار مجموعے ہیں جن کی کل تعداد اٹھانوے [۹۸] ہے۔ ان میں سے متعدد اتنے طویل اور مفصل ہیں کہ انھیں مستقل رسالے سمجھنا چاہیے، جو نہایت نفیس، دقیق اور مفید مباحث کے حامل ہیں۔ ایسی چیزیں دوسری جگہ شاید ہی مل سکیں۔ ان میں دینی اور علمی مسائل بھی بیان ہوتے ہیں، تعلیمی اور اصلاحی مسائل کے متعلق بھی خاصے اہم نکتے ارشاد فرمائے گئے ہیں، جن کی کوئی مثال نہ صرف ہمارے عہد میں بلکہ پیشتر کے اکثر عہدوں میں بھی نہیں ملتی۔ جو کچھ قلم سے نکلا سراسر مجتہدانہ اور بصیرت و موعظت کا ایک نادیدہ مرقع ہے۔ بعض مکاتیب اگرچہ مختصر ہیں مگر ان میں سے بھی کوئی کسی اہم علمی یا اخلاقی نکتے سے خالی نہ ہوگا۔ سب سے آخر میں یہ کہ اسلوبِ نگارش کی ندرت کاری اور شخصیت کی خاص چھاپ کا حسن تو سب میں جلوہ گر ہے۔"

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلا مجموعہ چھبیس[۲۶] مکاتیب پر مشتمل ہے۔ ان میں سے چوبیس[۲۴] مکاتیب مولوی محی الدین احمد قصوری کے نام اور دو[۲] مکتوب نمبر ۱۹ و ۲۵، مولوی صاحب مرحوم کے والد ماجد مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کے نام ہیں۔ یہ مکاتیب ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۰ء تک تقریباً اکیس[۲۱] سال کی مدت میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے۔

ان مکاتیب میں مستقل یا ضمنی طور پر بے شمار مسائل و مباحث آگئے ہیں۔ جن کا مکمل طور پر احاطہ کرنا ناممکن ہے ان میں سے چند مباحث یہ ہیں۔ تعلیم، نصاب تعلیم، نصاب تعلیم میں اصلاح کی ضرورت، بعض احادیث مشہورہ کا حقیقی مفہوم، اخلاق و سیرت، حکمت و شریعت، مذہب و قانون، ادب و تاریخ، صحافت و سیاست، علم و تحقیق، احادیث[۲] تفسیر، تذکار و تقلید، افکار و عقائد، رسالت و امامت، وقتی ہنگامی مسائل و معاملات وغیرہ بے شمار مباحث کے علاوہ نج کے معاملات و تعلقات ضبط تحریر میں آگئے ہیں۔ ان میں سے بعض مکاتیب نہایت مفصل ہیں اور مستقل رسالوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مکاتیب کو "غبار خاطر" کے موضوعاتی مکاتیب کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے اور بعض اعتبار سے اس پر فوقیت رکھتے ہیں۔ "غبار خاطر" کے مکاتیب جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے علمی، ادبی، تاریخی اور فلسفیانہ مباحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے وقت کے فکری رجحانات، ہنگامی مسائل اور وقتی سیاسی و تعلیمی مباحث کا پتا نہیں چلتا۔ لیکن مولوی محی الدین احمد قصوری کے نام مکاتیب کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں کئی مکاتیب ایسے مباحث سے پُر ہیں جو اس وقت ملک کے تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی حلقوں میں موضوع بنے ہوئے تھے۔ پھر ضمنی طور پر جو مباحث ان مکاتیب میں آگئے ہیں وہ بے شمار بھی ہیں اور نہایت بیش قیمت بھی۔

بہرحال مکاتیب کا یہ مجموعہ مطالب کے لحاظ سے حد درجہ بیش قیمت ہے اور کتاب کے تمام دوسرے مجموعوں پر فوقیت رکھتا۔

دوسرا مجموعہ مولانا عبدالماجد دریا بادی مدیر "صدق جدید" لکھنؤ کے نام دار ۱۹۱۲ء تا ۱۹۴۸ء انیس[۱۹] مکاتیب کا ہے۔ ان میں سے سترہ[۱۷] مکاتیب مولانا ابوالکلام آزادؒ کے قلم سے اور دو[۲] مکاتیب مولاناؒ کی جانب سے ان کے سکریٹری محمد اجمل خان کے قلم سے ہیں۔ مرتب نے یہ مکاتیب "نیا دور" کی ایک اشاعت خصوصی کے حوالے سے شائع کیے ہیں۔ یہ مکاتیب "صدق جدید" لکھنؤ کے چار نمبروں میں اور بعض مکاتیب "ایشیا" لاہور میں بھی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شائع ہو چکے تھے۔ لیکن مذکورہ بالا صورتوں میں ان کی افادیت محدود تھی اور نگارشاتِ آزاد، ادبِ علم و ادب کے بہت سے شیدائیوں کو ان کا علم بھی نہ تھا۔ مطالب کے لحاظ سے بھی یہ مکاتیب حد درجہ بیش قیمت ہیں۔ اس حصّے کے بعض مکاتیب میں مولانا آزادؒ نے اصلاحِ حال و معاشرت اور اخلاق و رسومات کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ نہ صرف سماجی و سیاسی کارکنوں کے لیے بلکہ ان تمام لوگوں اور علما کے لیے بھی قابلِ تقلید ہے جو اصلاحِ رسومات اور تہذیبِ اخلاقِ عامّہ کا جذبہ اور داعیہ رکھتے ہیں۔ ان خطوط کی ایک نمایاں اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ مولانا آزادؒ کی سیرت و اخلاق اور نفسیات کے مطالعے کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے اپنے نام مولاناؒ کے خطوط کی روشنی میں ان کی سیرت اور بعض اخلاقی کمالات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اس کا مطالعہ افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ مولانا دریابادی فرماتے ہیں:

"ان کی پبلک تحریریں جس معیار کی ہیں وہ تو ظاہر ہی ہیں لیکن ان کی سیرت کے بعض جوہر ایسے ہیں جو ان کی خانگی یا نجی تحریروں میں زیادہ چمکتے نظر آتے ہیں۔ ان کی مطبوعہ تحریروں سے الگ ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ان سے مختلف۔ مثلاً":

۱۔ الہلالی دور کے مضمونوں اور مقالوں میں طنز و تعریض کا عنصر نمایاں و غالب نظر آتے گا لیکن عین اس زمانے کے مکتوبات میں یہ عنصر نام کو بھی نظر نہیں آیا۔ اور مولانا (ایڈیٹر الہلال سے الگ) تمام تر سادگی، سنجیدگی کی تصویر نظر آتے ہیں۔

۲۔ اس دور کے مضمون اور مقالے جوشِ خطابت اور شعلہ بیانی کی نذر ہیں۔ مکتوبات میں اس کے برعکس، مولاناؒ بجائے ایک جذباتی انسان کے ہر طرح متوازن و معتدل اور ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرنے والے انسان کے روپ میں جلوہ گر ہیں۔

۳۔ نکتہ چینوں کو اس دور کی مطبوعہ تحریروں میں بوئے انانیت محسوس ہوتی ہے ذاتی خطوط کا نقشہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں جلوہ آرائیاں تواضع، انکسار و اخلاص ہی کی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ پختہ عمری کے بعد مولاناؒ کی پبلک تحریروں میں بھی یہ رنگ ایک حد تک آچلا تھا۔ پھر بھی یہ رنگ نمایاں خطوط ہی میں ہے اور ابتدائی اور درمیانی دور کی مطبوعہ تحریریں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو بالکل ہی دوسرے رنگ کی ہیں۔

انسان کے ظرف کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو یہی دیکھنے پر قناعت نہ کیجیے کہ اس کا برتاؤ دوستوں اور معتقدوں کے ساتھ کیسا ہے۔ بلکہ یہ دیکھیے کہ معترضوں، نکتہ چینوں اور مخالفوں کے ساتھ کیسا ہے۔ یہ امتحان ایک کڑا امتحان ہے۔ اچھے اچھے عابد و زاہد بزرگ بھی اس امتحان میں ہمیشہ پورے نہیں اترپاتے۔ مولانا کو اللہ نے اس نعمتِ خصوصی سے نوازا تھا کہ وہ اپنے مخالفین کے لیے بھی دل میں جگہ رکھتے تھے اور ان سے معاملہ رکھنے میں اپنے علم، رواداری اور عالی ظرفی کا پورا ثبوت دیتے رہتے ہیں[1]

اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے "الہلال کے مضمونوں اور مقالوں میں طنز و تعریض کے نمایاں و غالب عنصر اور جوشِ خطابت و شعلہ بیانی کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے یا اس دور کی مطبوعہ تحریروں کے بارے میں نکتہ چینوں کے جس احساس بُوئے انانیت کا تذکرہ فرمایا ہے، اس سے اتفاق کیا جائے لیکن مولانا موصوف نے خطوط کی جن خصوصیات اور مولانا ابوالکلام آزاد کے جن اخلاقی کمالات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں۔

تیسرا مجموعہ علامہ سید سلیمان ندوی کے نام (از ۱۹۱۴ء تا ۱۹۳۷ء) اڑتیس ۳۸ نہایت اہم مکاتیب کا ہے۔ مرتب نے یہ مکاتیب معارف اعظم گڑھ کے حوالہ سے نقل کیے ہیں۔ مرتب نے ان کو اپنے مجموعے میں شامل کر کے ایک علمی و ادبی ضرورت کو پورا کرنے کے علاوہ مطالعے کی سہولت پیدا کر دی۔ یہ مکاتیب ندوہ، دارالمصنفین، معارف، دارالارشاد، الہلال، البلاغ وغیرہ کے متعلق اہم معاملات و مسائل سے پُر ہیں اس کے علاوہ مختلف وقائع و تذکار، قرآن، حدیث اور تفسیر و ترجمان القرآن کے سلسلے میں بعض نہایت مفید اور اہم مباحث ان مکاتیب میں آئے ہیں۔ نیز یہ مکاتیب ہر دو اعاظم رجال کے مخلصانہ و برادرانہ تعلقات کی ایک ایسی دستاویز ہیں جو بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے۔ اس کے علاوہ مکاتیب کی علمی، ادبی، تاریخی خصوصیات اور مکتوب نگار کے اخلاق و سیرت و کردار کے جن کمالات کی جانب مولانا دریابادی نے اپنے تبصرہ میں اشارہ فرمایا ہے، وہ ان مکاتیب میں بھی اسی طرح

---

[1] صدق جدید لکھنؤ۔ ۹ر دسمبر ۱۹۶۰ء نیز دیکھیے "اردو کا ادیب اعظم" از مولانا عبدالماجد دریابادی؛ ناشر: ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، کراچی ۱۴

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جلوہ گر ہیں۔ البتہ حضرت سید سلیمان ندویؒ کے نام مولانا آزادؒ کے مکاتیب کی ایک خصوصیت ایسی ہے جو انھیں مجموعے کے دوسرے مکاتیب سے ممتاز کر دیتی ہے۔ وہ ہے اکثر مکاتیب کا خالص عالمانہ انداز اور ٹھوس علمی مباحث کی زیادتی۔ اور یہ فرق صرف اس لیے ہے کہ حضرت سید صاحبؒ اور مولانا دریا بادی مرحوم کی شخصیتوں میں علمی اعتبار سے ایک نمایاں فرق تھا۔

چوتھا مجموعہ پندرہ ۱۵ مکاتیب پر مشتمل ہے۔ یہ مکاتیب دس ۱۰ حضرات کے نام ہیں، ان میں سے بعض شخصیتوں کا شمار مشاہیر میں ہوتا ہے۔ مثلاً خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان وغیرہ۔ یہ مختلف اقسام کے مکاتیب ہیں اور ان میں سے ہر مکتوب اپنے اندر ایک ایسی خصوصیت رکھتا ہے جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ ان مکاتیب میں ابوالکلام کا عجز بھی ہے، اس کا فکر بھی ہے۔ اس کا اخلاص و محبت بھی جلوہ گر ہے۔ یہ مکاتیب نہ صرف علمی و ادبی بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی اہم ہیں، مولانا مہر صاحب فرماتے ہیں:

> "چوتھا مجموعہ متفرق مکاتیب کا ہے ان میں سے بعض دہلی کے ایک مرقع "میرا عقیدہ" میں شائع ہو چکے تھے، بعض مختلف رسائل میں چھپے، بعض مجھے ایک دوست کی مہربانی سے میسر آئے ...... ان مکاتیب کی اشاعت سے مقصود یہ تھا کہ مولانا کی زیادہ سے زیادہ تحریرات یک جا ہو جائیں۔"

"تبرکات آزاد" کا آخری حصہ بلند پایہ مضامین و مقالات پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں حسب ذیل مضامین ہیں:

۱۔ ہجرت کا فتویٰ (۱۹۲۰ء) ۲۔ فتنۂ ارتداد اور مسلمان (۱۹۲۳ء) ۳۔ مسئلہ خلافت اور جمہوریۂ ترکیہ (۱۹۲۴ء) ۴۔ امیر ابن سعود اور حرمین شریفین (۱۹۲۵ء) ۵۔ دیش بندھو چترنجن داس (۱۹۲۵ء) ۶۔ مقابر و آثار پر عمارات (۱۹۲۵ء) ۷۔ کیا آخری منزل آگئی؟ (۱۹۲۱ء)

یہ تمام مضامین و مقالات مختلف اخبارات و رسائل سے ماخوذ ہیں۔ ہر تحریر کے شروع میں مرتب کے قلم سے تمہیدی عبارتیں ہیں، جن سے تحریرات کا پس منظر معلوم ہو جاتا ہے اور ان کی علمی و تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ملفوظات آزاد: اسی سلسلے کی ایک کتاب ہمارے سامنے "ملفوظات آزاد" آتی ہے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کتاب کو مکاتیب کے سلسلے میں شامل کرنے کی جرأت میں کر رہا ہوں، مجھے فنی نقطہء نظر سے اور موضوع کے تعلق سے کچھ علم نہیں کہ ملفوظات کو مکاتیب کی قسم قرار دیا جاتا ہے یا کسی دوسرے موضوع کے تحت شمار کیا جانا چاہیے۔ یا ملفوظات کو ایک الگ فن اور مستقل موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔

"ملفوظات آزاد" ایک سو ساٹھ ۱۶۰ صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے جس کو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے سابق ڈپٹی پرائیوٹ سکریٹری محمد اجمل خان صاحب نے ترتیب دیا اور "حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی" نے جولائی ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ اس کا ایک ایڈیشن "مکتبہء ماحول کراچی" نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا ہے۔

اس میں ۸۶ اسی مختلف حضرات کے خطوط اور مولانا آزادؒ کے مختصر جوابات درج ہیں۔ ابتدائی چودہ ۱۴ صفحات میں مرتب نے کتاب کا تفصیلی تعارف کرایا ہے اور ان کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

مرتب نے یہ وضاحت کر دی کہ ملفوظات میں الفاظ ان کے اور مفہوم مولاناؒ کا ہے۔ نیز ملفوظات کی صحت ان کے حافظے اور ان کی یادداشتوں کی صحت پر مبنی ہے۔ مرتب محمد اجمل خان صاحب فرماتے ہیں:

"بالفعل میں اس اہم تاریخی دور کے لوگوں کے مختلف سوالات کے متعلق مولاناؒ نے جو کچھ فرمایا تھا اپنی مختصر یادداشتوں سے اخذ کر کے پیش کرتا ہوں۔ چونکہ مولاناؒ کے ارشادات کی مکمل نقلیں میرے پاس نہیں ہیں۔ لہذا عبارتیں مولانا کی نہیں بلکہ مولانا کے فرمودات کا خلاصہ ہے۔"

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

"موجودہ سلسلے کی خصوصیت بس اتنی ہے کہ اس میں لوگوں کے سوالات بھی ہیں اور بروایت راقم مولاناؒ کے جوابی ملفوظات بھی۔ ان کی صحت میری یادداشتوں کی صحت پر منحصر ہے۔"

ملفوظات کی اہمیت اور نوعیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"مولاناؒ کے ملفوظات سے نہ صرف اس تاریخی دور کی سماجی وسیاسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دلوں میں کیا کیا خیالات اور سوالات ابھرتے تھے اور ان کا پس منظر کیا تھا۔ اس لیے میں نے سوالات پوچھنے والوں کے سوالات کو حتے الامکان مکمل طور پر نقل کر دیا ہے اور ان کے ساتھ مولانا کے فرمودات کو اختصار سے لکھ دیا ہے اس اختصار کی خاص وجہ یہ ہے کہ مولانا کو مختلف سیاسی، سرکاری اور سوشل مصروفیتوں سے اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ ہر سوال کے متعلق تفصیل سے کچھ ارشاد فرمائیں وہ چند لفظ فرما دیتے تھے یہ میرا کام تھا۔ کہ اسے مربوط عبارت کا جامہ پہناؤں۔ اگر کہیں مسامحت ہوتی ہو تو اس کی تشریح کرنے کو تیار رہوں یہ مولانا سے مرحوم کی کوتاہی نہ سمجھی جاتے ۔"

مولانا آزادؒ کی نسبت فرماتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزادؒ غیر معمولی عالم دین تو تھے ہی، وہ اردو کے بے مثال ادیب بھی تھے اور مدبر بھی۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس میدان کی صف اول میں تھے ۔ وہ ہر میدان کے شہسوار اور یگانۂ روزگار نظر آتے ہیں ۔

مسائل دینیہ میں ان کی جدت پسندی اس پر شاہد عدل ہے ۔ طلاق قرآن کے سلسلے میں ان کا اجتہاد قابل تقلید ہے۔ بنک کے سود اور انشورنس کے معاملے میں وہ جدید سوسائٹی کی مجبوریوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ پردۂ حجاب اور غض بصر کے متعلق وہ حقیقی اسلامی فیصلہ نمایاں کرتے ہیں۔"

ملفوظات کا یہ مجموعہ مولانا کے افکار و خیالات کے باب میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن چونکہ مرتب نے پوری صفائی کے ساتھ یہ بیان کر دیا ہے کہ یہ مولانا کے الفاظ نہیں ہیں۔ مولانا کے مفہوم کو انھوں نے اپنے الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس صورت میں یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ ممکن ہے کسی امر کی نسبت وہ مولانا کے فرمودہ کو سمجھ نہ سکے ہوں یا ضبط تحریر میں لاتے میں تسامح ہوا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ مرتب کی یادداشت نامکمل ہو۔ یہ خدشہ صرف میرے ہی دماغ میں پیدا نہیں ہوا بلکہ میرا خیال ہے کہ خود مرتب کا ذہن بھی اس سے خالی نہ تھا۔ مرتب کے یہ الفاظ اسی امر کی غمازی کرتے ہیں:

"مولانا کو مختلف سیاسی، سرکاری اور سوشل مصروفیتوں سے اتنا وقت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں ملتا تھا کہ ہر سوال کے متعلق تفصیل سے کچھ ارشاد فرمائیں۔ وہ چند لفظ فرما دیتے تھے، یہ میرا کام تھا کہ اسے مربوط عبارت کا جامہ پہناؤں۔ اگر کہیں مسامحت ہوئی ہو تو اس کی تشریح کرنے کو تیار ہوں۔ یہ مولانا مرحوم کی کوتاہی نہ سمجھی جائے۔

اس انکشافِ حقیقت کے بعد اس کتاب کو مولانا رح کے افکار و خیالات کے باب میں ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ پہلی اور بنیادی حیثیت مولانا کی اپنی تحریروں کی ہے۔ اگر کسی مسئلے کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ مولانا نے اپنی کسی تحریر میں ملفوظات کی رائے کے خلاف رائے ظاہر فرمائی ہے، تو ملفوظات کی رائے کو اس کے مقابلے میں رد کر دیا جائے گا۔ البتہ جن مسائل کے بارے میں مولانا کی اپنی تحریرات میں کوئی رائے نہیں ان مسائل کی نسبت بشرطِ صحتِ یادداشتِ مرتب، ملفوظات کو بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔ اور مولانا کے جن ملفوظات کی مولانا کی دیگر تحریرات سے تائید ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ ان کی صحت کی نسبت کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

ملفوظات سے نہ صرف مولانا کے خیالات کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے بلکہ ان سے مولانا کی نکتہ رسی اور معاملہ فہمی کی اعلیٰ صلاحیت کا بھی پتا چلتا ہے اگرچہ مولانا کی معاملہ فہمی کی صلاحیت ملفوظات کی شہادت کی محتاج نہیں لیکن اس وجہ سے ملفوظات کی اس خصوصیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مرتب کے پیش نظر بھی ملفوظات کی اشاعت کا یہی مقصد ہے۔

"یہ جو کچھ پیش کر رہا ہوں، نہ مولانا کی انشاء کا نمونہ ہے نہ فن مکاتیب نویسی کا۔ یہ مولانا کے ارشادات ہیں جو میں نے جمع کر لیے ہیں اور صاحبان نظر کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ میرا مقصد تو یہی ہے کہ مولانا کے ملفوظات سے ان کی نکتہ رسی اور معاملہ فہمی لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔ لیکن اگر تاریخ انشاء پردازی میں گلہائے رنگا رنگ کی تلاش ہو تو اس کا بھی سامان بہم پہنچ جائے۔"

محمد اجمل خان صاحب نے ملفوظات کی جو جلد پیش کی ہے، وہ حقیقتاً ایک وسیع اور بہت بڑے کام کا "پیش لفظ" ہے آیندہ کام کی کیا نوعیت اور کیا حیثیت ہوگی، اس کی نسبت اجمل خان مرحوم فرماتے ہیں:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"ملفوظات کی بہت سی قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ اب تک عموماً تصوف و مذہب کے سلسلے میں ملفوظات لکھے ہیں۔ اس مجموعے کی نوعیت اگرچہ ملفوظات کی ہے لیکن اس میں واقعات بھی ہیں اور حکایات بھی، روایات بھی ہیں اور فکاہات بھی۔ بہر حال ہم جملہ ملفوظات واشارات آزاد کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں مثلاً دینی، ادبی اور سیاسی۔ ہر عنوان مجموعے کے اوپر درج کر دیا جاتے گا اور ممکن ہے ہر عنوان کی کئی کئی جلدیں ہوں۔ یہ سب روایات و حکایات جنہیں ملفوظات کی شکل دی گئی ہے۔ مولانا کی دین پرستی، انسان دوستی اور محب قومی کی زندہ یادگار ہوں گی۔

زاہد بیا و موت شہیدانِ عشق بین
کیں موت رانہ زندگی جاودان رسید"

ادبی خطوط و جوابات آزاد:

اسی قسم کا ایک مجموعہ "مولانا ابو الکلام آزاد کے نام ادبی خطوط و جواباتِ آزاد" کے نام سے "بیت الحکمت، دہلی" نے ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔ یہ مجموعہ بھی محمد اجمل خان نے مرتب کیا تھا۔ ان کے قلم سے اس پر مختصر پیش لفظ بھی ہے۔ چار سو صفحے کا یہ مجموعہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۷ء تک کے اہل علم کے خطوط اور جواباتِ آزاد پر مشتمل ہے۔ مولانا کے نام خطوط لکھنے والوں میں بابائے اردو مولوی عبد الحق، افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق (مدراسی) جوش ملیح آبادی، مولانا غلام رسول مہر، پنڈت سندر لال، سر تیج بہادر سپرو، رام بابو سکسینہ، مولانا عبد الماجد دریا بادی، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر سید محمود، مقتدیٰ خان شروانی، ہوشیار جنگ ہوش بلگرامی وغیرہ مشاہیر اہل علم بھی ہیں اور غیر معروف لوگ بھی۔ جوابات کچھ مولانا آزاد کے قلم سے ہیں اور کچھ اجمل خان صاحب کی یادداشتوں پر مبنی ہیں۔ جیسا کہ عنوانِ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے، یہ تمام ادبی خطوط و جواباتِ آزاد ہیں اور فاضل مرتب کے پیش نظر سلسلۂ مجلداتِ جواباتِ آزاد (ادبی، سیاسی وغیرہ) میں سے ایک جلد ہے۔

یہ جوابات مولانا آزاد کے اعجاز بیان، وسعتِ مطالعہ و معلومات، ادبی کمالات، علمی تبحر، اصابتِ رائے اور نکتہ رسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس میں بعض مشاہیر علم و ادب کے خطوط بھی یادگار چیز ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افاداتِ آزاد (مذہبی اور ادبی استفسارات کے جوابات)،

بنیادی طور پر یہ مجموعہ "ملفوظاتِ آزاد" اور "مولانا ابو الکلام آزاد کے نام ادبی خطوط و جواباتِ آزاد" (مرتبہ محمد اجمل خان) پر مبنی ہے۔ لیکن بہت سے افادات و جوابات اُن کے علاوہ ہیں۔ یہ مجموعہ خاکسار نے مرتب کیا تھا اور ۱۹۸۴ء میں ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان (کراچی) کی جانب سے شائع ہوا تھا۔ اس کی ترتیب و تدوین کی داستان کے مفصل مطالعے کے لیے "افاداتِ آزاد" کا پیش لفظ دیکھنا چاہیے، مختصر روداد یہ ہے:

محمد اجمل خان نے مذکورۃ الصدر دونوں مجموعے اپنی یادداشتوں سے مرتب کیے تھے اور چونکہ ایک مدت کے بعد اس جانب توجہ کی تھی اس لیے بہت سے جوابات ناقص و نامکمل تھے۔ میں نے تمام مستفسرین کو جن کے پتے انھی دونوں مجموعوں میں مل گئے تھے، خطوط لکھ کر ان سے مولاناؒ کے خطوط، جوابات کی نقلیں یا ان کے عکس منگوانے کی سعی کی۔ بہت سے اصحاب کا پتا نہیں چل سکا کہ وہ مرکھپ گئے یا ۱۹۴۷ء میں نقل مکانی کر کے اِدھر اُدھر ہو گئے یا ممکن ہے پتے صحیح نہ ہوں اور میرے خطوط ہی ان تک نہ پہنچ سکے ہوں۔ بعض نے لکھا کہ انھیں مولانا کی جانب سے جواب نہیں ملا (حالانکہ جواب انھیں بھیجا گیا تھا)، کتنے ہی اصحاب نے لکھا کہ ان کا سرمایۂ علمی ضائع ہو گیا اور بہت سوں نے مولانا کے خطوط یا جوابات کی نقول بھیج دیں۔ اس طرح کئی سو استفسارات کے جوابات مہیا ہو گئے۔ "افاداتِ آزاد" حضرت مولانا کے انھی جوابات کا مجموعہ ہے۔ اس کا مقدمہ اجمل خان کے قلم سے ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:

> "ملفوظات و جوابات کا یہ مجموعہ نہ مولانا کی انشا کا نمونہ ہے، نہ فنِ مکاتیب نویسی کا ... لیکن یہ مولانا کی معجز بیانی، نکتہ رسی اور معاملہ فہمی کا بہت بڑا ثبوت اور افکارِ عالیہ کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔"

مولانا کے افادات کی اہمیت کا ایک اور پہلو بھی ہے، جس کی طرف اجمل خان نے اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> "مولانا کے ملفوظات سے نہ صرف اس دور کی مذہبی اور سیاسی و سماجی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کے کیا مسائل تھے اور کیا کیا خیالات اور سوالات ان کے دلوں میں پیدا ہوتے تھے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ان کا پس منظر کیا تھا؟"

مولانا کے ملفوظات کے خصائص کا مفصل ذکر "ملفوظاتِ آزاد" کے ضمن میں گزر چکا ہے۔ اس پر نظر ڈال لینی چاہیے۔ "افاداتِ آزاد" کے قامتِ تالیف میں وہ خصائص زیادہ حسن و دل ربائی کے ساتھ متشکل ہوئے ہیں:

وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے۔

مکاتیب ابوالکلام آزاد:

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مکاتیب اور بعض مکاتیب کے اقتباسات کا ایک مختصر مجموعہ "ادبستان۔ لاہور" نے شائع کیا تھا۔ چونکہ یہ تمام مکمل اور نامکمل مکاتیب دوسرے مجموعہ میں صحت کے ساتھ آ گئے ہیں اس لیے یہ مجموعہ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ ناشر نے اس مجموعے کو دوبارہ نہیں چھاپا۔

میرا عقیدہ:

مولانا آزادؒ کے چند مکاتیب کا ایک مختصر مجموعہ "میرا عقیدہ" کے نام سے مکتبۂ جامعہ دہلی اور مکتبۂ ماحول، کراچی سے شائع ہوا ہے۔ یہ بڑے سائز کے اڑتیس صفحے ہیں۔ خطوط مولانا غلام رسول مہر، حکیم سعد اللہ اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے نام ہیں۔ یہ مکاتیب بھی چونکہ "نقشِ آزاد" اور ایک دوسرے مجموعے "تبرکاتِ آزاد" میں شامل ہیں۔

دہلی ایڈیشن میں مولانا کے خطوط کے عکس بھی شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۹ء میں پھلواری شریف (پٹنہ) کے قاضی احمد حسین ممبر پارلیمنٹ و ناظم امارتِ شرعیہ صوبہ بہار و اڑیسہ نے مرتب کیا تھا اور اپنے مختصر پیش لفظ کے ساتھ چھپوا دیا تھا۔

مکاتیب ابوالکلام آزاد:

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مکاتیب کا چھوٹا مجموعہ خاکسار ابو سلمان نے مرتب کیا تھا اور جناب علاء الدین خالد صاحب نے اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی کی جانب سے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا تھا۔ اس مجموعے میں بڑی تعداد غیر مطبوعہ مکاتیب کی ہے جو پہلی مرتبہ علمی، ادبی اور سیاسی دنیا کے سامنے آ رہے ہیں۔ کچھ مکاتیب ایسے ہیں جو اگرچہ کبھی نہ کبھی کسی اخبار یا رسالہ میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شائع ہو چکے تھے، لیکن عام طور پر یہ مکاتیب نگاہوں سے پوشیدہ تھے، اس لیے ان کی حیثیت بھی غیر مطبوعہ مکاتیب سے مختلف نہیں ان سے مستقل طور پر استفادہ کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ اس قسم کے تمام متفرق و منتشر مکاتیب کو یک جا کر دیا جائے یہ خطوط ایک سلسلے اور ترتیب کے ساتھ سامنے آئے تو حیرت ہوئی کہ علم و ادب اور سیاست و تاریخ کے کیسے انمول موتی تھے جو بکھرے پڑے تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام خطوط و رقعات ان کی کتاب "ذکر آزاد" سے ماخوذ ہیں۔ میں نے اس میں سے ان کو نکالا، ترتیب دیا، ان کا پس منظر واضح کیا اور جس قدر بھی ممکن ہو سکا ان پر حواشی تحریر کیے۔ مجھے ابتدا میں ان کی اہمیت کا اندازہ نہ تھا۔ لیکن جب تمام مکاتیب و رقعات نقل ہو کر سامنے آئے تو حیرانی ہوئی کہ یہ علم و ادب اور تاریخ و صحافت اور سیاست کے کتنے انمول موتی اور کس قدر بیش قیمت اور اہم ہیں۔

صرف چار مکاتیب اس مجموعے میں کسی خاص وجہ سے "تبرکاتِ آزاد" سے لے کر شامل کر لیے ہیں۔

یہ مجموعہ ۱۹۰۰ء تا ۱۹۵۷ء کے ایک سو اکتیس (۱۳۱) مکاتیب اور سات دیگر تحریرات و پیغامات پر مشتمل ہے۔ ۵۷ برس میں پھیلے ہوئے نادر مکاتیب و دیگر تحریرات اس مجموعے میں آ گئی ہیں اتنے طویل زمانے کی مختلف تحریرات و مکاتیب کسی مجموعے میں بھی نہیں۔ اس مجموعے کا یہ ایک خاص امتیاز ہے۔

پیش نظر مجموعے کے ایک سو اٹھاون (۱۰۸؟) مکاتیب مولانا ابوالکلام کے جواہر نگار قلم سے ہیں۔ تیئیس (۲۳) مکاتیب مولانا کی ہدایت کے مطابق ان کے سکریٹریوں کی جانب سے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی یہ مجموعہ ایک خصوصیت رکھتا ہے کہ مولانا کے قلم سے مکاتیب کی اتنی بڑی تعداد کسی دوسرے مجموعے میں نہیں ہے۔

اس مجموعے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مختلف النوع اور کثیر الاقسام مکاتیب ہیں اور ان کی روشنی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جو تصویر بنتی ہے، وہ اس سے قطعی مختلف ہوتی ہے جو دیگر مجموعوں کے مطالعے کے بعد ذہن میں بنتی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے ذوق و نظر اور افکار و خیالات کے بے شمار گوشے سامنے آتے ہیں، ان کے علم و بصیرت، دانائی و حکمتِ عملی، اعتدالِ فکر و عمل اور انصاف پسندی، اخلاق، کمالات

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیرت و کردار اور ضبط و تحمل کے اتنے عظیم الشان مظاہر سامنے آتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اگر ان کی سیاسی حیثیت سے قطعی انکار کی جرأت کر لی جاتے اور ان کے سیاسی کارناموں کو قطعاً تسلیم نہ کیا جائے، جب بھی ان کی شخصیت اتنی ہی بلند اور پُر عظمت رہتی ہے۔

اس مجموعے میں بعض مسائل و مباحث پر طویل مکاتیب بھی ہیں، اور ان میں ضمنی طور پر بھی بے شمار مسائل و مباحث آ گئے ہیں۔ ان میں سے بعض سیاسی خطوط تاریخی حیثیت رکھتے ہیں، برصغیر ہند پاکستان کی تاریخ اور پاکستان کے پس منظر کے مطالعہ کے لیے وہ بہت اہم چیز ہیں۔ مولانا کی شخصیت اور ان کے افکار و عقائد کے مطالعے کے سلسلے میں بھی ان مکاتیب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کے مکاتیب سے ان کے ایک خاص زاویۂ نگاہ، اندازِ فکر اور رجحان طبع کا پتا چلتا ہے۔ بعض مکاتیب بالکل نجی کے ہیں۔ لیکن ان میں بھی ابوالکلام کے مخصوص اندازِ نگارش کی ندرت کاری اور زبان و بیان کی ایسی شگفتگی اور رنگینی موجود ہے۔ جس کی بناء پر انھیں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پیشِ نظر مجموعے کا دوسرے مجموعوں سے موازنہ مقصود نہیں، چونکہ اس مجموعے میں دوسرے تمام مجموعوں سے کسی قدر مختلف نوعیت کے مکاتیب ہیں اس لیے ان خصوصیات کی تلاش محض بے سود ہو گی جو دوسرے مجموعوں کا مابہ الامتیاز ہیں۔ ممکن ہے بعض خصوصیات ان سے زیادہ ہوں اور ممکن ہے دوسرے مجموعوں سے بعض خصوصیات میں یہ مجموعہ کم تر حیثیت رکھتا ہو۔ لیکن اس کی یہ خصوصیت بے مثل ہے کہ اس میں ابوالکلام آزادؔ سرتاپا ایک عملی انسان اور عوام سے انتہائی قریب نظر آتے ہیں۔ اس میں اس ابوالکلام کا پتا نہیں چلتا جو جلوت سے گریزاں اور خلوت کا خواہاں تھا۔ بلکہ وہ یہاں رونق بزم و مجلس ہے۔ ان مکاتیب میں وہ اپنے کسی ہم نفسِ دیرینہ سے معروفِ گفتگو اور صحبت و یک جائی کے آرزومند نظر نہیں آتے بلکہ عوامی زندگی سے انتہائی قریب اور ان کے مسائل و مشکلات کو اپنے ناخن تدبیر اور عقل گرہ کشا سے سلجھاتے اور کھولتے نظر آتے ہیں۔ یہ کہنا غالباً بعید از حقیقت نہ ہو گا کہ اس مجموعے کے مطالعے سے پتا چلے گا کہ مولانا کس حد تک عوامی شخصیت تھے۔

اس سے قبل حضرت مولانا کے جو مکاتیب شائع ہو چکے ہیں وہ تقریباً چوبیس[۲۴] حضرات کے نام ہیں۔ اگرچہ ان میں بے شمار مسائل و مباحث میں اپنے خیالات و افکار کا اظہار کیا ہے۔ اور تاریخ و صحافت اور سیاست و مذہب وغیرہ کے مختلف میدانوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اشہبِ فکر اور رخشِ قلم دوڑتا اور طرار سے بھرتا نظر آتا ہے لیکن جس قدر مختلف اور بے شمار میدانوں میں فکر و قلم کی جولانیاں اس مجموعے کے خطوط میں نظر آتی ہیں اور جس قدر موضوعات اور مباحث و مسائل اس مجموعے میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ اتنے دوسرے کسی مجموعے میں نہ آئے ہوں گے۔ اس کی وجہ میرے خیال میں یہ ہو سکتی ہے کہ اتنے حضرات کے نام مولاناؒ کے مکاتیب پہلی بار صرف اسی مجموعے میں سامنے آئے ہیں۔

اس خصوصیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس مجموعے میں کوئی ایسا مکتوب نہیں جس پر مکتوب کی بجائے مضمون یا مقالے کا دھوکا ہو۔ "غبارِ خاطر" کے اکثر مکاتیب ایسے ہیں کہ اگر ان کے شروع اور آخر سے چند الفاظ نکال دیئے جائیں تو ان پر مکاتیب کا گمان بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے میرے خیال میں "غبارِ خاطر" کی حیثیت مجموعۂ مکاتیب کی کم اور تحریرات کی زیادہ ہے۔ "غبارِ خاطر" کے سرورق پر مرتب کے یہ الفاظ:

"قلعۂ احمد نگر کی اسیری (از ۹ر اگست ۱۹۴۲ء تا ۱۵ر جون ۱۹۴۵ء) کے زمانے کی بعض تحریرات"۔

ایک خاص معنی رکھتے ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مرتب کے ذہن میں بھی "غبارِ خاطر" کی بنیادی حیثیت "تحریرات" کی تھی "مکاتیب" کی نہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو تعارف میں "بعض تحریرات" کی جگہ "بعض مکاتیب" الفاظ ہوتے۔

اسی طرح "تبرکاتِ آزاد" میں مولوی محی الدین احمد قصوری کے نام بعض مکاتیب ہیں، اگر ان کے چند ابتدائی اور آخری الفاظ و سطور، جو موضوع سے ہٹ کر نوکِ قلم پر آگئی ہیں، نکال دی جائیں، تو اُن پر بھی مکاتیب کا گمان نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص موضوع پر مضمون ہے یا ایک مستقل رسالہ۔

میری رائے میں مکاتیب کی یہ کوئی خوبی نہیں۔ مکاتیب وہی کہلاتے جاتے ہیں، جن میں نہ صرف القاب و آداب ہوں اور آغاز یا اختتام پر سلام و تحیہ یا دوسرے رسمی الفاظ کی وجہ سے ان پر مکاتیب کا گمان ہو، بلکہ مکاتیب کا ہر حصہ ہر جملہ اور ہر سطر بلکہ ہر لفظ بولتا ہو کہ وہ مکاتیب ہیں۔ مکاتیب کی یہ خصوصیت ہمیشہ سے مسلم رہی ہے اور اسی لیے خط کو نصف ملاقات کہا گیا ہے۔

ان مکاتیب میں مولانا اپنے ہر مکتوب الیہ کے انتہائی قریب اور اس سے بولتے چالتے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظر آتے ہیں، وہ کسی ایک مقام پر بھی جذبات کی روانی، بحث کے انہماک اور رد و انکار کے جوش میں نہ مکتوب الیہ کو بھولتے ہیں اور نہ اس کی انفرادی نفسیات کو نظر انداز کرتے ہیں۔

"غبارِ خاطر" کے اکثر اور "تبرکاتِ آزاد" کے بعض مکاتیب میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا آزادؒ کے سامنے جب کوئی موضوعِ علم و فن کھل جاتا ہے تو ان کے انہماک و استغراق کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ مخاطب کو بالکل بھول جاتے ہیں یہ خصوصیت خالص علمی اور فنی تحریرات کی ہے مکتوبات کی نہیں۔

اس مجموعے کے مکاتیب میں مولاناؒ کی سیرت و کردار اور اخلاقی کمالات، نیز ان کے عقائد و افکار کے جو مختلف گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں محدود صفحات میں ان سب کا احاطہ کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ البتہ چند باتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔

مجموعے کے سب سے پہلے مکتوب میں وہ سرتاپا ایک نیازمند اور عقیدت کیش کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ مولانا کا یہ معاملہ اگر مکاتیب کی روشنی میں دیکھا جائے تو مولانا الطاف حسین حالی اور حضرت علامہ شبلی نعمانی کے ساتھ مخصوص تھا۔ ۔ ۔ ان کے علاوہ اور کوئی شخصیت ایسی نظر نہیں آتی جس سے مولانا کے عقیدت مندانہ تعلقات ہوں۔ مولانا حالی مرحوم سے انھوں نے ایک سے زیادہ جگہ پر اپنی عقیدت مندی کا ذکر کیا ہے۔ پھر یہ عقیدت مندی کسی محدود زمانہ کا تاثر نہ تھا۔ اسی طرح حضرت علامہ شبلی مرحوم سے ان کی عقیدت مندی آخر تک باقی رہی۔ ان کا جہاں کہیں بھی ذکر آیا اور جب بھی ان کی یاد آئی تو زبان و قلم بے قابو اور دل بے چین ہو گیا۔ ان دو اعاظم رجال کے علاوہ صرف مولانا عبدالرزاق کان پوری کے حضور میں وہ ایک عقیدت کیش کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان سے یہ عقیدت مندی چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ شاید میری نظر سے مولانا کی کوئی ایسی تحریر نہیں گزری جس میں مولانا عبدالرزاق کان پوری کا ذکر آیا ہو اور ان کی یاد نے بے چین کر دیا ہو۔ حضرت علامہ شبلی سے عقیدت کے باوجود تعلقات و معاملات میں انھوں نے ہمیشہ برابری کا برتاؤ کیا اور یہ کبھی گوارا نہ کیا کہ خود کو ان کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دی جائے، ان کی یاد ہمیشہ ممدوح کی حیثیت سے آئی لیکن یہ ممدوح ان کے پیر یا اُستاد کا قائم مقام نہ تھا بلکہ ایک ایسا دوست تھا جس کے فضل و کمال نے اسے ممدوح و محترم بنا دیا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شبلی و حالی سے مولانا کی عقیدت ایک شاگرد اور مرید کی عقیدت نہ تھی بلکہ ایک ایسے ہم رتبہ دوست کی عقیدت تھی جسے دوست کے علمی و اخلاقی کمالات نے معتقد بنا دیا ہو۔ لیکن جس طرح شبلی و حالی سے حد درجے عقیدت اور نیازمندی کے باوجود ان کی انفرادیت اور انانیت ہر جگہ موجود رہی، اسی طرح مولانا عبدالرزاق کان پوری کے نام خط میں بھی عقیدت و نیاز کے ساتھ ان کی انانیت پوری طرح جلوہ گر ہے۔

اس مکتوب کی یہ اہمیت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ وہ مولانا آزاد کا سب سے پہلا مکتوب ہے، جو اب تک دستیاب ہوا ہے۔ اس سے پہلے کا کوئی مکتوب اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ یہ مکتوب ایک تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے اس مکتوب سے اس روایت کی تردید ہو جاتی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ شبلی سے مولانا کی پہلی ملاقات بمبئی میں ۱۹۰۵ء میں ہوئی تھی۔ اس مکتوب کے ذریعہ پہلی بار اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ علامہ شبلی نعمانی سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات دسمبر ۱۸۹۹ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر کلکتہ میں ہوئی تھی اور اس کے بعد ہی سلسلۂ خط و کتابت شروع ہو گیا تھا۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام مکاتیب میں مولانا کے اخلاق کا ایک ایسا پہلو نمایاں ہوتا ہے جو مولانا کے تقریباً چھ سو مطبوعہ مکاتیب (بشمول مکاتیب مجموعہ ہذا) اور ہزاروں صفحات میں پھیلی ہوئی دیگر تحریرات میں کسی ایک جگہ بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ ملیح آبادی کے نام مکاتیب میں نہ تو وہ اپنا علمی تفوق ظاہر کرتے ہیں، نہ سراپا عالم دین اور کل ہند سیاسی رہنما کے روپ میں نظر آتے ہیں، نہ ان پر کسی قسم کا رعب اور اثر ڈالتے ہیں پھر بھی ملیح آبادی ان کی بارگاہ میں بے تکلف دوست اور ساتھی کی حیثیت سے نہیں جا سکتے۔ مکاتیب میں وہ ایک ایسے رفیق اور ساتھی نظر آتے ہیں، جو اپنے دوست کے جذبات کا انتہائی احترام کرتا ہے کہیں ایک مشفق کے روپ میں نظر آتے ہیں، جو اپنے چھوٹے کی ناسمجھی پر کڑھتا ہے اور بے چین ہوتا ہے حتیٰ کہ کہیں کہیں وہ سراپا نیازمند نظر آتے ہیں۔ ان مکاتیب کے پس منظر میں مولانا ملیح آبادی جس قدر جذباتی اور غیظ و غضب میں بھرے ہوئے نظر آتے ہیں، مولانا میں اتنے ہی صبر، ضبط اور تحمل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

اس مجموعے کا ہر مکتوب اپنی جگہ پر ایک علمی و ادبی جواہر پارہ، تاریخ و حکمت کا انمول موتی ہے یا اس میں عبرت و موعظت اور اخلاق کا کوئی سبق، معاشرت کا کوئی زریں اصول

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور رشد و ہدایت کا کوئی نکتہ موجود ہے، یا مکتوب نگار کی زندگی کے علمی، عملی یا اخلاقی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے یا اس سے ان کے کسی مخصوص طرزِ فکر، زاویۂ نگاہ اور افکار و خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ مکاتیب مولاناؒ کے علم و بصیرت پر دلالت کرتے ہیں، ان کی باریک بینی اور ژرف نگاہی پر شاہد ہیں، ان کے ضبط اور تحمل کا بیان ہیں، ان کی اعتدال و انصاف پسندی کا ان میں مواد موجود ہے، ان کے مرتبہ ایمانی اور اخلاقی کمالات کی دستاویز ہیں، اور ان کے کردار کی بلندی اور سیرت کی عظمت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔ ان کی زبان و بیان اور اسلوبِ تحریر کی ندرت کاری کا نمونہ ہیں۔ یہ مجموعہ نہ صرف ادب و تاریخ کے شیدائیوں اور مذہب و سیاست کے طالب علموں کے لیے مفید اور ان کی توجہ کا مرکز بننے کے لائق ہے سماجی کارکنوں، قومی خدمت گزاروں اور عوام کی اصلاح و تہذیب کا جذبہ و داعیہ رکھنے والوں کے لیے بھی سبق آموز ہوگا۔

مولانا کا زندگی بھر یہ اصول رہا کہ انھوں نے جواب کے لیے کبھی کسی کے بھیجے ہوئے ٹکٹ یا لفافہ قبول نہیں کیا۔ اکثر لوگ جو مولانا کے اس اخلاقی اصول سے واقف نہ تھے خط کے ساتھ ٹکٹ یا لفافہ بھی بھیج دیتے تھے تاکہ جواب میں تاخیر نہ ہو یا جواب یقینی ہو جائے لیکن مولانا ہمیشہ اور ہر کسی کے بھیجے ہوئے ٹکٹوں کو واپس کر دیا کرتے تھے اور لکھ دیتے تھے کہ جواب کے لیے ٹکٹ بھیجنے کی ضرورت نہ تھی جواب دینا اخلاقی فرض ہے۔

تقسیم ملک کے بعد کی ایک آدھ ایسی مثال پیش کی جا سکتی ہے کہ کسی صاحب نے خط لکھا اور مولانا کی جانب سے جواب نہیں ملا۔ شاید یہ بات ان کے لیے خلافِ توقع اور باعثِ حیرت ہو اور ممکن ہے وجہ شکایت بھی ہو۔ میں یہاں اس شبہ کا ازالہ کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے نام سیکڑوں خطوط روزانہ آتے تھے۔ ان میں نجی و شخصی معاملات اور ذاتی حالات و شکوک و شبہات سے متعلق عرض و گزارش سے لے کر ملک و قوم اور ملت کے اہم ترین تعلیمی، سماجی، مذہبی اور سیاسی مسائل پر استفسار، مشورے اور اطلاعات ہوتی تھیں۔ حضرت مولانا کے سکریٹری ان میں سے اہم ترین مراسلات کا انتخاب کر لیتے اور وہی مولانا کی خدمت میں پیش کر دیتے ان میں سے بعض مختلف محکموں اور اداروں کو ان پر کارروائی کے لیے بھیج دیے جاتے اور بعض

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے جوابات کے لیے وہ اپنے کسی سکریٹری کو ہدایت فرمادیتے۔ غیر اہم مراسلات کی مولانا کو خبر بھی نہ ہوتی۔ یہ فیصلہ ان کے سکریٹری کرتے کہ کون سا خط اہم ہے اور کون سا غیر اہم۔

اردو خطوط نویسی میں لمبے چوڑے القاب و آداب لکھنے کا عام رواج تھا اور کم از کم پرانے خیال کے لوگوں اور خصوصاً دینی اور مذہبی حلقوں میں آج بھی اسی رسم کہنہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اس معاملے میں بھی رسم و رواجِ عام سے اپنی راہ الگ بنائی۔ اس سلسلے میں ان کا صرف ایک اور سب سے پہلا مکتوب ہے۔ جس میں انھوں نے طویل القاب یعنی "حضرت مجمع الفضائل مولانا صاحب مدّ فیوضہ،" کا استعمال کیا ہے اس کے سوا مولانا نے کسی چھوٹے بڑے کو لمبے چوڑے القاب سے مخاطب نہیں کیا۔ مولانا شبلی کا وہ بے حد احترام کرتے تھے لیکن ان کے نام مکاتیب میں بھی آداب و القاب میں طوالت پسند نہ کی، بلکہ صرف "آقائے من" یا "یا مولی الجلیل" اور ایک مکتوب میں تو وہ خالص لکھنوی انداز میں "حضنت!" لکھ کر مخاطب کرتے ہیں۔ غور فرمایئے کہ آقائے من اور یا مولی الجلیل میں کسی درجہ احترام اور عقیدت پنہاں ہے اور "حضنت" میں کس درجہ سادگی اور بے تکلفی موجود ہے۔ صرف ان القاب کی روشنی ہی میں آزاد شبلی تعلقات کی نوعیت، شبلی سے ابوالکلام کی عقیدت اور ابوالکلام کی انفرادیت و انانیت کی ایک کہانی لکھی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مولانا حالی کو "یا جناب الجلیل الاعز" کے القاب سے مخاطب فرمایا ہے اور صرف اس القاب میں اپنی عقیدت اور نیاز مندی کی پوری حکایت بیان کر دی ہے۔ مولانا کے ہاں ان کے دوستوں اور عقیدت مندوں کے خاص خاص درجے ہیں اور ان کے لیے مخصوص القاب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے لیے "صدیق مکرم" مخصوص القاب تھا، عام دوستوں کو وہ "صدیقی" لکھا کرتے پھر ان میں بھی درجے تھے بعض صدیق "صدیقی العزیز" اور "صدیق الاعز" کے درجۂ علیا سے تعلق رکھتے تھے اور بعض محض "صدیق" کے زمرے میں آتے تھے۔ حضرت شروانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ دوستوں کے اسی درجہ عُلیا سے تعلق رکھتے تھے، جس طرح حضرت شروانی کے لیے صدیق مکرم" مخصوص تھا اسی طرح حضرت سید صاحب مرحوم کے لیے "اخی"، "یا صدیقی الاعز والاجل" استعمال کرتے تھے۔ اور جن عزیزوں سے ان کو خاص تعلق خاطر ہوتا اور وہ عمر میں ان سے چھوٹے بھی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتے، ان کو وہ ہمیشہ "عزیزی" کے محبت آمیز القاب سے مخاطب فرماتے تھے۔ عام لوگوں کے لیے ان کا مخصوص القاب "حبی فی اللہ" تھا۔ اس کے علاوہ ابتدائی دور کے ایک دو مکتوب میں "جناب کرم"، "شفیق کرم" اور ایک دو مکتوب میں "مکرمی" یا "جناب من" بھی استعمال کیا ہے۔

القاب کے استعمال میں مولاناؒ کا ایک ایسا معمول اور طریقہ رہا ہے کہ صرف القابات کی روشنی میں ان کے ممدوحین، صدیقین اور محبین کی ایک فہرست تیار کی جا سکتی ہے اور القابات کی روشنی میں ان کے مخاطبین کے درجات بلحاظ تعلق خاطر متعین کیے جا سکتے ہیں۔ بلکہ یہ نشان دہی کی جا سکتی ہے کہ مولاناؒ کا کون سا مکتوب الیہ کتنی مدت کی خط و کتابت کے بعد کس زمانہ میں عام سے خاص اور پھر خواص کے کس درجے میں داخل ہوا، یا کس مکتوب الیہ سے روزِ اوّل سے تعلق کی کیا نوعیت تھی۔

مکاتیب کے صرف القابات کے مطالعے سے یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ عام لوگوں سے مولانا کے تعلقات کی بنیاد اور نوعیت کیا تھی؟ ان کا معاملہ نہ کسی ذاتی غرض پر مبنی تھا، نہ کوئی شخصی مفاد پیش نظر ہوتا تھا، نہ دوسروں کی نظر میں خود کو محبوب و ہر دلعزیز بنانے کا جذبہ و سعی کارفرما ہوتی تھی۔ عوام سے ان کا تعلق اسلام کے بلند اصول "الحب فی اللہ والبغض فی اللہ" پر مبنی تھا۔ وہ ہر کسی سے اسی بنیاد پر ملتے اور اسی غرض سے خط و کتابت کرتے تھے۔ اس کے سوا ان کے یہاں عوام سے تعلق کا کوئی اور تصور نہ تھا۔

مولانا کے مکاتیب کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ اور وہ ہے مولانا کے مکاتیب میں "سلام" کا مقام و محل! عام طور پر سلام و تحیہ مکاتیب کی ابتدا میں لکھا جاتا ہے۔ بظاہر مناسب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ملاقات کے وقت پہلے سلام و مزاج پرسی کی جاتی ہے پھر دوسری گفتگو کرتے ہیں، مکاتیب میں بھی یہی رسم اختیار کی جاتی، لیکن بجز چند مکاتیب کے مولانا آزاد کا معمول اس سے قطعی مختلف رہا۔ وہ "سلام" ہمیشہ مکتوب کے خاتمے پر لکھتے تھے۔ یہ ترک و اختیار حقیقتاً مولانا آزادؒ کی انانیت اور رسم و رواجِ عام کی تقلید سے نفور کا نہیں بلکہ اس سے ان کے رجحانِ طبع اور اندازِ فکر کا پتا چلتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غلام رسول مہر صاحب کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"تحریر میں بھی تحیۃ اولیٰ و مستحسن ہے، جس طرح ملاقات میں، لیکن اس کا موزوں محل ابتدا میں ہے یا اختتام میں؟ اس بارے میں اختلاف ہوا۔ امام احمد بن حنبلؒ اختتام کے محل کو ترجیح دیتے ہیں اور یہی طریقہ مکتوبات نبویہؐ میں ملحوظ رہا ہے، میں بھی اکثر یہی طریقہ ملحوظ رکھتا ہوں۔ معہذا دوسرا طریقہ بھی معمول بہا ہے اور موجب ردّ و قدح نہیں۔"

مجموعے کے آخر میں "چند دیگر تحریرات" کے عنوان سے مولاناؒ کے قلم سے چند سوالات کے جوابات اور چند پیغامات وغیرہ ہیں۔ ان میں سے ہر تحریر اپنی جگہ ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اور ان کا محفوظ کر دینا ضروری خیال کیا۔ اس لیے انھیں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کا مطالعہ بھی افادیت سے خالی نہ ہو گا۔ ہر تحریر کے ساتھ ایک تمہیدی عبارت ہے جس سے اس کا پس منظر واضح ہو گیا ہے اور اس کی اہمیت خوب تر سمجھ میں آجاتی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد کی شاعری

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

ہر شخصیت کے علم و فضل، فکر و نظر اور اخلاقی کمالات کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور اس کا قصر انھیں مختلف پہلوؤں اور حیثیتوں کی بنیاد پر تعمیر ہوتا ہے۔ ایسی شخصیتیں جو ہر حیثیت سے عظیم ہوں اور ان کی شخصیت کا ہر پہلو اپنے اندر کوئی انفرادیت رکھتا ہو صدیوں کی گردش لیل و نہار کے بعد صفحۂ ہستی پہ نمودار ہوتی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار ایسی ہی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کے متعلق صحیح لکھا ہے:

"ابوالکلام کی ذات جامع صفات، جامع جہات، جامع حیثیات ہے"

اس بیان میں نہ کوئی مبالغہ ہے نہ عقیدت مندانہ مدح سرائی، بلکہ کمالِ حسن کا حقیقت پسندانہ اعتراف ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کو قدرت نے فکر و نظر کی بے شمار دولتوں، علم و فضل کی بے مثال نعمتوں اور بہت سے اخلاقی کمالات سے نوازا تھا۔ مذہب، علوم و فنون، حکمت و فلسفہ، ادب و انشا، شاعری، غرض کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بالکل نئی راہیں مبدءِ فیاض نے ان کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامن مالا مال نہ ہوا ہو۔

مولانا آزاد کی متنوع اور جامع حیثیات شخصیت کا ایک پہلو ان کی شاعری بھی ہے۔ زیرِ تحریر مضمون میں ان کی شخصیت کے اسی پہلو پہ روشنی ڈالی جائے گی۔

مولانا نے ایک مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی، وہ ابھی عمر کی گیارھویں منزل میں تھے کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ سہسرام کے ایک صاحب مولوی عبدالواحد جو مولانا فاروقی چریاکوٹی کے شاگرد تھے، کلکتے میں مولانا آزاد کے یہاں آتے جاتے تھے انھیں شاعری کا شوق تھا اور مشاعروں میں شرکت فرماتے رہتے تھے، مولانا آزاد سے ملاقات ہوئی تو شاعری کا تذکرہ، مشاعروں کی سرگزشت، داد و تحسین کے ہنگامے، شعراء کے لطائف اور بعض خاص خاص اشعار سے متعلق واقعات گفتگو کا موضوع بنتے تھے یہ امور مولانا کے شاعرانہ ذوق کے لیے مہمیز بن گئے۔ یہ شاعری سے متعلق پہلی منظم دلچسپی تھی جو مولانا کے حافظے میں آخر عمر تک محفوظ رہی اور اس کا ذکر انھوں نے خود کیا ہے۔ ان کی طبیعت شاعری کی طرف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیادہ سے زیادہ مائل ہوتی گئی اور روز بروز شعر گوئی کا شوق بڑھتا گیا۔ مختلف زمینوں میں انھوں نے بہت سے اشعار کہے مگر خود اعتمادی پیدا نہ ہوئی تھی، اس لیے ایک مدت تک کسی کو سنانے کی ہمت نہ ہوئی۔ سب سے پہلی غزل جو مولانا نے کسی کو سنائی وہ "ارمغان فرخ" بمبئی کی طرح میں تھی۔ مصرع طرح یہ تھا۔

"پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی"

مولانا کی یہی پہلی غزل ہے جو ایک طرحی مشاعرے میں پڑھی گئی، لیکن انھیں مشاعرے میں خود شریک ہو کر پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی، انھوں نے پہلے مولوی عبدالواحد سہسرامی کو یہ غزل سنائی، ان کی تعریف و تحسین کے بعد مشاعرے میں پڑھنے کے لیے ان کو دے دی۔ دوسرے دن مشاعرہ کی داد تحسین اور حسنِ تضمین پر سامعین کے خیالات کا حال معلوم کر کے مولانا کو بڑی مسرت ہوئی۔ مشاعرے میں شریک نہ ہونے کی وجہ کم عمری کی جھجک کے علاوہ یہ تھی کہ یہ جلسے رات کو ہوتے تھے اور رات کو مولانا کے لیے گھر سے نکلنا ممکن نہ تھا۔ دوسرے ان کے شعر و شاعری کے شوق کا علم والد کو نہ تھا وہ اس بات کے سخت خلاف تھے کہ زمانۂ طالب علمی میں کوئی دوسرا مشغلہ اختیار کیا جائے۔ مشاعرے میں کامیاب ہونے کے بعد یہ غزل "ارمغان فرخ" بمبئی کو اشاعت کے لیے بھیجی گئی۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"ارمغان فرخ" میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام ایک رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔"

اس غزل کے مندرجہ ذیل تین شعر مولانا نے خود اپنے قلم سے مولانا غلام رسول مہر صاحب کے نام ایک خط میں تحریر فرمائے ہیں،

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی — نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی

گنبد ہے گرد باد تو ہے شامیانہ گرد — شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
"پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی"[1]

اس غزل کا ایک شعر مولانا آزاد کی بہن فاطمہ بیگم عرف آرزو بیگم نے ایک گفتگو میں خواجہ احمد فاروقی صاحب کو سنایا تھا یعنی:

---

[1] نقش آزاد، مولانا غلام رسول مہر، صفحہ ۱۰۷

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"ہوں نرم دل کہ دہشت کے مانند رو دیا
دشمن نے بھی جو اپنی مصیبت بیان کی"

مولانا آزاد کے بیان کے مطابق انھوں نے اس غزل کے ۱۷ اشعار سنانے کے لیے منتخب کیے تھے۔

اب "ارمغان فرخ (بمبئی) کا یہ شمارہ جو جلد ۲ نمبر ۱ بابت جنوری ۱۸۹۹ء کا شمارہ ہے دستیاب ہو گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلع اور مقطع کے بغیر اس غزل کے صرف چار شعر گلدستے میں شمولیت کے لیے منتخب قرار پائے تھے۔ ان میں ایک شعر تو وہی ہے جو آرزو بیگم نے سنایا تھا، دیگر تین شعر یہ ہیں:

یوں تو جہاں میں قاتل و جلاد ہیں بہت — تم فرد ظلم میں ہو قسم آسمان کی
بر لائیے کبھی نہ کبھی تو مرادِ دل سے — لے لیجیے دعائیں کسی بے زبان کی

خجلت کے مارے لعل یمن ہو گیا سفید
ان کے لبوں پہ دیکھ لی سرخی جو پان کی

مولانا آزاد کی ایک غزل کے چار اشعار نے ارمغان فرخ کے شمارہ بابت ماہ فروری ۱۸۹۹ء میں بھی جگہ پائی ہے چونکہ یہ غزل پہلی بار دریافت ہوئی ہے اس لیے اسے درج کیا جاتا ہے۔ مطلع اس کا بھی انتخاب سے خارج تھا۔ اشعار یہ ہیں:

کشتہ ہے ان کی ترچھی نظر کی تمام خلق
حیرت ہے ایک تیر کا عالم شکار ہو
پیش خدا کھڑے ہیں وہ محشر میں بے نقاب
کیا ہی مزا ہو اب جو ہماری پکار ہو
کہنا ہے عاشقوں کو ستا کے دکھا کے چرخ
سینہ نہ یوں کسی کا کبھی داغ دار ہو
آزاد ان کی ترچھی نظر سے نہ خوف کر
یہ تیر وہ نہیں جو کلیجے کے پار ہو

ارمغانِ فرخ کے ان رسائل کی دستیابی کے لیے ہم جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کے شکر گزار ہیں۔ شاعری کے اس شوق میں انھوں نے ایک گلدستہ "نیرنگ عالم" کلکتے سے جاری کیا، لیکن آٹھ ماہ سے زیادہ عرصے تک وہ اسے جاری نہ رکھ سکے۔ خود مولانا نے وجہ یہ بتائی کہ ابتدا میں خیال تھا اس کے شائع ہوتے ہی بہت سے لوگ خریدار بن جائیں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا اور یہ گلدستہ بند

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوگیا۔ "نیرنگ عالم" کے اجرا کا زمانہ ہمارے خیال میں ۱۹۰۰ء کے اوائل کا ہے۔ ۱۹۰۱ء کے شروع میں مولانا نے "المصباح" نامی ایک رسالہ جاری کیا۔ انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ "المصباح" کا اجرا ٹھیک ۱۹۰۰ء کے آخر کی بات ہے، اس کا پہلا نمبر عیدالفطر کے موقع پر شائع ہوا تھا" لیکن عیدالفطر چونکہ ۱۹۰۰ء کے اواخر میں نہیں تھی بلکہ ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو تھی اس لیے ہمارا خیال ہے کہ "المصباح" کا پہلا پرچہ اسی تاریخ کو شائع ہوا ہوگا۔ مولانا آزاد کے بیان کے مطابق "المصباح" تین چار مہینے سے زیادہ نہ چل سکا اور بند ہوگیا۔

"نیرنگ عالم" اور "المصباح" تو مولانا نے شاعری کے شوق کی تکمیل کے لیے ایک خاص ضرورت سمجھ کر خود ہی جاری کیے تھے۔ ان کے علاوہ انھوں نے اس زمانے کے تقریبًا تمام گلدستوں اور رسالوں میں جن کا انھیں علم ہو سکا اپنا کلام بھیجا۔ اگرچہ یہ گل دستے اور رسالے کیاب ہی نہیں نایاب ہیں، تاہم ایسے متعدد رسالوں میں سے ان کے کئی سو اشعار تلاش کیے جا چکے ہیں۔ مثلاً "صحن چمن"، نگینہ (ضلع بجنور)، "ایلچی" پٹنہ، "سفینہ نجات" بمبئی، اور "مخزن" لاہور وغیرہ۔ کچھ اشعار مولانا کی تحریروں میں ضمنی طور پر بھی آگئے ہیں۔

اسی زمانے میں غالب کے آخری دور کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی رام پوری سے مولانا نے اپنی ملاقات اور امتحان کا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ شوخی مرحوم کو جب مولوی اخلاق حسین دہلوی نے بتایا کہ آزاد بارہ یا تیرہ برس کی عمر میں فی البدیہہ شعر کہتے ہیں تو انھیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا۔ بلکہ یہ ماننے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ جو اشعار مولانا مشاعروں میں پڑھتے ہیں وہ انھیں کے ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ مولانا کے والد شاعر ہیں اور وہی انھیں اپنا کلام دے دیتے ہیں۔ رفعِ شک کے لیے شوخی مرحوم نے ایک روز ایک کتب فروش کی دوکان پر مولانا آزاد کو ایک مصرعِ طرح دے کر اسی وقت چند اشعار کہہ دینے کے لیے اصرار کیا۔ مولانا نے دوکان پر کھڑے کھڑے چھ اشعار کہہ دیے اور اس فرمایش پر کہ اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیے فورًا ایک شعر اور کہہ دیا۔ اس غزل کا مولانا نے صرف یہ شعر نقل کیا ہے:

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی، ان کو کبھی یاد نہ ہو

شوخی مرحوم حیران رہ گئے اور کہنے لگے "صورت سے تو دس برس کے صاحب زادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔"

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابتدائے شعرگوئی میں انھوں نے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی تھی بلکہ خود ہی نہایت کاوش سے شعر کہتے تھے اور جب تک طبیعت مطمئن نہ ہوجاتی برابر کاٹ چھانٹ کرتے رہتے تھے۔ مولوی عبدالواحد سہسرامی سے انھیں بڑی مدد ملتی تھی۔ مولانا آزاد نے ان کی معلومات سے استفادے کا اعتراف کیا ہے۔ بعد میں خیال پیدا ہوا کہ کسی مستند استاد کی شاگردی اختیار کرنی چاہیے، سب سے پہلے نظرِ انتخاب امیر مینائی پر پڑی۔ چنانچہ دو غزلیں انھیں بھیجیں۔ لیکن مولانا کو ان کی اصلاح پسند نہ آئی۔ اس لیے پھر انھیں کوئی غزل نہ بھیجی۔ امیر مینائی کی شاگردی کا زمانہ ہمارے خیال میں ۱۸۹۹ء کا آخر ہے۔ اس لیے کہ ۱۹۰۰ء کے شروع میں امیر نے حیدرآباد کا سفر کیا اور ایک ڈیڑھ ماہ کی بیماری کے بعد ان کا وہیں انتقال ہوا۔

امیر مینائی کے بعد مولانا آزاد نے شوق نیموی کی شاگردی اختیار کی۔ موصوف کا نام ظہیر احسن تھا، وہ ایک شاعر، زبان داں اور بہترین نقاد ہی نہ تھے بلکہ اپنے وقت کے مشہور محدث، محقق اور عالم دین بھی تھے۔ متعدد بلند پایہ تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ مولانا نے فنِ عروض، متروکات، قواعد، اصول اور زبان و بیان پر شوق کے عبور اور شاعرانہ واقفیت کی تعریف کی ہے۔

کچھ عرصے کی خط و کتابت اور اصلاح کلام کے بعد شوق نیموی سے اپریل ۱۹۰۲ء میں جب مولانا کی پہلی ملاقات ہوئی تو پھر ویسا ہی لطیفہ پیش آیا جیسا کہ اس سے قبل نادر شاہ خاں شوخی کے ساتھ پیش آچکا تھا۔ شوق مرحوم کو یقین نہ آیا کہ تیرہ چودہ برس کا یہی لڑکا ابوالکلام آزاد ہے یا جو کلام اصلاح کے لیے بھیجا جاتا تھا، اسی لڑکے کا ہوتا تھا۔ چنانچہ جب تک ان کے دیے ہوئے مصرعِ طرح پر ان کے سامنے مولانا نے اکتالیس اشعار کی ایک غزل نہ کہہ دی، انھیں یقین نہیں آیا۔

کچھ دنوں تک مولانا آزاد نے امداد حسین ظہور میرٹھی سے بھی استفادہ کیا تھا۔ مولانا کی کسی تحریر اور بیان سے تو اس کی تصدیق نہیں ہوتی لیکن "سفینۂ نجات" بمبئی میں مولانا کی ایک نعت شائع ہوئی ہے، اس میں مولانا کو ظہور میرٹھی کا شاگرد لکھا گیا ہے۔ خیال ہے کہ مولانا نے قیام بمبئی کے زمانے میں ان سے استفادہ کیا ہوگا۔ اس زمانے میں ظہور مرحوم بھی بمبئی میں مقیم تھے۔ یہ نعت "سفینۂ نجات" بمبئی کے شمارۂ اپریل ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں پانچ شعر ہیں۔ مطلع اور مقطع درج ذیل ہیں،

موزوں کلام میں جو ثنائے نبی ہوئی   تو ابتدا میں طبعِ رواں منتہی ہوئی

آزاد اور فکر جگہ پائے گی کہاں
الفت ہے دل میں شاہِ زمن کی بھری ہوئی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا کی یہی نعت بیس اشعار کے اضافے کے ساتھ تین نعتوں کی صورت میں "صحن چمن" نگینہ بابت ماہ ستمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی تھی (صفحہ ۱۰-۱۱) پہلی میں چار شعروں کا اضافہ کیا ہے، دوسری میں نو شعر ہیں۔ اس کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہیں:

وصفِ نبی سے نظم کی یہ بر تری ہوئی
طوبیٰ کی طرح شاخ مضامیں ہری ہوئی
آزاد وصفِ نورِ نبی جب رقم کیا
شہرت زمانے میں صفتِ انوری ہوتی

تیسری غزل میں سات شعر ہیں، اس کا مطلع اور مقطع ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

ہے امتِ رسول سے جنت بھری ہوئی
جنت میں ہے رسول کی امت بھری ہوئی
آزاد پر بھی ہو نگہ لطف یا رسول
ہے دل میں آرزو ہے شفاعت بھری ہوئی

۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۰ء کے ان چھ اشعار کے سوا مولانا کا اور کلام دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ ۱۹۰۱ء کی کئی منظومات مطبوعہ و غیر مطبوعہ موجود ہیں۔

جنوری ۱۹۰۱ء کے خدنگ نظر میں انز بن یحییٰ انصاری نے مولانا کی ایک غزل کی نشان دہی کی ہے لیکن اس غزل کا شعر صرف ایک درج کیا۔ چونکہ یہ غزل ابھی دستیاب نہیں ہوئی اور یہ شعر بھی "ارمغان آزاد" یا کسی دوسرے مجموعے یا مضمون میں شامل نہیں ہوا ہے اس لیے اس نایاب شعر کو یہاں درج کر دیا جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

وقت نظارہ نہیں جمتی کبھی اس پہ نگاہ
جو ہر آئینہ ہے ظالم تری تصویر بھی[1]

مولانا کا غیر مطبوعہ کلام مولوی محمد یوسف جعفری رنجور کے ذخیرۂ علمی سے دستیاب ہوا ہے۔ اس کے لیے ہم مرحوم کے نبیرہ جناب قدرت اللہ فاطمی صاحب کے شکر گزار ہیں۔

مولوی صاحب مرحوم کے ذخیرۂ علمی سے جو کلام دستیاب ہوا ہے اس میں ایک غزل

---

[1] مولانا آزاد کی سیاسی ڈائری، مالی گاؤں (مہاراشٹر) ۱۹۸۲ء، ص ۴۹

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۱ء کے ایک مشاعرے کے لیے کہی گئی تھی۔ اس کے ۲۷ اشعار ماہنامہ "صحن چمن" بابت ماہ ستمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہو چکے ہیں (صفحہ ۶۔۷) ہمارے پیش نظر مولانا کے قلمی مسودے کی غزل کا عنوان اس طرح ہے جس سے مشاعرے کی تاریخ انعقاد، مہتمم مشاعرہ اور مصرع طرح کا پتا چلتا ہے:

"غزل بر طرحِ مشاعرہ تاریخ ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۱ء مرتبہ مشفقی میر اخلاق حسین صاحب اخلاق دہلوی دام لطفہٗ"

از خادم العلماء، بندہ محی الدین احمد المتخلص بہ آزاد دہلوی مقیم کلکتہ

بر مصرعِ طرح

• توبہ کا نام لیں مرے دشمن بہار میں

اس کے بعد غزل شروع ہوتی ہے۔ غیر مطبوعہ اشعار میں سے چند یہاں درج کیے جاتے ہیں البتہ تسلسل قائم رکھنے کے لیے مطلع و مقطع (مطبوعہ) بھی شامل کر لیا ہے۔

چھوڑا نہ غم نے کچھ بھی مرے جسم زار میں
اک جان ہے سو وہ بھی ترے اختیار میں

ٹھہری نہ خاکِ قیس بھی دم بھر مزار میں
پیدا ہوئے ہیں لاکھ بگولے غبار میں

پیدا ہے رنگ حسن جوانی سے یار میں
جوبن پہ جس طرح سے ہو گلشن بہار میں

دل دے کے فرضِ عشق تو ہم کر چکے ادا
جو کچھ ہو اب مشیّت پروردگار میں

اس سے دو چند حسن پہ ان کو غرور ہے
جتنا نیاز و عجز ہے مجھ خاکسار میں

یوسف نہ تھا عزیز بہ چشم برادراں
اچھوں کی ہو گی قدر نہ اس روزگار میں

ہم کچھ بھی وصف کاکل پیچاں نہ لکھ سکے
مضموں الجھ رہے قلم مشک بار میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اے موت تو ہی آکہ نہ آئیں گے وہ کبھی
آنکھیں ہیں ایک عمر سے دا انتظار میں
موقوف آرزو پہ ہیں سامان ہجر کے
پہلا سا طول اب نہیں شب ہائے تار میں
سودائے زلف و رُخ میں غضب کا ہے انتشار
اب آگئے ہیں گردشِ لیل و نہار میں
وہ پوچھتے ہیں نزع میں کیسا مزاج ہے
اب کیا کہوں! زبان نہیں اختیار میں
مٹ کر ہوں خاک سرمے کے مانند بھی اگر
پھر بھی کبھی سمائیں نہ ہم چشمِ یار میں
سب آرزوئیں دل کی نکالو شب وصال
دو چار بوسے آج بھلا کس شمار میں
کہنے لگے کہ آپ کی نیت تو ٹھیک ہے
بے تاب مجھ کو دیکھ کے بوس و کنار میں
بجلی سی کوندجاتی ہے گھونگھٹ کی آڑ میں
کیا شوخیاں ہیں اوس نگہہ شرمسار میں
دعوائے عاشقی پہ یہ کہنے لگا وہ بُت
اللہ کی شان! آپ بھی ہیں اس شمار میں
آزاد کو ہو اپنی تباہی کا کیا ملال
کس کو قیام ہستیِ ناپائیدار میں

ایک غزل مولانا آزاد نے مولوی محمد یوسف جعفری رنجور کی فرمایش پر کہی تھی۔ جس پر تاریخ درج نہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ بھی ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء کی ہے۔ سر مسودۂ غزل یہ عبارت درج ہے:

"غزل بفرمایش مخلصی و محبی مولوی محمد یوسف صاحب چیف مولوی
بورڈ آف اگزامنرس، کلکتہ،

از بندۂ آزاد ابوالکلام محی الدین احمد آزاد"

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس غزل میں ۱۴ شعر ہیں اس کے دو مسودے مولانا آزاد ہی کے قلم سے لکھے ہوئے دستیاب ہوئے ہیں۔ دونوں میں ترتیب اشعار ایک دوسرے سے مختلف ہے بعض لفظی اختلافات بھی ہیں۔ ایک مسودے سے اس کے چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں:

فراق یار میں دل یا جگر کو دیکھتے ہیں
جدھر لگی ہے ہمیں چوٹ ادھر کو دیکھتے ہیں
تسلیاں شبِ فرقت میں دیں گے آخر کار
ابھی ترقیِ دردِ جگر کو دیکھتے ہیں
ہمارے درد کو جانا ہے لا دوا کہہ کے
نگاہِ یاس سے ہم چارہ گر کو دیکھتے ہیں
پڑے لچک نہ کہیں راہ میں بوقت خرام
سنبھل سنبھل کے وہ اپنی کمر کو دیکھتے ہیں
غضب ہے دیکھ کے غیروں کو وہ کنکھیوں سے
یہ پوچھتے ہیں کہو ہم کدھر کو دیکھتے ہیں
وہ خود ہی طالبِ دیدار ہو گئے آزاد
ہم آہ کے حسنِ اثر کو دیکھتے ہیں

مولانا آزاد کا کلام غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، نعت وغیرہ اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ غیر مطبوعہ کلام میں سب سے اہم مولانا کی وہ فارسی مثنوی ہے جو مولوی محمد یوسف جعفری رنجور، مرحوم کی فرمائش پر "تذکرۂ صادقہ" کے لیے بطور تقریظ کہی تھی۔ اس کتاب پر مولانا نے تقریظ نثر میں لکھی تھی اس کے آخر میں فرمایا تھا:

"اپنے مکرم دوست جناب مولانا محمد یوسف جعفری چیف مولوی بورڈ آف اکزامنرز کلکتہ کی فرمائش سے میں نے ایک مثنوی فارسی تقریظ میں نظم کی تھی جو وقت گنجایش کے سبب سے یہاں درج نہ ہو سکی۔ تین قطعات درج کرتا ہوں"

نہ صرف یہ کہ مولانا آزاد نے یہ مثنوی مولوی محمد یوسف جعفری رنجور کی فرمائش پر لکھی بلکہ لکھ کر انھیں دے بھی دی تھی۔ یہ دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئی اور آج ہم یہ تاریخی نظم پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تقریظ بر تذکرۂ صادقہ (۱)

اے ساقیِ خوش خرام برخیز / از مے بہارِ گل چہ پرہیزا!
ابرے کہ زکوہسار آمد / در موسمِ پُرِ بہار آمد
کایامِ ربیع و نو بہار است / ایں وقتِ نشاط و وصلِ یار است
شادیم کہ ابر ہم رسیدہ / بر دوشِ ہوائے خوش پریدہ
وقتے است کہ دورِ ساغرِ مے * مطرب بدر آید از دف و نے
چوں نغمہ شود بہ شورِ قلقل * کاں سیر بود بہ صوتِ بلبل
از محتسباں مترس گاہے * بر ابرِ محیط کن نگاہے
خنداں چو گل اند گل فروشاں * سرشارِ رحیقِ بادہ نوشاں
پُر کن مئے بے خودی بہ ساغر * تا ایں لبِ خشکِ خود کنم تر
از بادۂ معرفت بدہ جام / تا کارِ خود شود بانجام
گل جام بکف در انتظارت / مل آں کہ غم رود بغارت
گر بادۂ ناب نیست ساقی! / از بادہ علم کن تلافی!
آں علم کہ زاں شود منور / ایں سینۂ عالمانِ برتر[له]
آں عبدِ رحیم اہلِ عرفاں / آں شمعِ فروزِ بزمِ ایماں
دیں پرورد و پیرِ مشائخ / ہر ہر قدمش بہ شرعِ راسخ
کیفیتِ شاں بہ "درِّ منثور" / باخوبی و حسن کرد مذکور
احوالِ خدا رسیدگانست / حرفش ز سوادِ نورِ جانست
مہرے است کہ بے زوال آمد / ماہیست کہ با کمال آمد
آنرا کہ سرے بہ نکتہ دانی است / داند کہ چہ ریزشِ معانی ست
باشد بہ کفِ خرد پسنداں / چوں ساغرِ مے بہ دستِ رنداں

---

(۱) اِس تقریظ کے وہ اشعار جن پر نشان * بنا ہے۔ اُس مثنوی میں بھی شامل ہیں جو مولانا نے جشن تاج پوشی کے مشاعرہ منعقدہ کلکتہ مورخہ ۲۵ رجون ۱۹۰۲ء کے لیے لکھی تھی اور "اپنچ" کلکتہ ۲۴ رجنوری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔

[له] مولانا نے یہ شعر لکھ کر کاٹ دیا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا رب بہ طفیلِ بے نیازی وز صدقہ آں شہِ حجازی

ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد

توقیعِ قبول روزیش باد

مولانا آزاد کا مطبوعہ وغیر مطبوعہ کلام زیادہ تر ۲-۱۹۰۱ء کا ہے، ۱۹۰۳ء کا بہت تھوڑا سا کلام ہے۔ اس میں مولانا کی ایک وہ غزل ہے جو "مخزن"، لاہور بابت ماہ اپریل ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ تفریحِ طبع کے لیے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

کیوں اسیر گیسوے خم دار قاتل ہوگیا

ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہوگیا

کوئی نالاں، کوئی گریاں، کوئی بسمل ہوگیا

اس کے اٹھتے ہی دگرگوں رنگِ محفل ہوگیا

اس نے تلواریں لگائیں ایسے کچھ انداز سے

دل کا ہر ارماں فداے دستِ قاتل ہوگیا

یہ بھی قیدی ہوگیا آخر کمندِ زلف کا!

لے اسیروں میں ترے آزاد شامل ہوگیا

۱۹۰۳ء کے بعد کا کُل شعری سرمایہ صرف چھ رباعیوں اور چند متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ مولانا کی شاعرانہ طبیعت نے نثر میں شاعری کی راہ ڈھونڈھ نکالی تھی ... ۱۹۰۰ء میں "نیرنگِ عالم" اور ۱۹۰۱ء کے شروع میں "المصباح" کے اجرا سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوچکا تھا۔ اسی زمانے میں "خدنگِ نظر" لکھنؤ میں مولانا کے اصرار پر نثر کا حصہ شامل کیا گیا تھا اور اس کی ترتیب مولانا ہی کے سپرد ہوئی۔ اگرچہ "احسن الاخبار" کلکتہ کے ایڈیٹر مولوی احمد حسن تھے لیکن جیسا کہ مولانا نے بیان فرمایا ہے، اس کی زمامِ ادارت عملاً مولانا کے ہاتھ میں تھی۔

اسی زمانے میں انھیں تصنیف و تالیف اور ترجمے کا شوق ہوا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دو برسوں میں وہ کئی چھوٹے چھوٹے رسائل تصنیف و تالیف کر چکے تھے۔ بعض عربی و فارسی رسائل کا ترجمہ بھی کیا تھا اور متعدد ماہناموں مثلاً "مخزن"، لاہور اور "مرقع عالم"، ہردوئی وغیرہ میں مضمون نگاری شروع کی۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے "لسان الصدق" جاری کیا جس سے ان کی علمی، ادبی اور صحافتی زندگی کا ایک خاص اور شان دار دور شروع ہوا۔ غرض ۱۹۰۲ء کے بعد جیسے جیسے مولانا کی تصنیفی اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیگر مصروفیات بڑھتی گئیں شاعری کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ شاعری کا شغل جاری نہ رکھنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ شاعری کو محض تفریح طبع کا مشغلہ تصور کرتے تھے اور صرف فرصت کے اوقات میں شعر گوئی سے جی بہلاتے تھے۔ اس حقیقت کی جانب انھوں نے خود جشن تہنیت تاج پوشی ایڈورڈ ہفتم کے مشاعرے کی روداد میں اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں:

"یہ غزل میں نے جس بے سروسامانی میں لکھی ہے اس کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مطلع تک نہیں لکھا جو لکھا ہے سناتے دیتا ہوں۔ کیوں کہ میں بعض علمی تالیفات کا شغل چھوڑ کر اس فضول شغل کو اختیار نہیں کیا کرتا۔"

مولانا کی ایک تحریر سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے شعر نہ کہنے کا عہد کر لیا تھا۔ مولوی محمد یوسف جعفری رنجور کے نام ایک قطعہ فی البدیہہ (غیر مطبوعہ) کے آخر میں ایک سطر یہ ہے:

"خاک برسرم بادکہ امروز باز فکر شعر کردم استغفر اللہ! استغفر اللہ!"

ہمارا خیال ہے کہ یہ قطعہ ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء کا ہے اس وقت انھوں نے شعر نہ کہنے کا عہد کیا ہو گا لیکن جیسا کہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت وہ اس عہد پر قائم نہ رہ سکے۔ البتہ اس کے ایک آدھ سال کے بعد اس شوق سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

۱۹۰۳ء کے بعد کے مختصر کلام میں ان کی مندرجہ ذیل رُباعی جو انھوں نے اپنی مشہور تصنیف "تذکرہ" کے آخری حصے میں لکھی ہے خاص مشہور ہے:

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی — اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
مے خانے نے رنگ روپ بدلا ایسا
مے کش مے کش رہا نہ ساقی ساقی

یہ رباعی مولانا نے ۱۹۱۷ء میں بہ زمانۂ نظر بندی کہی تھی۔ ۲۷ر دسمبر ۱۹۱۹ء میں ان کی نظر بندی ختم ہوئی۔ ایک مدت تک قیام کی وجہ سے رانچی کے در و دیوار سے محبت اور ماحول سے انسیت ہو گئی تھی، اس لیے اس خرابہ دو یرانہ کو بھی چھوڑتے پر دل راضی نہ تھا۔ اس وقت کی دلی کیفیت کا مولانا نے اس شعر میں اظہار کیا ہے:

قصد کرتا ہوں جو اس جا سے کہیں جانے کا
دل یہ کہتا ہے کہ تو جا، میں نہیں جانے کا

مولانا آزاد کا آخری شعر وہ ہے جو انھوں نے قلعۂ احمد نگر میں قید کے زمانے میں کہا تھا اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"غبار خاطر" کے ایک خط میں نقل کیا ہے:

غنچوں میں اہتزاز ہے پروازِ حسن کی
سینچا ہے کس نے باغ کو بلبل کے خون سے

اگرچہ مولانا آزاد کی شاعری کے اس تاریخی تذکرے میں جا بجا نمونہ کلام بھی آگیا ہے، لیکن نامناسب نہ ہوگا کہ ان کا کچھ کلام اور درج کر دیا جاتے۔

۲۵ رجون ۱۹۰۲ء میں مولوی محمد یوسف جعفری رنجور کی تحریک پر مولوی عبدالباری رئیس کلکتہ نے اپنے مکان پر جشن تاجپوشی ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کے سلسلے میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا تھا اس میں مولانا آزاد نے یہ فارسی رباعی سنائی:

در دہر ز لطفِ او نہ شد طبعم سیر
بر بالا روم کہ خود نہ بالاست نہ زیر
اے عمر برو برو کہ یادِ تو زیاد
اے مرگ بیا بیا کہ یادِ تو بخیر

اس مشاعرے میں ایک فارسی اور ایک اردو غزل بھی سنائی تھی ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اشعار فارسی غزل

کنی ز گریہ اگر منع چشم گریاں را
روا بود کہ ندیدی شبانِ ہجراں را

الٰہی چشم فسوں ساز را چہ مستی ہاست
کہ مست و بے خبر انداخت ہوشیاراں را

برو برو تو طبیبا! چرا بمن آئی!
بغیر مرگ دوا نیست دردِ ہجراں را

اشعار اردو غزل

ان شوخ حسینوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
ایسوں کی اداؤں میں مزا اور ہی کچھ ہے!
بیخود بھی ہیں، ہشیار بھی ہیں دیکھنے والے
ان مست نگاہوں کی ادا اور ہی کچھ ہے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزاد ہوں اور گیسوے پیچاں میں گرفتار
کہہ دو مجھے کیا تم نے سنا اور ہی کچھ ہے

چند رباعیاں مولانا حسن مثنیٰ ندوی کی ڈائری میں مولانا آزاد کے قلم سے درج ہیں ان میں ایک فارسی اور دو اردو کی رباعیاں بہ طورِ نمونہ بحوالہ ماہنامہ "مہرِ نیم روز" کراچی بابت ماہ مئی تا جولائی ۱۹۵۸ء یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

فارسی رباعی

نقاش چو نقش ساز انداز تو بود
دل دادۂ صورت گریِ ناز تو بود
یک شب ہمہ صرف زلفِ مشکیں تو کرد
یک روز تمام چہرہ پرداز تو بود

اردو رباعی

سنتے ہیں رقیب سے ملاقاتیں ہیں
صحبت دن رات ہے مدارا تیں ہیں
ہم کو نہیں اعتبار جو چاہو کہو
عاشق کو وہ منھ لگائے یہ باتیں ہیں!

آفتِ جاں ہے قصۂ جوانی میرا
ظاہر ہے حالِ نوحہ خوانی میرا
اک جان بچاؤں میں کس طرح آزاد
دل کا دشمن ہے یارِ جانی میرا

مولوی محمد یوسف جعفری رنجور کے ذخیرۂ علمی سے مولانا کا جو غیر مطبوعہ کلام دستیاب ہوا ہے۔ اس میں چند رباعیاں اور قطعات بھی ہیں۔ ایک رباعی یہ ہے:

کیوں طعنۂ خویش و اقربا سہتے ہیں!
ہے بات کوئی کہ آپ چپ رہتے ہیں
ہیں کسی کے خیال میں جناب آزاد
سنتے ہیں کسی کی اور نہ کچھ کہتے ہیں

قطعہ ملاحظہ ہو:

کیوں ہے خراب اور کیوں ہے یہ بُرا!
چاہ اپنی ہے اور شوق اپنا اپنا
ہے وعظ کی لت اسے ہمیں شربِ مدام
اُس کو اُس کا ہے شوق مجھ کو اِس کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رنجور کے نام ایک فی البدیہہ قطعہ کے یہ چند شعر دلچسپی سے خالی نہ ہونگے۔

"میرے شفیق رنجور!

گرچہ ہے وعدہ خلافی مری ثابت تم پہ
اور وعدہ مرا پورا کبھی ہوتا ہی نہیں

پھر جو وعدہ بھی ہو پورا تو یہ شکوہ ہے نہیں
کہ کبھی وقت معیّن پہ میں آتا ہی نہیں

یعنی فی الجملہ نتیجہ یہ نکالا تم نے
میں گیا وقت ہوں! جاتا ہوں تو آتا ہی نہیں

آؤں گا "آٹھ بجے ٹھیک" میں انشاء اللہ
پھر نہ کہنا مجھے "رنجور" کہ آتا ہی نہیں

ابوالکلام محی الدین احمد"

مولانا آزاد کا ایک فارسی شعر ہمیں حکیم نصیر الدین اجمیری کی روایت سے حکیم سید محمود احمد برکاتی کے ذریعے ملا ہے چونکہ یہ شعر "ارمغان آزاد" میں شامل نہیں ہے، اس لیے یہاں درج کیا جاتا ہے۔ یہ پتا نہیں چل سکا کہ مولانا نے یہ شعر کب کہا تھا۔ شعر یہ ہے:

ہر موجِ معانی کہ زجیحون دلم خواست
تا ساحل لب آمدہ برتافت عنان را

مولانا آزاد کی شاعری کیسی ہے اور اس کا ادبی مقام کیا ہے، ہمارے نزدیک یہ بحث فضول ہے۔ مولانا کی شاعری اس لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ علمی و ادبی لحاظ سے اس کی کوئی حیثیت ہے۔ ایک بارہ چودہ برس کے بچے کے خیالات و افکار وہی کیا سکتے ہیں ان کی شاعری صرف اس اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے کہ وہ ایک عظیم اور صاحب طرز انشا پرداز کی ادبی زندگی کے ابتدائی نقوش کی آئینہ دار ہے اور اس شخصیت کے ذہن و فکر کے ارتقا کے مطالعے میں ایسے نقوش نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ مولانا آزاد کے شوقِ شعر گوئی کی اس لیے اہمیت ہے کہ اسی شوق نے انھیں بعض ایسی شخصیتوں، جماعتوں اور تحریکوں سے متعارف کرایا جن کی صحبتوں اور مطالعے نے ان کی زندگی کو یکسر بدل دیا اور وہ اپنی خاندانی روایات یا تعلیم و تربیت کی رہنمائی کے قطعاً خلاف بک نئے عالم فکر و نظر میں نکل گئے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد وزارتِ تعلیم کی مسند پر

اشفاق حسین صاحب ڈپٹی سکریٹری وزارتِ تعلیم حکومت ہند

مولانا مرحوم کی قوتِ تحریر اور تقریر کی دھاک تو دل پر ایک زمانہ سے بیٹھی ہوئی تھی، اور "ترجمان القرآن" نے اُس پر مہر لگا دی تھی "تفسیر سورۂ فاتحہ" نے تو اس درجہ مسحور کر دیا تھا کہ "غبار خاطر" جیسا شاہکار بھی عقیدت میں اضافہ نہ کر سکا۔ مگر مولانا کی شخصیت سے روشناس ہونے کا موقع اس وقت تک نہ مل سکا جب تک کہ انھوں نے جنوری ۱۹۴۷ء میں تعلیمات کا قلمدانِ وزارت نہیں سنبھالا۔ اُس وقت مجھے سرکاری طور پر اُن کی خدمت کا شرف نصیب ہوا اور یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ یہ شرف مجھے تقریباً گیارہ سال تک حاصل رہا۔

انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ کوئی شخص بھی اپنے خدمت گار کی نگاہ میں قابل پرستش نہیں رہتا۔ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے خدمت گار سے اُس کا چھپا رہنا محال ہوتا ہے اور یہ چھوٹی چھوٹی کمزوریاں شخصیت کی مجموعی عظمت پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔ مولانا مرحوم انسان کی فطری خاصیت سے مستثنیٰ نہ تھے مگر اُن کی شخصیت اتنی تابناک تھی کہ اُس کی جگمگاہٹ سو پردوں میں سے بھی پھوٹ نکلتی تھی، اس پردہ میں سے بھی جو سب سے بھاری پردہ تھا یعنی خود اُن کی تنہائیت۔ کم از کم زندگی کے آخری دس سال انھوں نے اس طرح گزارے کہ دنیا کے معاملات سے باخبر رہتے ہوئے اور اُن پر اپنی فراست اور دانشمندی کی کڑی نظر رکھتے ہوئے بھی اپنے کو ماحول سے گویا سمیٹ لیا تھا۔ ماحول پر اپنا پورا اثر ڈالتے ہوتے اپنے کو ماحول کے اثر سے محفوظ کر لیا تھا اور ایسا کرنے میں اپنے جذبات اور خیالات کو گویا ایک آہنی ماحول پہنا دیا تھا جس کو دوسروں کی نظریں پار نہیں کر سکتی تھیں کتنے ہیں جو بزعم خود یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ مولانا نے اپنے احساسات اور خیالات میں انھیں اپنا شریک بنایا؟ خود مجھے تو یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا اور اس لیے میں اُن کے بارے میں وثوق سے صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اس گیارہ سال کے دوران میں نے اُن کا طریقۂ کار، دوسروں سے برتاؤ اور طبعی رجحان جو دیکھا اس کا مجھ پر کیا اثر ہوا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علم و ادب کی دنیا میں مولانا کی جو جگہ ہے اُس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں اور اس پر تفصیل سے تبصرہ کرنا مجھ سے زیادہ فاضل کا کام ہے۔ مولانا کی شخصیت کا مجھ پر جو پہلا اثر پڑا وہ اُن کی حیرتناک ذہانت، فراست اور تدبر کا تھا۔ باوجود اس کے کہ انھیں حکومت کے کاموں اور طریقوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا، وزارت سنبھالتے ہی معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان کاموں اور ان راہوں میں انھوں نے عمر گزاری ہو۔ ہر معاملہ کو اس قدر جلد سمجھتے تھے اس کی تہ کو پہنچ جاتے تھے اور پوری تفصیلات پر حاوی ہو کر اس توازن کے ساتھ فیصلہ کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی بالکل شروع زمانہ میں ایک ایسا معاملہ اُن کے سامنے پیش ہوا جس کے بارے میں بے حد نکتہ چینی ہو رہی تھی اُنھوں نے نہایت تفصیل سے معاملہ کی جانچ کی اور جب انھیں اطمینان ہو گیا کہ محکمہ کی جانب سے جو کارروائی ہوئی تھی وہ اصولاً اور مجموعی حیثیت سے صحیح تھی اور اعتراضات کی بنا کچھ اور تھی تو اُنھیں اس میں بالکل تامل نہ ہوا کہ محض مسل پر نہیں بلکہ پریس کانفرنس بلا کر اعلانیہ محکمہ کے کام کو سراہیں، گو جو کچھ ہوا تھا وہ اُن سے پہلے کی بات تھی اور وہ اس کے ذمہ دار نہ تھے اُن کی اس دیانت دارانہ اور باہمت پشت پناہی سے محکمہ کی بہت ہمت افزائی ہوئی مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے اس کے فوراً بعد ہی افسر متعلقہ کو بلا کر اُسے محکمہ کی کوتاہیوں سے آگاہ کر دیا اور تنبیہ کی کہ ان کوتاہیوں کو فوراً ادور کیا جائے۔ تیز نگاہ اور معاملہ فہمی، یہ توازن اور تدبر ایک منجھے ہوئے تجربہ کار عامل کا کام تھا نہ کہ حکومت کے پیچدار کوچوں میں ایک نووارد کا۔

اس کے بعد ان گنت مواقع آئے اور برابر میں اسی معاملہ فہمی، فراست، توازن، تدبر اور دیانت داری کا مشاہدہ کرتا رہا۔ ان تمام واقعات کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ مختصراً صرف اتنا عرض کر دوں کہ مولانا کی جس خوبی کا مجھ پر سب سے زیادہ گہرا اثر پڑا وہ اُن کی بے لاگ دیانتداری تھی، یہ بنیادی دیانتداری اس قدر مستحکم تھی کہ میں نے کبھی بھی مولانا میں کسی قسم کے تعصب کا شائبہ بھی نہیں پایا اُن کے دل و دماغ میں نری صداقت کی روشنی تھی اور اگر کوئی بندش تھی تو صرف بنیادی اصولوں کی۔ اصول پر وہ اٹل تھے اور فروع کو اصول کا تابع رکھتے تھے ہر معاملہ پر اس نگاہ سے نظر کرتے کہ جو حالات ہیں اُن میں کسی اصول کا خون کیے بغیر صحیح تر طریقہ کار کیا ہونا چاہیے بلا لحاظ اس کے کہ معاملہ کا تعلق دوست سے ہے یا دشمن سے۔ دوست کے کسی ناروا فعل کو روا نہیں رکھا اور مفاد عامہ کی خاطر دشمن کو بھی فائدہ

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہنچانے میں انھیں کبھی تامل نہیں ہوا۔ یقیناً یہ اسی بے تعصبی کا ایک کرشمہ تھا کہ اُن کے مزاج میں تلخی بالکل نہ تھی۔ یعنی اُن کی زبان سے کبھی بھی ایک کڑوا لفظ نہیں سُنا۔ مسلم لیگ کے اراکین نے کیا کچھ اُن کے خلاف نہیں کیا اور نہیں کہا مگر مولانا کبھی شکایت کا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لاتے۔ تقسیم وطن کو وہ غلط سمجھتے تھے اور ہمیشہ غلط کہا مگر نہ مسلم لیگ کے کسی فرد کے خلاف انھوں نے کبھی کوئی نازیبا بات کہی۔ نہ پاکستان کی طرف سے اُن کے دل میں کوئی کدورت تھی۔ تقسیم وطن سے جو چوٹیں، دل کو لگی اُس سے ہم میں سے اکثر کے دلوں میں ایک تلخی آگئی تھی مگر مولانا اس سے ہمیشہ بالا رہے، حتیٰ کہ عین تقسیم کے وقت بھی جو اُن کی زندگی کا تلخ ترین صبر آزما وقت تھا جبکہ اُن کی عمر بھر کی کمائی خاک میں مل رہی تھی۔ اس وقت کا . . . . ایک واقعہ میرے دل و دماغ پر ہمیشہ نقش رہے گا اور خدا مجھے توفیق دے کہ اس سے سبق اور سعادت حاصل کرسکوں۔

میرے ایک مسلمان دوست نے مجھ سے مشورہ طلب کیا تھا کہ وہ کیا کریں، ہندوستان میں رہیں یا پاکستان جائیں۔ میں نے مولانا سے ذکر کیا اور انہیں غلط فہمی ہوئی کہ میری اپنی بات ہے۔ مخالفت یا بیزاری درکنار، انھوں نے تعجب کا بھی اظہار نہیں کیا اور بلا تامل نہایت ٹھنڈے دل سے پوچھا، گویا کسی روزمرہ کے معاملہ پر غور کر رہے ہوں "کس کام کے لیے وہ لوگ آپ کو لے جانا چاہتے ہیں؟" جب میں نے بتایا کہ سوال میرا نہیں کسی اور کا ہے تو انھوں نے پھر اُسی نقطۂ نظر سے بات کی۔ میرے دوست سے وہ زیادہ واقف نہیں تھے اس لیے معاملہ کے عام پہلو پر گفتگو کی۔ انھوں نے فرمایا "پاکستان کا بننا ایک شدید غلطی اور بدنصیبی ہے۔ اس سے انتہائی نقصان پہنچا ہے۔ مگر خیر اب پاکستان بن گیا ہے تو ہمیں کوشش کرنا چاہیے کہ اس نقصان میں اضافہ نہ ہو، ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ پاکستان مضبوط ہو اور وہاں اچھی حکومت قائم ہو، اُن کے پاس اچھے آدمیوں کی بہت کمی ہے اس لیے یہاں سے کچھ اچھے آدمی جانے چاہئیں۔ صرف اس کا اطمینان کر لینا چاہیے کہ وہ وہاں کسی مفید کام پر لگائے جائیں گے۔" ان حالات میں یہ الفاظ اسی شخص کی زبان سے نکل سکتے تھے جو صحیح معنوں میں فراخدل اور روشن دماغ ہو اور جو خود پرستی اور تعصب کی گرد راہ سے پاک ہو کر انسانیت کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ چکا ہو۔ ایسا انسان کمیاب ہوتا ہے، بہت ہی کمیاب ایسا ہی ایک فخر انسانیت شخص ہماری دنیا سے اُٹھ گیا ہے۔ خدا کرے دُنیا اس کی صحیح قدر کرسکے اور اس کی مثال کو اپنے لیے چراغ راہ بنائے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد کا تعلیمی فلسفہ

خواجہ غلام السیّدین

کشمیر کے لیے سعادت اور مبارکباد کا مقام ہے کہ اس نے "آزاد سیمینار" کے انعقاد میں پہل کی، اور میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس موقع پر مجھے بلا کر میری عزت افزائی کی، مولانا آزاد کی یاد کی پکار اور عقیدت کے جوش میں جو کشش ہے اس کے پیش نظر کیسے حاضر نہ ہوتا؟ جو زندگی میں نے اختیار کی ہے اس میں لکھنے اور بولنے کی ذمہ داریوں سے تو کیسے بچ سکتا ہوں لیکن شاید ہی کسی مضمون پر قلم اٹھاتے، اپنی کوتاہ قلمی کا اور ذہن اور نظر کی تنگ دامنی کا، اس درجہ شدید احساس ہوا ہو کہ انکار نہیں کر سکتا تھا، اقرار کیوں کر کروں کہ بغیر کافی وقت اور تیاری اور قابلیت کے اس شاداب موضوع کے ساتھ انصاف کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے آج صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ ان کے فکر و نظر کے سمندر میں سے چند سنگریزے جو ساحل ہی سے نظر آتے ہیں۔ آپ کے سامنے پیش کروں اور امید رکھوں کہ شاید زندگی کبھی اتنی مہلت اور توفیق دے کہ گوہر شناسوں کے سامنے اس کے بے بہا گوہروں کی نمائش بھی کر سکوں۔ اس لیے آج کی تقریر دراصل ان کے تعلیمی فلسفہ کی تفسیر نہیں۔ بلکہ ان کے تعلیمی خیالات پر ایک مختصر سا تبصرہ ہے۔

معلّم اور ماہر تعلیم کا لفظ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ جو تعلیم کے اصولوں اور نظریوں کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں۔ اور اسکولوں اور کالجوں میں اس کا عملی تجربہ کرتے ہیں۔ ان کو تعلیم کا فنّی ماہر سمجھا جاتا ہے دوسرے وہ لوگ ہیں جن کو قدرت نے ایک خلاق فکر دیا ہے۔ جو فلسفہ، مذہب، سیاست میں گہری نظر رکھتے ہیں جو جانتے ہیں کہ دنیا میں انسان کا کیا مقام ہے اور جن کی انگلیاں انسان کی زندگی اور اس کے امکانات کی نبض پر رہتی ہیں" یہ لوگ زندگی کو نئی قدروں اور نئی سمتوں سے روشناس کرتے ہیں اور تعلیم کو ان کے حصول کا ایک ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں زندگی کی ایک حسین اور واضح تصویر ہوتی ہے ماضی کی بنیادوں پر قائم، حال کے تقاضوں سے آشنا اور مستقبل کی طرف نگراں، جس میں ان کا تخیل دلکش رنگ بھرتا ہے اور کبھی کبھی ان کو یہ سعادت بھی نصیب ہوتی ہے کہ وہ اسے عمل میں لانے کے لیے جدوجہد کریں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵ مرد حر سے نہیں پوشیدہ ضمیر تقدیر خواب میں دیکھتا ہے عالم نو کی تصویر
اور جب بانگ اذاں کرتی ہے بیدار اسے کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر

مولانا آزاد کا شمار انہیں عصر آفریں معلموں میں ہے۔ ان کی ساری زندگی شاید ۱۳۔ ۱۴ سال کی عمر ہی سے اسی تعلیمی جدوجہد میں یعنی دلوں اور دماغوں کے بنانے میں گزری۔ اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے کیا کچھ نہیں دیا۔ اپنے علم و فضل کی گہرائی، اپنی مذہبی اور فلسفیانہ نظر، اپنی سیرت کی بلندی اور وقار، اپنی سیاسی سوجھ بوجھ۔ اپنی حق پرستی اور انصاف پسندی، اپنی خدمت اور ایثار، اپنی انسان دوستی، اپنی خرد کی تمکین، اور اپنے عشق کا حوصلہ، اور اس تمام ساز و سامان کے ساتھ اور فقر کا علم ہاتھ میں لیے انہوں نے اپنی زندگی کا شاندار جہاد شروع کیا جس کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا بہتر افراد کی تربیت جن کی ذات میں بلند نظری، جرأت، رواداری اور دیانت داری کے چراغ روشن ہوں۔ اور ان کے ذریعہ اور ان کی خاطر ایک بہتر سماج کی تشکیل جس میں محبت، انصاف، فراخ دلی اور معقولیت پسندی کی کارفرمائی ہو۔ اس لیے انھوں نے اپنی تقریروں میں بار بار کہا کہ ہماری پنجسالہ یوجنا کا مرکزی مقصد مادی وسائل اور ذرائع کی توسیع اور ان کا بہتر استعمال نہیں۔ بلکہ ایک نیا ذہن اور نئی سیرت پیدا کرتا ہے۔ اور اس کے لیے صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت، بجلی اور پانی سے بھی زیادہ ضروری صحیح تعلیم کا رواج ہے۔

اس "صحیح تعلیم" کے خدوخال کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہوگا کہ مولانا کی فکر میں انسان کا کیا تصور ہے اور اس کے آئینے میں انسانی تقدیر کی کیا تصویر نظر آتی ہے، یوں تو ان کی تمام تحریروں اور تقریروں میں یہ بحث بکھری ہوئی ہے لیکن انھوں نے اس کا ایک جامع اور مختصر نقشہ اس یونیسکو سمپوزیم کے سامنے پیش کیا تھا جس کا موضوع تھا "مشرق و مغرب میں انسان کا تصور اور اس کا تعلیمی فلسفہ" ان کی گہری نظر یہ تو نہیں مان سکتی تھی کہ مشرق و مغرب کے فلسفے میں کوئی بنیادی فرق اور فصل ہے یا ایک کو دوسرے پر کوئی مطلق افضلیت حاصل ہے لیکن وہ جانتے تھے کہ ان کے فکری اور جذباتی رجحانات میں بعض اعتبار سے اہم فرق ہے جس کا تصور انسانی فطرت کی اس تفسیر اور تعبیر سے ہے جو ان کے مفکروں نے کی ہے گذشتہ چند ہزار برس میں انسان نے اپنی کوشش اور جستجو سے فطرت کے چہرے پر سے ہزاروں پردوں کو اٹھایا ہے لیکن اسے ابھی تک خود اپنی فطرت کے خدوخال اور اس کی گہرائیوں اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیچیدگیوں کو سمجھنے میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی ہے اس لئے آئینہ بنایا ہے اس میں اسے سبھی کچھ دکھائی دیتا ہے، سوائے اپنی فطرت کی سچی اور واضح تصویر کے یعنی :-

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع وضرر کر نہ سکا

لیکن اس کی خود شناسی کی یہ کوشش برابر جاری رہی ہے۔ مختلف فلسفوں نے انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ چینی فلسفے نے انسانوں کے باہمی رشتوں کو سمجھنے پر زور دیا۔ یونانی فلسفے نے جو مغربی فلسفے کا سرچشمہ ہے، عالم خارجی میں انسان کا مقام اور مرتبہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہندوستانی فلسفہ نے اپنی توجہ کا مرکز انسان کے داخلی اور باطنی تجربے کو بنایا۔ ظاہر ہے کہ تینوں پہلو ایک دوسرے سے جُدا نہیں بلکہ ایک ہی وحدت کے مظاہر ہیں۔ لیکن ان کی اضافی اہمیت کا شعور ہر قدم اور عہد کے فکری رجحان پر روشنی ڈالتا ہے۔ مغرب نے نظر اٹھا کر اپنے خارجی ماحول کو دیکھا۔ مشرق نے نظر جھکا کر اپنے اندر نگاہ ڈالی۔ مغرب نے سائنس کے علمی مزاج کی قدر کی اور اس کی بے اندازہ قوت پر ایمان لایا۔ اس کے ائمہ فکر ڈارون، فرائڈ اور مارکس قرار پائے۔ ڈارون نے ارتقاء کے تصور کو اپنے فکر کی بنیاد قرار دیا۔ فرائڈ نے بتایا کہ انسانی ذہنیت ابھی تک ان پوشیدہ اور غیر شعوری جبلتوں کی تابع ہے جو اس کے ابتدائی حیوانی آغاز میں اس کی زندگی پر مسلط تھیں۔ مارکس کا عقیدہ ہے کہ انسان اور اس کی تاریخ تمام تر اپنے مادی ماحول اور تاریخی اور اقتصادی تحریکوں کی پیداوار ہے۔ لیکن باوجود اس مادیت پرستی کے، باوجود فطری طور پر جبر کا قائل ہونے کے مغرب نے عملاً تقدیر پرستی کا شیوہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ سائنس کو خضر راہ بنا کر سماج کی تعمیر نو کے لیے ایک شاندار جدوجہد کی، یہی چیز دورِ حاضر میں مغرب کے فکر کا امتیازی نشان ہے جس میں ہمارے لیے بھی عبرت اور ہدایت ہے۔

مشرق کی کہانی اس سے مختلف ہے۔ اس نے دُنیا کو تصوف اور ویدانت کی نظر سے دیکھا اور اس میں انسان کی روحانیت اور باطنی حقیقت کا جلوہ نظر آیا۔ صوفی انسان کو بحرِ ناپیدا کنار کی ایک موج، اس مہر جہاں تاب کی ایک کرن سمجھتا ہے جس میں اصل ذات الٰہی ہے وہ خود کو خدا سے جدا محض اس لیے سمجھتا ہے کہ اس کی آنکھوں پر جہالت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ محض ایک حیوان نہیں جس نے ارتقاء کی بہت سی منزلیں طے کر لی ہوں بلکہ اس میں ذات خداوندی کا پرتو ہے یعنی اس جرم صغیر میں ساری کائنات سمائی ہوئی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس طرح مشرق کے فکر نے انسان کا رشتہ خدا سے جوڑا اور اسے اس بلند مقام پر پہنچا دیا۔ جہاں وہ خدا کا نائب اور افضل مخلوقات بن جاتا ہے۔ لہٰذا مشرقی تصور کے مطابق تعلیم کا اعلیٰ ترین مقصد یہ قرار پایا ہے کہ وہ انسان کی بنیادی لیکن سوئی ہوئی روحانیت کو تلاش اور بیدار کرے اور اسے اس کی زندگی میں قوت محرکہ بنادے۔

لیکن مشرق نے بھی اس مقام پر ٹھوکر کھائی۔ اس نے انسان کے بلند مقام کو تو پہچانا۔ لیکن اس کے ذہن کو تقدیر پرستی کے بندھنوں سے آزاد نہیں کیا جس کی وجہ سے مدتوں تک اس کی مادی اور سماجی ترقی مسدود ہو کر رہ گئی۔ جب انسان ذاتِ الٰہی کا ایک جزو ہے تو وہ جو کچھ کرتا ہے، یا نہیں کرتا۔ سب امر الٰہی سے ہے۔ ذرا غافل ہو کر اس خیال سے ایک قدم آگے بڑھائیے تو انسان تقدیر کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا معلوم ہوتا ہے جب کسی سماج کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ انسانی دکھ درد اور محرومیوں کی جو تصویریں چاروں طرف نظر آتی ہیں۔ وہ مایا کا کھیل ہیں تو افراد میں ان کی طرف سے بے حسی اور بے بسی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی ذہنیت گزشتہ دو سو برس میں مشرق کے ملکوں میں رائج ہو گئی تھی، چنانچہ اس وقت ایک عجیب بات یہ ہے کہ مغرب باوجود مادیت اور جبر کے قائل ہونے کے سائنس، صنعت و حرفت اور سماجی ترقی میں پیش پیش ہے۔ اور مشرق باوجود انسان کی روحانی عظمت کا قائل ہونے کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی پسماندگی کا شکار ہے۔

مولانا کے تعلیمی فلسفے کا بنیادی خیال یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کے نظریوں میں میل پیدا کیا جائے تاکہ انسان سائنس کا صحیح استعمال کرنا سیکھے اور اس کے ذریعہ ان مقصدوں کو حاصل کر سکے جو اس کی فطرت کے بہترین تقاضوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ سائنس تو ایک طاقت ہے بذاتِ خود غیر جانبدار ہے اس کے انکشافات کو تعمیر اور تخریب دونوں کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ انسان کون سا راستہ اختیار کرتا ہے، زندگی کا یا موت کا، انصاف اور رحم کا یا ظلم اور خود غرضی کا یہ اس کی ذہنیت اور نیک و بد کے تصور پر منحصر ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ تعلیم کے ذریعہ اس کے انداز فکر و نظر اس کے معیارِ خوب و زشت کو بدلا جائے یعنی سوال ہر آرزو کے پورا ہونے کا نہیں بلکہ آرزو کے صالح ہونے کا ہے ؎

تری دُعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دُعا ہے تری آرزو بدل جائے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا کا کہنا ہے کہ اگر انسان محض ایک "ترقی یافتہ حیوان" ہے تو وہ سائنس کے ذریعے صرف انہیں اغراض ومقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جن کی بنیاد اس کے حیوانی جذبات اور جبلتوں پر رکھی گئی ہے۔ برخلاف اس کے اگر وہ ذات الہٰی کا ایک پرتو ہے تو سائنس کو بھی مشیت الہٰی کی تکمیل کا وسیلہ بنائے گا۔ یعنی کاوش کرے گا کہ کس طرح اس کی مدد سے دنیا میں امن اور سلامتی اور انسان دوستی کی کارفرمائی قائم ہوسکتی ہے۔ اس لیے ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مشرق اور مغرب کے تعلیمی فلسفوں کو ایک وسیع تر تصور میں جمع کرکے ایک ایسے متوازن اور مکمل نظام تعلیم کی بنیاد ڈالی جائے جو فرد اور سماج کے مطالبات میں ہم آہنگی پیدا کرسکے، اگر افراد کی شخصیت میں وحدت ہم آہنگی اور یک جہتی نہ ہوگی تو اس کا اثر سوسائٹی پر پڑے گا اور سماج میں باہمی اختلافات پرورش پاتے رہیں گے۔ تعلیم کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ایک صالح اور مربوط سوسائٹی کے لیے ایسے افراد کی تربیت کرے جن کی شخصیت ہم آہنگ اور مربوط ہو، ایسی مربوط جیسی خود مولانا کی اپنی شخصیت تھی۔

باوجود اس امر کے، نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو مذہب میں گہری نظر تھی، وہ ایک صالح، دیانتدار اور دینداری زندگی کی بنیاد مادی خوشحالی کی سرزمین میں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اس خوشحالی کو وہ کسی خاص جماعت یا گروہ کی میراث نہیں بلکہ سب لوگوں کا حق مانتے تھے۔ اس لیے ان کے تعلیمی تصور میں مذہب، سائنس، ادب، فلسفہ، ٹیکنالوجی سب کے لیے جگہ تھی۔ یہ وسعتِ نظر، یہ ہمہ گیری، کثرت میں وحدت کی یہ پہچان اور وحدت میں کثرت کی اہمیت کا یہ احساس ان کی فکر کے ہر گوشے میں پایا جاتا ہے ان کی نظر میں ادب، آرٹ، سائنس، فلسفہ کی اس دنیا کی ایک امتیازی اور حسین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جنگ وجدل کی دنیا نہیں صلح اور میل جول کی دنیا ہے۔

ان کے ذہن میں صرف فراخی ہی نہیں بلکہ انصاف پسندی بھی کمال کی تھی، وہ ہر معاملے کے دونوں پہلوؤں بلکہ سب پہلوؤں کو بالکل غیر جانبداری کے ساتھ دیکھتے تھے۔ لیکن غور کرنے کے بعد ان کا فیصلہ بالکل محکم اور دوٹوک ہوتا تھا۔ مثلاً سرسید کے شاندار علمی، مذہبی اور تعلیمی کارناموں کا انہیں اعتراف تھا۔ لیکن ان کی سیاست کے بعض پہلوؤں سے اور تعلیمی نظریوں سے اختلاف تھا۔ اور اعتراف واختلاف دونوں کا اظہار انہوں نے معقولیت اور اعتدال کے ساتھ کیا مغربی تعلیم کے جواز کا مسئلہ مدتوں ہندوستانیوں میں زیر بحث رہا۔ ابتدا میں مذہبی خیال کے لوگوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اور حال میں آزادی حاصل کرنے کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعد بعض لوگوں نے قومیت کے اندھے جوش میں اس کو بالکل رد کرنا چاہا۔لیکن ہر موقع پر مولانا نے اس معاملے میں ایک متوازن رویہ رکھا جو تعصب اور تنگ نظری سے پاک تھا۔ان کے نزدیک اس وقت انگریزوں کی اندھی نقالی بھی اتنی ہی قابل اعتراض تھی۔جتنی آج مغربی علوم اور زبانوں کو خارج کرنے کی کوشش۔انہیں احساس تھا کہ اس تعلیم کی بدولت ہماری قومی اسپرٹ کا احیاء ہوا ہے اور جدید علمی اور سائنٹیفک ذہنیت کی بنیا دپڑی ہے لیکن ساتھ ہی اس کی وجہ سے ہمارے سماج میں عوام وخواص کا فصل پیدا ہوا۔اور بڑی حد تک ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اپنی قومی میراث سے بے تعلق ہوگیا۔اس میں نہ ایک قومی ذہن پیدا ہوسکا۔نہ قومی ایکتا،اس لیے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہماری تعلیم کی روح مشرقی اور ہندوستانی ہونی چاہیے تاکہ لوگ اپنی تہذیب کی قدروں کو پہچانیں اور اس کے سرچشموں سے فیض حاصل کریں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ جانتے تھے کہ مغرب سے سبق لے کر ایک سائنٹیفک ذہن پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔جس کے بغیر عصر حاضر کے تقاضے پورے نہیں ہوسکتے اور زندگی میں فراوانی نہیں آسکتی،اسی وجہ سے گو مولانا نے خود خالص مشرقی تعلیم پائی تھی۔انہوں نے انگریزی کی تعلیم پر بعض مغربی تعلیم یافتہ لوگوں سے زیادہ زور دیا۔وہ واقف تھے کہ یہ نہ صرف مغربی علوم اور سائنس کے لیے بلکہ بین الاقوامی تعلقات کے لیے بھی ایک کنجی کا کام دیتی ہے۔انہوں نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ ہم اپنی مادی دولت اور ساز وسامان تو جغرافی حد بندیوں میں قید کر سکتے ہیں۔لیکن علم اور تہذیب کی دولت پر مہر نہیں لگا سکتے۔وہ تو تمام انسانوں کی میراث ہیں۔تہذیب کے میدان میں تنگ نظری سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں اور قوموں کی ترقی میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔آزادی کے اس دور میں جو ابھی شروع ہوا ہے۔ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مرض سے (طاعون کی طرح) پناہ مانگیں یہ بیماری فکر وعمل کے ہر گوشے میں مختلف بھیس بدل کر نمودار ہوتی ہے۔مذہب کے میدان میں اندھی مذہبیت کی شکل اختیار کرتی ہے۔اور عقیدے کے نام پر ہمیں دھوکا دیتی ہے۔سیاست کے میدان میں قومیت کا ڈھونگ رچا کر ہمارے ذہن پر چھاپہ مارتی ہے۔علم وفن کے میدان میں قوم اور ملک کا واسطہ دے کر ہمیں گمراہ کرنا چاہتی ہے۔لیکن ہمارا فرض ہے کہ ان دلکش ناموں کا فریب نہ کھائیں کیونکہ ان سب چیزوں کی جڑ تنگ نظری ہے،..... ٹیگور شانتی نکیتن کے ہر جلسے کے آغاز میں ایک جملہ دہرایا کرتے تھے "یہ وہ مقام ہے جہاں تمام دنیا ایک گھر بن گئی ہے"۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا کا خیال تھا کہ اس انسانی وحدت پر خلوص کے ساتھ ایمان لانا اور دل و دماغ کی کھڑکیوں کو کھلا رکھنا ہماری تہذیب کی مخصوص جینیس میں شامل ہے اور تعلیم کا مقدس فرض ہے کہ وہ اس روایت کو قائم رکھے اور مضبوط کرے۔

دوسرے مذہبی خیال کے لوگوں کی طرح مولانا کا عقیدہ بھی یہ تھا کہ ہر گہری تبدیلی خواہ وہ افراد میں ہو یا جماعتوں میں اندر سے شروع ہوتی ہے وہ افراد کی سیرت میں انقلاب چاہتی ہے اور خدا اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اندر سے اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیت میں تبدیلی نہ کرے۔ اوّل تو کوئی زبردست انقلاب محض بیرونی دباؤ یا جبر سے وجود میں آ ہی نہیں سکتا اور اگر کسی طرح ایسا ہو بھی جائے تو اس کی جڑیں مستحکم نہیں ہوتیں۔ اور ان کی رگوں میں صالح خون نہیں دوڑتا۔ بہت عرصہ ہوا قومی احتساب نفس کے موڈ میں انھوں نے بہت قوت کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا تھا "مسلمان اگر آزادی کے لیے آسمان کے تارے بھی توڑ لائیں اور ان کے ایک جانب سونے کا ڈھیر ہو اور دوسری جانب فوجوں کی قطاریں کھڑی ہو جائیں پھر بھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ خود اپنے اندر ایک مضبوط اور سچی تبدیلی نہ کریں اور ان تمام گناہوں اور جرموں کے ارتکاب سے باز نہ آئیں۔ جن کی وجہ سے یہ تمام مصیبتیں گھیرے ہوئے ہیں۔"

اسی وجہ سے ان کا عقیدہ تھا کہ ہر میدان میں کامیابی کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ایک صالح سیرت کی تعمیر کی جائے اور یہ صرف تعلیم کے ذریعے ممکن ہے بشرطیکہ ہمارا تعلیم کا تصور تخلیقی ہو میکانکی نہ ہو، ہمارا ماحول کوئی بنا بنایا سانچا نہیں جس میں کسی نہ کسی طرح فرد کو ٹھیک بٹھانا ہے۔ یہ انسان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اس تھکی ہوتی دنیا کو جو ظلم اور جور سے بھری ہوئی ہے چپ چاپ اور مجہول انداز میں قبول کر لے۔ اس کی حیثیت ایک خلّاق کارکن کی ہے جو مشیّت الٰہی کی تکمیل میں مشیّت کا شریک کار بن سکتا ہے۔ مولانا کا ایک محبوب شعر ہے جس کو انھوں نے اپنی تحریر اور تقریر میں بار بار استعمال کیا ہے اور جو ان کے فلسفۂ زندگی پر واضح روشنی ڈالتا ہے ؎

طبعے بہم رساں کہ بہ سازی بہ عالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گذشت!

زندگی کے دو ہی راستے ہیں جن میں سے انسان ایک کو اختیار کر سکتا ہے یا تو وہ اپنی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طبیعت ایسی بنالے کہ زمانے کی ہوا کے ساتھ چلے اور پانی کے ساتھ بہے۔ دنیا سازی میں کمال حاصل کرے اور جوں جوں دنیا بدلتی جائے خود کو بے چون وچرا اس کے مطابق ڈھالے یا اپنے اندر ایسی ہمت اور حوصلہ پیدا کرے کہ دنیا کی تمام تحریصوں کو ٹھکرا کر ان سے بلند ہو جائے۔ اس کی خودداری باطل کے ساتھ معاملہ نہ کرے بلکہ حق کی خاطر سارے عالم کا مقابلہ کرنے کو تیار رہے۔ مولانا کے نزدیک سیدھا اور سچا راستہ یہی ہے۔ اس بارے میں ان کا اور اقبال کا ایک ہی مسلک ہے۔ اقبال نے اس کو زبان شعر میں بہت سے حسین اندازوں میں پیش کیا ہے ؎

گفتند جہان من آیا بہ تو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

کافر اور مومن کا فرق بھی یہی ہے کہ کافر ہمیشہ زمانے کے سانچے میں ڈھلتا ہے اور مومن زمانے کو اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مولانا نے اپنی ایک تقریر میں اپنے ہم وطنوں کو اس نئے زمانے کی بشارت دی تھی جو آنے والا ہے اور بتایا تھا کہ اس کے لیے دل و دماغ کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہوگی۔ "ہندوستان ماضی کی سرحد سے نکل چکا ہے۔ اور مستقبل کے دروازے پر دستک پڑ چکی ہے۔ یہ تغیر کا موسم ہے، تخم کا موسم ہے، تخم ریزی کی فصل ہے، خود ہم اس کی کارفرمائیاں محسوس نہیں کر رہے۔ لیکن مستقبل کا مورخ انہیں محسوس کرے گا۔ وہ ہمارے عہد کے ایک ایک حادثے کا سراغ لگائے گا اور انہیں میں نئے عہد کی ساری بنیادیں دیکھنی چاہے گا۔ اس وقت جو نقشے بھی ہم بنائیں گے، جو چال ڈھال بھی اختیار کریں گے جیسی کچھ صدائیں ہماری زبان سے نکلیں گی انہیں سے ہماری ذہنیت کا سانچا بنے گا اور اس سانچے میں ہمارا مستقبل ڈھلے گا۔ پس ضروری ہے کہ ہم اپنے دل و دماغ کی نگرانی کریں۔ ہمیں جو روش بھی اختیار کرنی ہے قصد و عزم کے ساتھ اختیار کرنی ہے ..... ہمیں زمین پر چلنا ہے، لہروں میں بہنا نہیں"۔

جس شخص کے سامنے تعلیم کا یہ تصور ہو اور وہ زندگی میں نظری حیثیت سے اسے اس قدر بلند مقام دے اس کے لیے لازم تھا کہ وہ قوم کو اس کی علمی اہمیت سے بھی روشناس کرے اور قومی تنظیم کے نقشے میں اس کے لیے مناسب جگہ نکالے۔ چنانچہ انہوں نے برسوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک اس خیال کو مقبول بنانے اور پرانے ذہنی سانچوں کو توڑنے کی کوشش کی لیکن ان میں انہیں مختلف وجوہ سے پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ اپنے انتقال سے کچھ روز پیشتر انہوں نے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے آخری جلسے میں اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا۔ (اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی اس امامِ ضبط کو اس قدر جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کسی چیز کی وکالت کرتے سنا ہو) وہ جانتے تھے کہ ایک موزوں نظام تعلیم کے بغیر قوم کی اصلاح کی کوشش ریت پر عمارت بنانا ہے انہیں یہ بھی اندازہ تھا کہ اس نظام تعلیم کا کیا نقشہ ہونا چاہیے تاکہ وہ پوری قومی زندگی کے بوجھ کو سنبھال سکے۔ اس میں انہوں نے پانچ بنیادی عناصر کو جگہ دی تھی۔ چھ سے چودہ برس تک کے بچوں کے لیے لازمی تعلیم، جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے ناخواندہ بالغوں کے لیے سماجی تعلیم، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کو توسیع کے ساتھ ساتھ ان کے معیار کو بلند کرنا ملکی ضرورتوں کے شایانِ شان ٹیکنیکل اور سائنٹیفک تعلیم کا اہتمام اور قومی تہذیب کو مالا مال کرنے کے لیے آرٹ اور فنونِ لطیفہ کی ترویج، یہ بھی ان کی قیادت کا اعجاز تھا کہ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ آرٹ اور کلچر کو وزارت معارف کا جزء بنایا گیا۔ ورنہ انگریزی حکومت کے دوران میں اس کا تعلق محض اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم سے ہی رہا تھا۔

بہر حال گذشتہ دس سال میں باوجود ہر قسم کی مشکلوں کے ان کے عہد زریں میں تعلیم نے جو ترقی کی اس کا اعتراف ہر غیر جانبدار نقاد اور مبصر کرے گا۔ اس بے لاگ انداز میں جو ان کے فکر اور فیصلوں کا خاصہ تھا انہوں نے ایڈوائزری بورڈ کے اس آخری جلسے میں موجودہ تعلیمی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ہم ان مشکلوں پر غور کریں جن سے ہم گزر رہے ہیں اور دیکھیں کہ ہمارے لیے کیا کرنا ممکن تھا۔ تو ہمیں کسی معذرت کی ضرورت نہیں اور ہم سر اونچا کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا لیکن بہ حیثیت ایک امیر کارواں کے جس کی نظر میں صرف ماضی ہی نہیں بلکہ مستقبل بھی تھا۔ جس کو صرف پیچھے کا طے کیا ہوا راستہ ہی نہیں بلکہ منزل مقصود بھی نظر آتی تھی۔ انہوں نے صاف گوئی سے اعتراف کیا کہ ہمیں جو کچھ کرنا ہے اس کے مقابلے میں ہم بہت کم کر سکتے ہیں۔ اور منزل تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ مادی اور انسانی وسائل اور بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے تاکہ ہم ممکن اور مطلوب کے بیچ میں ایک پل بنا سکیں۔ یہی ان کی وصیت ہے اور یہی ان کی یاد کا چیلنج۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا نے جس خوبصورتی کے ساتھ اپنی فکر کا نقش تعلیم و تربیت کے ہر پہلو پر ثبت کیا۔ اس کا اندازہ محض تعلیمی رپورٹوں اور اعداد و شمار کو دیکھ کر نہیں ہوتا بلکہ یہ سوچ کر ہوتا ہے کہ اس نازک دور میں وقت کے اس سخت موڑ پر ان کی رہنمائی کی دولت نہ نصیب ہوئی ہوتی تو ہماری تعلیم اور کلچر کا تصوّر کس قدر مسخ اور مختلف ہوتا۔ چند چیزوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے۔

انہوں نے بالغوں کی تعلیم کے تصور میں وسعت پیدا کی اور اس میں رنگ بھرا، مشرقی علوم اور ادب میں ریسرچ کو فروغ دیا، فنون لطیفہ کی ترقی اور ترویج کے لیے اکادمیاں قائم کیں۔ ہندی میں سائنس کی اصطلاحیں بنانے کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا ذریعۂ تعلیم کے نازک مسئلے اور ہندی اور غیر ہندی زبانوں کے جھگڑے کو جس میں عقل کی جگہ جذبات نے لے لی ہے بڑی دانش مندی سے سنبھالا اور لوگوں کو افراط و تفریط کے خطروں سے آگاہ کیا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم کر کے نہ صرف اعلیٰ تعلیم کو زیادہ وسائل بخشے بلکہ یونیورسٹیوں کی آزادی کا تحفظ کیا۔ عورتوں کی تعلیم کو مردوں کی تعلیم سے زیادہ اہم ٹھہرایا کیونکہ اس کے ذریعہ قوم میں نئی زندگی اور نیا شعور پیدا ہو سکتا ہے علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ کو جو ایک افسردگی اور پریشانی کے دور سے گزر رہے تھے۔ ہمت، خودداری، خدمت اور امید کا پیغام دیا اور بتایا کہ ایک غیر مذہبی جمہوری ریاست میں ہر شہری کے لیے سارے راستے کھلے ہیں، کوئی دروازہ بند نہیں بشرطیکہ دیکھنے کے لیے آنکھیں، سُننے کے لیے کان اور انصاف کرنے کے لیے دل ہو، آزادی سب کے لیے کھلتے دروازوں کا پیغام لے کر آئی ہے، بشرطیکہ ہم اسے سمجھیں اور اس کے پیغام کو پہچانیں۔ ؎

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

مذہبی تعلیم کا مسئلہ برسوں سے بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ مولانا کے دل اور دماغ کے ہر گوشے میں اس کی اہمیت کا احساس پیوست تھا لیکن ملک کے حالات اور مصلحتوں کو دیکھ کر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سرکاری طور پر درس گاہوں میں مذہبی تعلیم کو رائج کرنا مناسب نہ ہوگا۔ مگر ان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا کہ مذہب کی سچی روح کو نہ صرف تعلیم بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں رائج ہونا چاہیے اور اس کے ذریعے لوگوں میں رواداری، وسیع مشربی اور گہری انسانی ہمدردی پیدا کرنی چاہیے۔ جب وشوا بھارتی یونیورسٹی کا ایکٹ تیار ہو رہا تھا تو قانونی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رائے کے مطابق اس میں خدا کا نام شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ خواہ قانون کی موشگافیوں کی وجہ سے ایکٹ میں خدا کا نام نہ ہو لیکن علیگڑھ کی اس یونیورسٹی میں خدا کا تصور اور مذہب کی روح ہر جگہ جاری وساری رہے گی اور "شانتم، شوم ادویتم،، کے لفظوں میں ذات الٰہی کا جو تصور ہے، وہ نسل، رنگ، مذہب اور فرقے کی حد بندیوں سے بلند اور آزاد ہے۔ انسان کی عظمت اور سب مذہبوں کی عزت کا یہ عقیدہ گاندھی جی کی تعلیم میں بھی پایا جاتا ہے، اور چونکہ ان کی بنیادی قدروں میں بہت بڑا حصہ مشترک ہے۔ اس وجہ سے ان دو مردانِ خدا میں جن میں ایک ہندو مذہب کا اور دوسرا مذہب اسلام کا مثالی نمونہ تھا۔ اس قدر یک جہتی اور مفاہمت پائی جاتی ہے۔

تعلیم کے اس بلند اور ہمہ گیر تصور کو عمل میں لانے کے لیے سب سے زیادہ روشن دماغ اور بلند سیرت استادوں کی ضرورت ہے۔ مولانا کے دل میں استادوں کے لیے بڑی عزت اور ان کے ساتھ بہت ہمدردی تھی۔ اور انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ سماج نے انہیں وہ مرتبہ نہیں دیا جس کے وہ مستحق ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ ان کے بنیادی عقیدے کا اظہار تھا۔ کہ انہوں نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ۱۹۴۷ء میں جو پہلی تقریر کی تھی اور ۱۹۵۸ء میں اپنے انتقال سے چند روز پیشتر جو آخری تقریر کی دونوں میں اس بنیادی مسئلے کا ذکر ہے۔ اس میں انہوں نے بہت وضاحت اور زور کے ساتھ کہا تھا کہ جب تک ہم استادوں کے معیار کو بلند نہ کریں ہم تعلیم کے نظام کو بہتر نہیں بنا سکتے۔ ہم نے ان کی مالی اور سماجی حالت کو سدھارنے اور عام ذہنی اور اخلاقی معیار کو بلند کرنے کے لیے کچھ ذرائع اختیار کیے ہیں لیکن وہ ہرگز کافی نہیں۔ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ انھوں نے ساتھ ہی اس چیز کی مذمت کی کہ لوگ بے سوچے سمجھے مسلسل استادوں کے خلاف تلخ اور بے فیض نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں جس سے انکی ہمت شکنی ہوتی ہے۔ مانا کہ ان میں سے بعض کی تعلیم ناقص ہے اور بہت سے اس پیشے میں مجبوری سے آئے ہیں۔ لیکن ان میں بہت سے ایسے بھی تو ہیں جنھوں نے احساس فرض اور قومی خدمت کا قابل تعریف جذبہ دکھایا ہے۔ ان کی مناسب قدر کرنا قوم کا فرض ہے۔ مولانا کے یہ الفاظ اپنی قوم کے لیے ایک تلقین اور ملک کے استادوں کے لیے تحسین کا الوداعی پیغام ہیں۔

ہندوستان کے عصر نو کا یہ معمار اپنا کام ختم کر کے جوارِ رحمت الٰہی میں جا پہنچا۔ خیر کام تو کبھی پورا نہیں ہوتا اور ہر موت ناتمامی اور خلاء کا ایک احساس چھوڑ جاتی ہے۔ لیکن شاید

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے ایک زندگی کے ساغر میں ایسی اور اتنی شراب بھری جس کا حیات بخش خمار مدتوں تک قائم رہے گا۔ قدرت نے انہیں ایک ایسے زمانے میں پیدا کیا جو کش مکش اور جد و جہد اور دار و گیر کا زمانہ تھا۔ آزمایش اور امتحان کا زمانہ تھا، سیرت کے سونے کو ایثار کی بھٹی میں تپانے کا زمانہ تھا۔ لیکن مولانا اس زمانے کی آگ میں سے اس براہیمی شان کے ساتھ گزرے کہ محفل سوز و گداز سے گرمی رزم اور رزمی بزم سے، باطل سوز جلال اور حق کوش جمال سے جگمگا اٹھی۔ ان کی زندگی کے دور اوّل کا خیال کرتا ہوں جو آزادی کی منزل پہ پہنچ کر تمام ہوا تو یہ شعر ذہن میں ابھرتا ہے:

آوازۂ خلیل نہ بنیاد کعبہ نیست
مشہور گشت زاں کہ بہ آتش نکو نشست

اور دور آخر کا خیال کرتا ہوں جب وہ نئے ہندوستان کی تعلیم اور تہذیب کو سنوار رہے تھے۔ جب وہ محبت اور انصاف کے راستے سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو محبت اور انصاف کے راستے کی طرف بلا رہے تھے۔ جب وہ طوفان میں دیا جلا رہے تھے اور حق کی خدمت میں تحسین اور ملامت دونوں سے بے نیاز ہو چکے تھے تو ظہوری کا ایک شعر یاد آتا ہے۔ جو خود انہوں نے ایک مقام پر نقل کیا ہے

شد است سینہ ظہوری پُر از محبت یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا آزاد کے تعلیمی نظریے

عبداللہ ولی بخش قادری

مولانا ابو الکلام آزاد جنوری ۱۹۴۷ء میں حکومتِ ہند کے وزیرِ تعلیم مقرر ہوئے اور پھر تا دمِ حیات اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ مولانا کی وفات فروری ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔ اس طرح انھوں نے اپنی زندگی کے آخری گیارہ سال وطنِ عزیز کے تعلیمی نظام کی تشکیل و تنظیم کے مسائل کو حل کرنے میں صرف کیے ان کی قیادت میں ہماری تعلیم پر سچا قومی رنگ چڑھنا شروع ہوا اور ایک آزاد ملک کے تقاضوں کے مطابق ذہنی و تہذیبی ترقی کی راہیں کھلیں۔ اس زمانے میں مولانا نے اپنے فرائض منصبی کے تحت تعلیمی مسائل پر سرکاری اور نیم سرکاری مجالس مباحثہ میں بارہا اظہارِ خیال فرمایا۔ ان کے یہ تعلیمی خطبات نہ صرف اپنے زمانے کی حکومتِ ہند کی تعلیمی پالیسی کے آئینہ دار ہیں بلکہ مولانا کے ذاتی تاثرات و نظریات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ ان میں مولانا کے تبحرِ علمی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے اور لہجے کی بلند آہنگی میں مولانا کی عظیم شخصیت کی عکاسی نظر آتی ہے۔ بسا اوقات مولانا نے ایک ہی خطبے کے دوران میں اپنے ذاتی تاثرات بھی بیان فرمائے ہیں اور حکومت کی نمائندگی بھی کردی ہے مگر یہاں چشمِ بینا مولانا کی ذات اور وزیرِ تعلیم کی حیثیت کا فرق دیکھ سکتی ہے۔ یوں تو عموماً ذاتی اور منصبی حیثیت میں اتحادِ فکر کا ثبوت ملتا ہے لیکن کہیں کہیں دیانت دارانہ اختلافِ رائے کا اظہار بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ گمان کہ مولانا حکومتِ ہند کی تعلیمی پالیسی کے محض ایک نقیب کی حیثیت رکھتے تھے، نہ صرف مولانا کی سیاسی حیثیت اور علمی وقار کے منافی ہے بلکہ ان کے تعلیمی خطبات سے ناواقفیت بھی ظاہر کرتا ہے۔ ہماری آزادی[1] میں انھوں نے خود یہ بہ فرمایا ہے کہ "میں نے تعلیم کے میدان میں جس پالیسی اور پروگرام پر عمل کیا وہ ایک الگ کتاب کا موضوع ہوگا۔ ان مسائل پر میرے خیالات یکجا کر کے

---

[1] ہماری آزادی صفحہ ۲۵۲ مترجمہ پروفیسر محمد مجیب۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتابی شکل میں شائع کیے جا چکے ہیں"۔ مولانا کا یہ اشارہ اپنی تقاریر کے اُس مجموعے کی طرف ہے جسے حکومت کے شعبۂ اشاعت نے جنوری ۱۹۵۶ء میں شائع کیا اور جس میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۵ء تک کی منتخب تقاریر شامل ہیں۔ مولانا کے اس بیان کے بعد ان کی تعلیمی تقاریر کے محض "فرمودات منصبی" ہونے کا شبہ کسی طور باقی نہیں رہتا۔ دراصل تعلیمی معاملات میں مولانا کی بصیرت سے متعلق غلط فہمی ان لوگوں کو ہوا کرتی ہے جنھوں نے مولانا کو نہایت ہی محدود معنی میں ایک عالم دین یا سیاسی لیڈر تصور کر رکھا ہے اور جو سمجھتے ہیں کہ مولانا انگریزی زبان و ادب بلکہ پوری مغربی تہذیب سے یکسر نا آشنا تھے۔ اگرچہ مولانا حقیقی معنی میں ایک مفکر اور عالم تھے۔ ان کا دائرہ عمل نہایت وسیع تھا۔ خدا نے انھیں غیر معمولی طور پر ذہین اور بیش رس پیدا کیا تھا۔ وہ طبّاع بھی تھے اور علم کے شیدائی بھی۔ انھوں نے صرف عربی ادب ہی میں کامل دست گاہ حاصل نہیں کی تھی بلکہ جملہ علوم مشرقی سے شغف رکھتے تھے۔ انھیں انگریزی زبان و ادب سے بھی واقفیت تھی اور وہ مغربی تہذیب و فلسفے میں گہری نظر رکھتے تھے۔ مولانا نے بحر معنی کی شناوری کے ساتھ ساتھ بساطِ سیاست پر اوائل عمری ہی میں قدم رکھا اور وہ بھی ایک صحافی کی حیثیت سے۔ اور پھر ساری عمر کاروبار سیاست کے مرد میدان بنے رہے۔ اس لیے ان کی نظریں زمانے کے پیچ و خم سے خوب آگاہ تھیں۔ وہ مصالح ملکی بھی سمجھتے تھے اور تعلیم کا منصب بھی غالباً یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی کی نگاہِ جوہر شناس نے انھیں آزاد ہندوستان کی تعلیمی کشتی کی ناخدائی کے لیے سب سے زیادہ موزوں ٹھہرایا۔

مولانا نے مسندِ وزارت پر جلوہ افروز ہونے سے قبل بھی جا بجا اپنی نگارشات میں اپنے تعلیمی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے موقع پرستی کے تحت قلم دانِ وزارت نہیں سنبھالا تھا بلکہ اپنے مزاج کی مناسبت و مطابقت کے لحاظ سے قومی خدمت کی یہ راہ اختیار کی تھی۔ انھیں آغاز کے وقت خالی الذہن نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ ذہن پختہ کار، دلِ حق نگر اور چشم بصیرت سب ہی کچھ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کو عقائد کا استحکام بھی حاصل تھا اور بالغ نظری کی کشادگی بھی۔ وہ ایک راسخ العقیدہ انسان تھے اور ان کی زندگی میں حیرت انگیز طور پر اتحادِ فکر کی جلوہ نمائی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۱۹ء میں تذکرہ[1] کے اندر

---

[1] تذکرہ، ص ۲۰۵ شائع کردہ انارکلی کتاب گھر، لاہور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انھوں نے لکھا تھا کہ " انسان کے لیے معیارِ شرف جوہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایاتِ پارینہ اور نسب فروشی کا غرورِ باطل ہم کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں، نہ یہ کہ اپنی عزت کے لیے خاندان کے شرفِ رفتہ کے محتاج ہوں۔" ان کا یہ عقیدہ تمام زندگی ان کے ساتھ رہا۔ غبارِ خاطر، میں کئی خطوط کے اندر اُن کے اِن احساسات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مثلاً ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ " انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اس کے تقلیدی عقائد ہیں ...... بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گرد و پیش کا اثر بھی اُسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔ تعلیم، دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اترے گی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہے گا"...... تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چبھا وہ اسی تقلید کے خلاف تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کیوں۔ مگر بار بار یہی سوال سامنے اُبھرنے لگا تھا کہ عقائد کی بنیاد علم و نظر پر ہونی چاہیے، تقلید اور توارث پر کیوں ہو" ایسے بیانات میں نہ صرف نسل و ماحول کی حیثیت کا واضح تعین موجود ہے بلکہ اُن سے مولانا کے ترقی پسندانہ رجحانات کا بھی پتا چلتا ہے۔ ان کی اس اجتہادِ فکر، اصابت رائے اور مستقل مزاجی پر اس لیے اور حیرت ہوتی ہے کہ مولانا خود ایک نہایت ہی مذہبی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ان کا سارا بچپن خاندانی افتخار و امتیاز کے گہوارے میں گزرا تھا۔

مولانا نے اپنے زمانے کے عام دینی رہنماؤں کی طرف مذہب کو ایک جامد اور مافوق البشر تصوّر تک ہی محدود و پابند نہیں کر رکھا تھا اور نہ وہ دورِ حاضر کی مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر سطحی عقلیت کے سیلاب میں بہہ نکلے تھے۔ وہ دین، فلسفے اور سائنس کے مقام کا بیک وقت درک رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے خط مورخہ ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء میں فلسفے، سائنس، اور مذہب کے بارے میں بڑی صفائی سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ "یہ فلسفہ، بلاشبہ طبیعت میں ایک طرح کی رواقی بے پروائی پیدا کر دیتا ہے اور ہم زندگی کے حوادث و آلام کو عام سطح سے بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں لیکن اس سے زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں۔ یہ ہمیں ایک طرح کی تسکین ضرور دے دیتا ہے لیکن اس کی تسکین سر تا سر سلبی تسکین ہوتی ہے، ایجابی تسکین سے اس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ فقدان کا افسوس کم کردے گا لیکن حاصل کی کوئی امید نہیں دلائے گا" لیکن سائنس بھی ان کے نزدیک کچھ زیادہ وقیع نظر نہیں آتی۔ اس خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "سائنس عالم محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے اور مادی زندگی کی بے رحم جبریت کی خبر دیتا ہے۔ اس لیے عقیدے کی تسکین اس کے بازار میں بھی نہیں مل سکتی وہ یقین اور امید کے سارے پچھلے چراغ گل کر دے گا مگر کوئی نیا چراغ روشن نہیں کرے گا" اس کے بعد خود ہی سوال کرتے ہیں کہ "پھر اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لیے نظر اٹھائیں تو کس طرف اٹھائیں؟" اور اپنے سوال کا خود ہی یوں جواب دیتے ہیں کہ "ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے ایک دکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے" اس کے بعد وہ مذہب کے منصب کی یوں وضاحت کرتے ہیں کہ "فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دے گا مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے اگرچہ ثبوت نہیں دیتا اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدے کی بھی ضرورت ہے"

غرض، مولانا مذہب کا ایک صحت مند تصور رکھتے تھے۔ انھوں نے اس مذکورہ بالا خط میں صاف صاف کہا ہے کہ "بلاشبہ مذہب کی وہ پرانی دنیا جس کی مافوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، اب ہمارے لیے باقی نہیں رہی" وہ مذہب کی رواجی حیثیت کے قائل نہ تھے۔ اسی جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ "عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثے کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا" انھوں نے ایسے مذہب کو "تقلیدی ایمان" کہا ہے جسے وہ سراسر جمود اور گمراہی کا سبب گردانتے تھے۔ وہ "حقیقی مذہب" کے قائل تھے جو "تحقیقی" ہوتا ہے "تقلیدی" نہیں ایسا مذہب ان کے نزدیک علم کے منافی نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کی مطابقت کرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "علم اور مذہب[1] کی جتنی نزاع ہے فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں ہے۔ یہ مدعیان علم کی خامکاریوں اور مدعیان مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ چلتے ہیں الگ الگ راستوں سے مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں

---

[1] غبار خاطر، مکتبہ جدید لاہور۔ میری لائبریری ایڈیشن۔ صفحہ ۲۵۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک ہی منزل پہ؛ مولانا، انسانی زندگی میں مذہب کو بہت بڑا منصب دیتے ہیں اور اس کی مثبت حیثیت کے قائل ہیں۔ ان کا فیصلہ ہے کہ "بہر حال[1] زندگی کی ناگواریوں میں مذہب کی تسکین صرف ایک سلبی تسکین ہی نہیں ہوتی بلکہ ایجابی تسکین ہوتی ہے کیونکہ وہ ہمیں اعمال کے اخلاقی اقدار کا یقین دلاتا ہے اور یہی یقین ہے جس کی روشنی کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ ہے جسے انجام دینا چاہیئے، ایک بوجھ ہے جسے اٹھانا چاہیئے۔" انھوں نے ۱۹۴۷ء میں اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد ۱۸ر فروری کی پریس کانفرنس میں تعلیم اور قومی تشکیل کے سلسلے میں جن چند اہم اور بنیادی امور کی طرف توجہ دلائی تھی ان میں سے ایک مذہبی تعلیم کا مسئلہ بھی تھا۔ اس موقع پر بھی انھوں نے اسی بات پر زور دیا کہ مذہبی تعلیم کا مقصد وسیع النظری، روا داری اور انسان دوستی ہونا چاہیئے۔ تقریباً ایک سال بعد ۱۳ر جنوری ۱۹۴۸ء کو سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے حصول آزادی کے بعد منعقد ہونے والے پہلے اجلاس میں بھی انھوں نے اپنی صدارتی تقریر طلبہ کی مذہبی تعلیم سے متعلق کی اور ملک کے سامنے مذہب اور مذہبی تعلیم کے اسی ارفع و صالح تصور کو رکھا جو اب سے بہت پہلے ان کا مسلک قرار پا چکا تھا۔

مولانا کا یہی دینی احساس تھا جس نے انھیں ایک مذہبی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ سچا محب وطن اور جاں نثار قوم بنایا اور ہمیشہ اُن کے ذہن کو ہر قسم کی تنگ نظری اور تعصب سے پاک رکھا۔ انھوں نے مذہب کی حقیقی روح کو پہچان لیا تھا اور چاہتے تھے کہ جملہ عزیزان وطن بالخصوص نونہالانِ وطن کے دلوں کو بھی اس حقیقت سے آشنا کرائیں تاکہ ان کی ذہنی فضا کسی طور مسموم نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ تھی کہ سچے دین کی پیروی میں پیدا ہونے والے یقین و اعتقاد کو وہ تعلیم کا ایک اساسی عُنصر سمجھتے تھے۔ اور اسی بنا پر وہ تاریخی غیر جانبداری کے بھی پرجوش حامی تھے۔ انھوں نے ۲۸ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کے جلسہ میں تاریخ کا مقصد ماضی کے حقائق کا انکشاف ہی بتایا تھا۔ اور تین سال بعد اسی کمیشن کی نشست کے موقع پر پھر اپنے نظریے کی وضاحت میں کہا تھا۔ کہ "انگریزوں کے عہد میں لکھی ہوئی تاریخ قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جاسکتی کیونکہ

---

[1] غبار خاطر، مکتبہ جدید لاہور رہبری لائبریری ایڈیشن۔ صفحہ ۶۵۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخ داں خواہ غیر ملکی حکمران طبقے کے حامی ہوں یا محبانِ وطن، دونوں جانبدار رہے ہیں۔ لہٰذا آزاد ہندوستان کے مورخ کا فرض ہے کہ اپنے فرائض سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونے کی سعی کرے۔" (ترجمہ) ان کی بے لوث دینداری نے انھیں اس حد تک زیورِ انسانیت سے آراستہ کر دیا تھا کہ انھوں نے وطنیت کے محدود تصور کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ مولانا وطن پرستی کو نہ مذہب کا حریف مانتے تھے اور نہ انسان دوستی کا رقیب۔ انڈین ایجوکیشنل کانفرنس کے سامنے ۱۶ر جنوری ۱۹۴۸ء کو قومی تعلیم کا منصوبہ پیش کرتے ہوئے بھی انھوں نے یہ بات کہی تھی کہ علم کی دنیا میں تنگ و محدود حب الوطنی کا سوال نہیں اُٹھتا اور نہ یہ بات کسی طور واجب ہے کہ دشمن کی تاریخ و تہذیب کو ترچھی نگاہ سے دیکھا جاتے اور قومی روایات و اقدار کا جائز احترام نہ پیدا کرایا جائے۔

مولانا کی اس کشادگی قلب و نظر کی بدولت ان کا تعلیمی تصور بھی عالم گیر انسانیت کا احاطہ کیے ہوتے ہے۔ وہ ایک ہم آہنگ سماج میں معقول و معتدل شخصیت کی تشکیل کو تعلیم کا منصب قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کرۂ ارض کے بسنے والوں کے جذبات بڑی حد تک یکسانیت رکھتے ہیں اور فکر انسانی فی الحقیقت ایک ہی ہے۔ لہٰذا مقامی رنگ کی آمیزش اور ماحول کے امتیازات قبول کرنے کے باوجود فرزندِ آدم کی خلقت میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ انسان انسان ہی رہتا ہے۔ انھوں نے اپنے ان تاثرات کو مشرق و مغرب میں انسان کا تصور اور فلسفۂ تعلیم کے عنوان کے تحت یونسکو کی طرف سے ۱۳ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو منعقد ہونے والے سیمینار میں افتتاحی تقریر کے دوران میں صراحت سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے مضامین البلاغ میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ "اخلاق بھی ایک قوت ہے جو انسان کے بطون و ارواح میں چھپی ہوئی ہے۔" یہاں پر وہ کسی خاص خطۂ زمین یا رنگ و نسل کے انسان کی تخصیص نہیں کرتے، انھیں انسانی فطرت کی بوقلمونی میں اس کے خمیر کی یک رنگی کا یقین کامل ہے اور وہ انسانوں میں کوئی تفریق نہیں کرنا چاہتے۔ مولانا اپنے اس فلسفۂ حیات کے پیشِ نظر بین الاقوامی، مفاہمت کے لازمی طور پر علمبردار ہیں۔ وہ فنونِ لطیفہ کی تعلیمی اہمیت کے اس لیے اور زیادہ معترف تھے کہ ان کے نزدیک وہ مختلف ممالک کے مابین امن و آشتی کے پیغام بر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ۵ر مارچ ۱۹۵۲ء کو فنونِ لطیفہ کی ایک نمائش

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ فن برائے فن اور فن برائے زندگی کی بحث قطعی فضول ہے۔ دراصل دونوں مقولوں کے بطن میں ایک ہی حقیقت مخفی ہے۔ حقیقی فن افراد کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا محتاج نہیں ہوا کرتا لیکن ایسی صورت میں وہ سب کے جذبات کی نمایندگی بھی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ معیاری فن ہمیشہ حقیقی تعلیم کا موثر ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ جذبات کو سنوارتا ہے اور ادراک وتخیل کی تربیت کرتا ہے۔ سیاسی طور پر دنیا علیحدہ علیحدہ جماعتوں میں تقسیم ہوسکتی ہے لیکن فلسفہ، ادب اور فن کے معاملے میں انسانی برادری کی سالمیت برقرار ہی رہتی ہے اس میدان میں ایک ذہن کی تخلیق ساری نوعِ انسانی کا سرمایہ بن جاتی ہے فنونِ لطیفہ کی ان ہی صفات کی بنا پر مولانا کے نزدیک ایک سچے قومی نظامِ تعلیم میں فنون لطیفہ کا ایک خاص مقام ہے۔ انھوں نے متعدد مواقع پر اپنے تعلیمی خطبات میں یہ بات دُہرائی ہے، وہ کسی بھی ملک کی قومی تعلیم کو فنون لطیفہ کے بغیر مکمل ماننے کو تیار نہیں تھے۔ ۱۹راگست ۱۹۴۹ء کو فنونِ لطیفہ کی کل ہند کانفرنس میں خطبۂ افتتاحیہ پڑھتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا کہ ایک سماج کی صحت مندی اور اعتدال پسندی کا اظہار اس کے افراد میں ذوقِ لطیف کی ترویج سے ہوا کرتا ہے شخصیت کی تعمیر میں مولانا مصوری، موسیقی، رقاصی، سنگ تراشی، ڈراما سب ہی فنون کو اہم خیال کرتے تھے۔ انھوں نے تعلیم کے منصب کی وضاحت کرتے ہوتے اکثر فرمایا ہے کہ شخصیت کے سب ہی پہلوؤں کی تربیت ضروری ہے۔ تعلیم محض ذہنی قوا کی بیداری کا نام نہیں ہے بلکہ جذباتی آسودگی، جسمانی ترقی، تہذیب وشائستگی کا حصول، غرض، انسانی زندگی کے سب ہی رُخ اس میں شامل ہیں۔ مولانا کی اپنی زندگی میں فنونِ لطیفہ محض نظری حیثیت نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ ان کے شیدائی بھی تھے۔ انھوں نے اپنی نوجوانی میں دو تین سال متواتر علمِ موسیقی کا مطالعہ کیا تھا اور باقاعدہ ریاض بھی کرتے رہے تھے۔ اگرچہ آئندہ زندگی کی ہنگامہ آرائیوں نے انھیں اس ذوق کو جاری رکھنے کی مہلت نہ دی لیکن موسیقی سے انھیں دلچسپی ہمیشہ رہی۔ ان کی طبیعت کا یہ رجحان اُن کی نفاست پسندی، شاعرانہ فکر، اور صاف ستھرے مذاق سے بھی بہر طور ظاہر ہوتا ہے اس لیے یہ امر قطعی باعث تعجب نہیں ہے کہ مولانا نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے سب سے پہلے جو چند آئین بنوانے میں پیش قدمی کی، اُن میں سے ایک بیرونی ممالک میں نوادرات کی بے دریغ برآمد پر قیود عائد کرنے سے متعلق بھی تھا۔ ان کے اس احترامِ فن وادب کی ایک اور شہادت ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی اور سنگیت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ناٹک اکادمی کی صورت میں آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ ادارے دراصل مولانا کی فکر رسا کے برگ وبار کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہماری قومی تعلیم میں مولانا کی بالغ نظری کے علامتی مینار کہے جاسکتے ہیں۔ مولانا نے ان اداروں کے قیام میں گہری دلچسپی ظاہر کی تھی اور انھوں نے بجا طور پر ان اداروں کے مقاصد میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی تھی کہ وہ عوام کے مذاق کو سنوارنے اور فنون وادب کی توسیع واشاعت کا ذریعہ بنیں۔

مولانا، تعلیم کو زندگی کی تیاری سے تعبیر کرتے تھے۔ انھوں نے ۳۰ نومبر ۱۹۵۱ء کو ایک تقریر کے دوران میں زراعت کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے تعلیم کا منصب سماجی ضرورتوں کے پیش نظر افراد کی صلاحیتوں کو ابھارنا ہی ٹھہرایا تھا۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ طلبہ کی قابلیت کی سطح کو بلند کیا جائے۔ مولانا نے تعلیم میں آزادی کے تصور کو سراہا۔ وہ ثانوی تعلیم میں کچھ اس طور پر تبدیلی چاہتے تھے کہ وہ خود تکمیلِ علم کی ایک منزل قرار پا جائے تاکہ بیشتر طلبہ اس منزل کو طے کرنے کے بعد زندگی میں داخل ہوسکیں۔ اسی غرض سے کثیر المقاصد ثانوی مدارس کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ آج ان کی یہ بات بڑے پُرزور طریقے سے دہرائی جارہی ہے اور حکومت کی کوشش ہے کہ کسی طور اعلیٰ تعلیم کے میدان میں نااہلوں کے داخلے کی روک تھام کی جائے۔ مولانا کے نزدیک ہر فرد کو ایسی تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے جو اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہوسکے اور مکمل زندگی گزارنے کا اہل بنائے۔ ایسی تعلیم کو انھوں نے ہر شہری کا پیدائشی حق بتایا ہے۔

مولانا کے نظریۂ حیات اور فلسفۂ تعلیم سے آزاد ہندوستان کا تعلیمی نظام پوری طرح متاثر ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے تدبر سے اسے ایک ایسا پس منظر عطا کردیا جس میں سچی دین داری، عقائد کی پختگی، انسان دوستی، عدل وضبط جیسی اقدارِ عالیہ کی پاسداری موجود ہے اور جو تعلیم کا صحت مندانہ نظریہ برتنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ ان کے ذہن رسا کا یہ بھی کمال ہے کہ اس کی بدولت ہندوستان کی تہذیبی روایات کو دوبارہ زندگی حاصل ہوئی۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا کہ روایات کا استحکام ان کو حیات نو بخشنے ہی سے ممکن ہے۔ ان کے اپنے قول کی تائید خود ان کے عمل میں نظر آتی ہے۔ اس وقت تعلیمی ترقی کی جو راہیں نکل رہی ہیں ان میں سے تقریباً سب ہی کی داغ بیل مولانا کے عہد میں پڑ چکی تھی۔ وہ جنگ آزادی کے مردِ مجاہد تو تھے ہی لیکن انھوں نے آزاد وطن کے تعلیمی نظام کی تشکیل کے معمارِ اوّل کہلانے کا حق بھی ادا کردیا۔

۱، ۲ نشری تقریر، ۳۰ ستمبر ۱۹۵۳ء ۳ تقریر ۲۸ جنوری ۱۹۵۳ء

13844

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ